

حُسنِ بیان اور اعجازِ نطق کا ایک انمول شاہکار

مقرر بنئے

رائے محمد کمال

حسنِ بیان اور اعجازِ نطق کا ایک انمول شاہکار

مقرر بنیے

رائے محمد کمال

جہانگیر بکس

لاہور ۔ راولپنڈی ۔ ملتان ۔ فیصل آباد ۔ حیدرآباد ۔ کراچی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

ناشر : نبیل نیاز

قیمت : 165 روپے

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319

تقسیم کنندہ : سیلز ڈپو لاہور: اردو بازار، فون: 042-7220879

سیلز ڈپو کراچی: اردو بازار۔ فون: 021-2765086

سیلز ڈپو راولپنڈی: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک ۔ فون: 051-5539609

سیلز ڈپو ملتان: اندرون بوہڑ گیٹ۔ فون: 061-4781781

سیلز ڈپو فیصل آباد: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار ۔ فون: 041-2627568

سیلز ڈپو حیدر آباد: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ ۔ فون: 0300-3012131



جہانگیر بکس

Web Site:http://www.jbdpress.com E-mail:info@jbdpress.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسۡنًا ۝٨٣

(البقرہ)

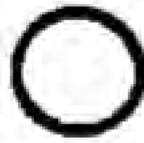
جنسِ تبسّم اور گوہرِ اشک

وُہ جنسِ تبسّم ———————————

جو میری معصومانہ پرواز کے بہلانے والد معظم کے ہونٹوں پر
استیلا پائے بیٹھی ہے۔

اور وُہ گوہرِ اشک ———————————

جو والدہ معظمہ بارگاہِ رب العزت میں پیش کرتی ہیں۔



روحِ بیان

(رفیق احمد باجواہ ایڈووکیٹ)

"خیال سے گفتار تک کی منزل کو بغیر کسی مزاحمت کے حاصل کر لینا ہی فن تقریر کی بنیاد ہے۔ وسوسوں میں الجھا ہوا انسان کبھی اچھا مقرر نہیں بن سکتا۔ جو آخری سچائی سے آگاہ نہیں' گونگے رہنا اس کے الفاظ کا مقدر ہے بولنا اور الفاظ کا بولنا مختلف عمل ہیں جو متضاد نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ خود غرض کے الفاظ کبھی نہیں بولتے اور بے ضرورت کے کبھی رقص نہیں کرتے۔ جسے اپنے آپ پر اعتقاد کی حد تک اعتماد نہیں ہوتا' اس کے الفاظ کبھی مترنم نہیں ہوتے۔ ترنم' مظاہرہ خود اعتمادی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اعتماد ٹوٹ جائے تو فقرے گریاں ہو جاتے ہیں' تقریر رونا شروع کر دیتی ہے۔ جب تک کسی مضمون کی قطعی سچائی دسترس میں نہ ہو اسے موضوع تقریر کے لئے اختیار نہ کرو۔ جھوٹ بولنے کے لئے تقریر نہیں کھسر پھسر موثر ہوتی ہے۔ مائیں جب بچے کو سچ بولنا سکھا رہی ہوتی ہیں تو فن تقریر سے آگاہ کر رہی ہوتی ہیں۔ بے باک ہونا جھوٹ کا مقدر نہیں اور جو بے باک نہیں وہ مقرر نہیں۔ لوگ وضاحت کے لئے تقریر سنتے ہیں' الجھاؤ کے لئے نہیں۔ دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے اور میت کے چہرے سے کفن سرکانے کا عمل ایک سا نہیں۔ ہر تقریر خیالات کے تسلسل کی مرہون احسان ہوتی ہے۔ خیالات کی اکائی میں اگر انتشار پیدا ہو جائے تو خیالات کا تسلسل کبھی قائم نہیں رہتا اور مقرر سوائے الفاظ کے تلاطم کے اور کچھ مہیا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ معاوضہ لے کر تقریر کرنا بدترین انسانی اعمال میں سے ایک ہے۔ تنخواہ دار مقرروں کی حیثیت ہوشیار دوکان داروں کے انسانی بولی بولنے والے طوطوں سے بہتر نہیں ہوتی۔ پیشہ ور مقرر اور طوائفوں کے ذہنی وزن یکساں ہوتے ہیں۔ اچھا مقرر جذبات کو کبھی پراگندہ نہیں ہونے دیتا' صرف فکر کو روشنی عطا کرتا اور جلا مہیا کرتا ہے۔ جھوٹی عورت دوران گفتگو ران [illegible] کا [illegible] کی عادی ہوتی ہے مقرروں کی ان

واسطوں سے یہی پہچان ہے۔ مصنوعی جوش میں آنے والے مقرر سراپا مصنوعی ہوتے ہیں۔ کم تر بھی ہوتے ہیں۔ جس شخص کو بیک وقت مختلف ذہنی و علمی معیار رکھنے والے افراد کو خطاب کرنے کی صلاحیت نہیں اس کا تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پانی کو گرم کرنے کے لئے پانی آگ پر ڈال دے کہ سوائے گیلی راکھ اور لمبی شوں کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔ زبانی یاد کر کے کبھی تقریر نہ کرو۔ کرو گے تو تمہارا قلب و ضمیر خودکشی کر لے گا۔ اچھا مقرر خیالات کی اکائی میں ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے اور قسم دیگر منتشر وسوسوں کا سمندر وجود میں لاتی ہے۔ تقریر شروع کرتے وقت خیالات کی اکائی کے مہتمم واحد سے جس نے تمہیں گفتار عطا کی ہے' کہو' اس کے سامنے اقرار کرو کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ لوگ تمہاری تقریر سننے کے بعد کہیں گے' ہم وہ جان گئے جو ہم نہیں جانتے تھے۔ تمہارا اقرارِ اُمیّت ہی تمہارے عالم ہو جانے کی ضمانت ہے۔ جو مقرر نہیں ہوتے وہ الفاظ کے معانی کے محتاج ہوتے ہیں اور اچھا مقرر الفاظ کو اپنی مرضی کے معانی عطا کرتا ہے۔ برا مقرر ایک جواری کی طرح دانے پھینکتا اور اچھا مقرر تسبیح کے دانے پیش کرتا ہے۔ تسلیم کے لئے تحریر اور تربیت کے لئے تقریر بیک وقت کتاب الٰہی بھی ہے اور کلام الٰہی بھی۔ اچھے مقرر کی لوح کبھی غیر محفوظ نہیں ہوتی۔ سوچتے وقت جس کی بائیں کنپٹی کی نسیں پھول جائیں اور بات کرتے وقت بائیں آنکھ بند یا نیم بند کرنے کا عادی ہو' اس کی تقریر تو کیا بات بھی نہیں سننا چاہیے۔ جو کچھ کہنا ہے دوران تقریر بچوں کی سی معصومیت سے کہہ جاؤ' لوگ تمہیں پیار کرنے لگیں گے۔ شکایت کرنا ہے تو ماؤں کا انداز اپناؤ' بچے رو دیں گے۔ وعدہ یوں لو جیسے بہنیں بھائیوں سے لیتی ہیں۔ تم نہ بھی کہو گے تو لوگ جانیں قربان کر دیں گے۔ جس کی فکر و نگاہ بلند نہیں' جس کا قلب رقیق اور جاں پر سوز نہیں' وہ کبھی اچھا مقرر نہیں ہوتا۔ سخن کی دلنوازی کے لئے ان اجالوں کا مہیا کرنا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ لوگ اپنی راتیں لے کر آتے ہیں' چراغ جلاؤ' پھونکا نہ کریں۔ جس مقرر کی تقریر کے دوران لوگ یہ محسوس نہ کریں کہ سویرا طلوع ہو رہا ہے

وہ ہرگز اچھا مقرر نہیں۔ چوری' شراب' جوا' زنا' ارتداد اور تہمت سے پرہیز نہیں کرو گے تو اچھے مقرر کبھی نہیں بن پاؤ گے۔ لوگوں کو کیا معلوم کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے مرتبہ کا مبلغ وجود میں لانے کے لئے فطرت نے حضرت آمنہ کے لئے کیا کیا اہتمام کیے اور حضرت موسیٰ پر کچھ دنوں فرعون کے گھر میں کیا گزری کہ ہر ایرے غیرے کو تقریر کے لئے کھڑا کر دینا انسانی معاشرہ پر بہت بڑی زیادتی ہے۔ شرح صدر' عقدوں کے حل اور سرِ امر کے لئے اپنے رب کی عبدیت اختیار کرو۔ صبر و صلوٰۃ کے ساتھ اعانت چاہو۔ یہ سب کچھ نہ ہو تو تقریر سے پرہیز لازم ہے۔ دوران تقریر شکوے ہوتے ہیں۔ شکوہ کرو مگر اس طرح جیسی بیٹی باپ کے روبرو اپنی ماں کا شکوہ کرتی ہے۔ تقریر کا اس سے خوبصورت انداز ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ ایسا کرتے وقت ہر بیٹی ایک بہت بڑی مقررہ ہوتی ہے کہ ماں بھی نہیں روٹھتی اور باپ کو بھی غصہ نہیں آتا۔ دونوں کو پیار آ جاتا ہے۔ دونوں میں پیار ہو جاتا ہے۔ دوران تقریر کسی شخص کا نام لے کر اسے ہدف تنقید نہ بناؤ۔ تنقید کا یہ انداز بھونڈا ہے' سوقیانہ ہے۔ بیان تم کرو' نشاندہی لوگ کریں۔ کنایہ تمہارا ہو اور نام سامعین کے ذہن میں از خود آ جائے' یہی حسن تقریر ہے کہ سامع پکار اٹھے۔ ملتبا' ملتبا۔ وہ بات کہو جو تم سمجھتے ہو کہ لوگ نہیں کہہ سکتے مگر اس انداز سے کہو کو لوگ تسلیم کر جائیں کہ ہم بھی کہہ سکتے تھے مگر اسلوب سے عاری تھے۔ سامعین امثال نہیں' ضرب الامثال سنتے آئے ہیں۔ جس مقرر کی کہی ہوئی بات لوگوں نے مدتوں سرِ عام نہیں دہرائی وہ اچھا مقرر نہیں۔ فن تقریر گفتگو اور تکلم کی صلاحیتوں کا کمال ہے۔ ماؤں کی سنو' ماؤں کو دیکھو۔ خود معصوم رہو' مقرر بن جاؤ گے۔ جن افراد نے اپنی ماؤں کو بولتے نہیں سنا' نہیں دیکھا' ان کے لہجے کی کرختگی زندگی بھر سامعین پر گراں گزرتی رہتی ہے۔ دھواں دھار تقریر کے محاورہ کا یہ مطلب نہیں کہ تقریر کے بعد دھواں بھی اٹھے اور دھارے بھی بہیں۔ اچھا مقرر جہاد کے لئے بھی تقریر کر رہا ہو تو بھی اشتعال نہیں اشتعال دلاتا ہے۔ اور برا مقرر اخلاق عالم کے دوران بھی پھانسی لگانے اور درشتی

سے لٹکانے کی باتیں لوگوں کو سناتا ہے اور "خون کا حساب دو" کے نعرے لگوانا فکری رگوں کو متورم کر دیتا ہے۔

گالیاں الاپنا' غلیظ' رکیک یا دبیز ہو جانا فن تقریر کی نفی ہے۔ اگر یوں اچھے مقرر بنتے تو بھٹیارنوں کی فن تقریر کی درس گاہیں ہوتیں۔ تقریر کا اصل مقصد افکار و خیالات کی تحریک ہوتا ہے۔ اس تحریک سے وجد طاری کرنا ہوتا ہے۔ بھنگڑا ڈلوانا نہیں ہوتا۔ افکار اگر متحرک نہ ہوں تو وجد ہرگز طاری نہیں ہوتا۔ مغلوب اذہان اور مغلوب جذبات کے زیر اثر افراد کیفیات وجد سے نا آشنا ہی رہتے ہیں۔ جب تک انسان جذبات سے مغلوب نہ ہو جائے کبھی کرداروں کی تلاش نہیں کرتا۔ جلسہ گاہ اور تھیٹر ایک سے نہیں ہوتے نہ ان کی ضروریات ایک سی ہوتی ہیں نہ اثرات 'نہ نتائج' تقریر کے دوران قصے کہانیوں کا بلاواسطہ بیان مکروہ عمل ہے اور اس سے پرہیز لازم ہے۔

آئین خطابت

"صرف پیراکی کے اصول و ضوابط پر عبور حاصل کرنے سے انسان تیراک نہیں بن سکتا' اسی طرح فن تقریر کے اسرار و رموز پڑھ لینے سے مقرر نہیں ہو جاتے۔ تیرنے کے لئے عملی طور پر پانی میں چھلانگ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تقریر کا فن سیکھنے کے لئے تقریر کرنا ضروری ہے"

"اک بار سنی تھی جو مرے دل میں ہے موجود
اے جان تمنا" تیری تقریر ابھی تک"

درپن



سسکیوں سے پہلے

۱

حرفِ آغاز ایک بدعت ہے' جو براہ فارس ملک اردو میں داخل ہوئی۔ پہلے پہل اہل زبان نے اسے بدعت حسنہ کے طور پر قبول کیا۔ بعد ازاں فقہ ادب کی رو سے اس صنف کو فرض سمجھا جانے لگا۔ کہتے ہیں کہ تقدیم کو پیکر الفاظ میں دل کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا حرف حرف دھڑکنوں سے موسوم ہے۔ بعض کے نزدیک یہ فنکار اور فن کے پرستاروں میں راہ و رسم کا ایک قابل قدر ذریعہ ہے۔
المختصر یہ ایک ادبی رسم ہے اور اہل ادب اس کی افادیت سے بخوبی واقف ہیں۔ البتہ اس قبیلے میں دو ایک معترض بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ مقدمہ' فن سے مربوط تو ہے مگر حقیقی فن نہیں۔ لہذا مصنف عنوان سے ہٹ کر کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں یہ ایک خالصتاً" ادبی معاملہ ہے' اس میں شرک و بدعت نام کی کوئی شے نہیں۔ اور اسے دیس نکالا دے دیا جانا مستحسن نہیں ہوگا۔

"صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

۲

موجودہ دور میں لوگ اس قدر مصروف ہیں کہ سسکیاں سننا تو کجا' ان کے پاس نغمات سننے کا وقت بھی نہیں ــــــ لیکن وقت کے اجلے لباس سے خون جگر کی لالی یوں ہی نہیں اڑ جاتی بلکہ دیکھنے والوں کے لئے ــــــ!
ابھی میری آنکھوں کے دریچے خشک نہیں ہوئے ــــــ اپنے نوجوان بھائیوں کی آوارہ مزاجی دیکھ کر بے اختیار آنسو بھر آتے ہیں جو آہستہ آہستہ "سسکیوں" کی صورت ــــــ!

مسلسل رونے اور رلانے کے میرے اس شغل نے کسی حد تک افرادِ ملت کو متوجہ کیا ہے۔ دکھ درد کی یہ حالت دیکھ کر بعض ساتھی دامن بچا کے چلتے بنے مگر چند احباب آنسو پونچھنے آئے اور خود بھی ——— ایک دوست نے پوچھا ——— "سسکیاں" کرب کے کس دریا کا حاصل ہیں؟ میں ——— چپ رہا' وہ ——— ہنس دیا۔ میں ——— رو پڑا۔ "مظلوم اقبال کی فریاد" ہمیں معلوم نہیں۔ مقبول بٹ کی روح ———؟ میں نے قائداعظم کا لاغر جسم دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھا ہے۔ مسجد اقصیٰ کی چھت سے اٹھنے والا دھواں ——— ہمارے ——— میں نے یوم جشن آزادی (۱۴ - اگست) کو روز ماتم خیال کیا ——— ہم ——— سے جغرافیہ چھن چکا ہے۔ ہم صرف تاریخ کے مزاروں ——— کے مجاور بن بیٹھے ہیں۔

"سسکیوں" کا کوئی اور سبب کیا بتاؤں؟ کاش کوئی اشک آشنا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ——— سسکیاں جو پہلے محدود حلقے میں سنی گئی تھیں' اب کے لامحدود پیمانے پر سنائی دیں ——— لہٰذا' سسکیوں سے پہلے اور بعد کا سارا درد و کرب' الفاظ و فقرات میں کفنا کے مختلف النوع نگارشات کی قبروں میں دفنا دیا گیا ہے۔

۳

انگریز شاعر ولکاکس ایک نظم میں کہتا ہے۔

"اگر میرے قلم سے نکلی ہوئی ایک سطر نے یا میری زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے میرے دوست یا دشمن کے دل کو کسی طرح کی تسکین بخشی ہے تو میرے لئے یہ دنیا بھر کی تمام نعمتوں سے افضل ترین نعمت ہوگی"

"جو کچھ میں نے کہا یا لکھا ہے اگر اس سے میرے ہمسائے کا دل ذرا سا بھی خوش ہوگیا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی کو اپنی محنت کا اجر مل گیا"

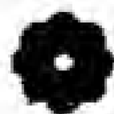
"میں نے دنیا میں جو کام کئے ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کے باعث بھی کسی مغموم دل کا غم گھٹ گیا ہے۔ اگر میری کسی کوشش کی بدولت بجھی ہوئی

پلکیں اٹھ کر فردا کی درخشانی کی امیدوار بن گئی ہیں تو خواہ دنیا کو معلوم ہو یا نہ ہو اور اسے میرا خیال آئے یا نہ آئے خواہ دنیا کو کبھی معلوم نہ ہو سکے اور وہ مجھے کبھی داد نہ دے' لیکن پھر بھی میں اپنے دل سے یہی کہتا رہوں گا کہ میری زندگی اور محنت ٹھکانے لگ گئی"

"اگر میں نے کسی طرح بھی کسی ہستی کو امداد دی یا کسی روح کو خوشی بخشی ہے تو میں یہی سمجھتا رہوں گا کہ میری خوشی کا جام لبالب بھر گیا ہے"

۴

چند برس قبل اس موضوع پر ——— "مقرر بنئے" ——— کا تحفہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ میں نے یہ کتاب اپنے عہد ناپختہ میں ترتیب دی تھی' وسیع حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور میرے پبلشر کو ہر سال نیا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس نسخے کے صحت و معیار پر میں کوئی زیادہ دیر مطمئن نہیں رہا۔ دراصل میری عدم واقفیت کے سبب مقررین کی فہرست میں بعض غیر متعلقہ نام آگئے تھے اور کئی اقتباسات سے مختلف اشعار بھی کھٹکتے۔ کتابت کسی طور بھی معیاری نہ تھی۔ لیکن اب کے مندرجہ بالا نقائص کو رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جدید و قدیم اہل فن کے حسن و قبح کو بھی ضبط تحریر میں لے آیا ہوں اور ہر باب میں خوشگوار اور مفید اضافہ کیا گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے آئندہ اس باب میں تبدیلی نہ ہو پائے گی۔ گویا یہ اضافے اور ترمیم و تنسیخ کے ساتھ نقش آخر ہے۔



مقدمہ خطابت

- فن تقریر اور سرمایہ کتب
- اعجاز نطق کے چند حوالے

تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں کی ترقی و تنزل کا فن تقریر سے بھی ایک گہرا تعلق ہے۔ خطابت کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی ایک عظیم مقصد و جذبہ سے جڑی ہوئی ہے۔ کاروبار خرید و فروخت میں شیریں زبانی یا عام سماجی رویوں میں حسن گفتار اسی شجر کی شاخ ہے' معراج نہیں۔ ہم انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ نابغۂ عصر شخصیتوں کی طرح اعجاز نطق بھی عہد زوال میں ہی پروان چڑھتا ہے۔ ایک عظیم تحریک' شعور مزاحمت اورجوش و ولولہ کے بغیر خطابت و بیان میں کوئی خاص سحر نہیں ہوتا۔

ایک فن آشنا نے بالکل درست کہا ہے۔

"عصر جدید کی سائنسی ایجادات نے نطق و بیان کے پھیلاؤ کے امکانات میں بہت زیادہ اضافہ کردیا ہے۔ اب فانی انسان کی آواز سائنسی آلات کے ذریعے محفوظ ہو کر لافانی بن گئی ہے۔ اب بڑے بڑے جادو بیان خطباء کی خطابت صدیوں تک محفوظ رہ سکتی ہے اور افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ بولنے والے کالب و لہجہ بھی غیر محدود عرصے تک سنا جاسکتا ہے۔ گویا نطق جو آج سے پہلے وقتی طور پر صرف حاضر و موجود افراد کے لئے قابل استفادہ تھا' اب صدہا سال تک غائب اور ناموجود کے لئے بھی استفادہ بخش ہو سکتا ہے"۔

مطلب یہ ٹھہرا کہ فن خطابت اپنی وسعت و تکنیک کے لحاظ سے ایک اہم سائنسی علم کا درجہ رکھتا ہے' مگر از حد تاسف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وطن عزیز میں قومی سطح پر اس فن کے حصول' تربیت اور حسن خوبی پر آج تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

ہمارے ملک میں اسٹیٹ لائف آف پاکستان ایک ایسا شعبہ روزگار ہے جس میں گفتگو اور تقریر کے فن سے بیگانہ رہ کر کامیابی کا ہرگز تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے گزشتہ چند برسوں میں اس محکمہ نے اپنے سیلز مینوں اور پرعزم کارکنوں کی

تقریر و تربیت کے لئے ایک پروگرام تشکیل دیا تھا اور تربیتی نشستوں میں ایک خوش گفتار و کامیاب مقرر "صغیر حسین" کے لیکچرز ہوئے۔ موصوف کا طرز خطابت بڑا تحریکی اور ثمر آور تھا لیکن بوجوہ یہ معاملہ فروغ نہ پا سکا۔ علاوہ ازیں ایک دفعہ فن خطابت سے دلچسپی رکھنے والے عوام کے لئے' لاہور میں کلاس کا اجراء بھی ہوا مگر یہ جدوجہد بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ مقامی سطح پر اس طرح کی دو چار اور کوششیں بھی ناکام ہوئی ہیں۔

۲

مغربی دنیا میں ۱۹۳۶ء میں ڈیل کار نیگی نے ایک کتاب' قائل اور متاثر کرنے کے لئے "گفتگو اور تقریر کا فن" کے نام سے لکھی تھی۔ فن تقریر کے سلسلے میں ڈیل کار نیگی جو کلاسیں منعقد کرتے رہے ہیں' ان میں یہ کتاب نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ بناء بریں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ کی فن تقریر کی کلاسوں میں بھی اس سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ اب تک اس کتاب کی کم از کم پندرہ لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

ڈیل کار نیگی کے علاوہ اس موضوع پر چند اور مغربی مشاہیر نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ پرنسپلز اینڈ ٹاپکس آف سپیچ (ایلن ایچ مزو) سپیچ میکنگ پرنسپلز اینڈ پریکٹس (ولیم۔ این۔ بریگنس ریے۔ کیلر۔ ایمل) اور پٹ مینس ریڈی سپیچ میکر (ایڈون ملن کار) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ دراصل اس موضوع پر مغربی زبانوں میں سینکڑوں کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ارسطو کی کتاب جو کہ یونانی زبان میں تھی' کا انگریزی میں کارٹارک کے نام سے مدتوں پہلے ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳

چند سالوں سے پاکستان میں اردو کی کم مائیگی واضح ہے۔ اردو زبان میں اس فن پر آٹھ

دس کتابوں کے نام ملتے ہیں اور وہ بھی بڑی حد تک انگریزی زبان و ماحول کا چربہ ہیں۔ نذیرالدین احمد صاحب کی تحقیق کے مطابق ہندوستان میں سب سے پہلے "علم املا" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد غالباً" کاشی ناتھ نامی کسی شخص نے ایک پمفلٹ "مجلس علم میں تقریر کرنے کے قواعد" شائع کیا۔ پیسہ اخبار نے ۱۹۰۶ء میں فن تقریر پر ایک کتاب شائع کی۔ ادارہ ادبیات اردو سے اس موضوع پر دو کتابیں اور دہلی وغیرہ سے تین چار کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی روایت کے مطابق "میں نے اردو میں اس موضوع پر جو کتابیں دیکھی ہیں ان میں ایک نظیر حسین سخا دہلوی نے ۱۹۱۱ء میں لکھی تھی۔ مبادیات کے اعتبار سے سخا کی کتاب بری نہیں۔ اس نے انگریزی کتابوں سے مواد حاصل کیا ہے لیکن اردو خطابت کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ غیر موثر ہیں۔ دوسری کتاب موسوم بہ فن خطابت سید کلب مصطفیٰ نے ۱۹۵۴ء کے بعد اور ۱۹۵۸ء سے پہلے لکھی۔ کتاب اچھی ہے لیکن بالعموم انگریزی کتابوں سے مواد مستعار لیا گیا ہے۔ تاہم اسے قابل قدر کہا جاسکتا ہے۔ چند کتابیں اور بھی مل جاتی ہیں لیکن ان کی حیثیت فقط یہ ہے کہ کسی فہرست کتابیات میں شامل کرلی جائیں تو اس موضوع کے تحقیق کنندہ کو ان میں سے کچھ اچھی باتیں مل سکتی ہیں"

فن تقریر پر شائع شدہ کتابوں کی ایک اور فہرست درج ذیل ہے۔

○ فن خطابت:

یہ کتاب شورش کاشمیری کے قلم سے لکھی گئی اور ایک حد تک ذاتی تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ اس میں محض فنی مباحث ہیں، کسی قسم کی تقاریر شامل نہیں کی گئیں۔

○ مباحثے!

اس کے مصنف وحید الحسن ہاشمی دعویٰ کرتے ہیں کہ فن تقریر اور مباحثوں پر اردو زبان میں یہ پہلی کتاب [illegible] ہے

اور ظاہر ہے کہ یہ بیان عامیانہ مبالغے کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز اس میں کوئی فنی بحث نہیں ہے۔

○ اعجاز نطق!

یہ کتاب ابو سعید حیرت جلالپوری مرحوم نے ترتیب دی تھی۔ اس میں مختلف کتابوں کی مدد سے فن خطابت پر اچھا خاصا مواد یکجا کردیا گیا ہے۔ مگر تقریریں بالکل عامیانہ اور غیر اہم ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ انہوں نے مختلف مقابلوں میں کی گئی ابتدائی جماعتوں کے طلباء کی تقریروں کو ہی من و عن شامل اشاعت کردیا ہے۔

○ انداز بیاں:

یہ مولانا کوثر نیازی کا نتیجہ فکر ہے۔ چونکہ مولانا موصوف خود بھی ایک اچھے مقرر اور خوبصورت لکھاری ہیں' اس لئے یہ ایک مکمل اور معلوماتی کتاب ہے۔ اور اس میں ان کی مذہبی و سیاسی تقریریں بھی درج ہیں لیکن یہ صرف بالغ فکر اور پختہ نظر احباب کے کام کی شے ہے۔ مبتدی اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

○ رموز خطابت:

یہ مختصر رسالہ نذیر الدین احمد (عثمانیہ) کا مرتب کردہ ہے۔ اسے حسامی بکڈپو' مچھلی کمان' حیدر آباد (بھارت) نے شائع کیا اور تقریر کے سربستہ راز یعنی رموز خطابت سے متعلق بڑا اہم اور قابل ذکر ہے۔

○ حسن بیان:

اس کے مصنف پروفیسر محمد احمد شاد ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ کتاب فن خطابت پر دور حاضر کا بہترین شاہکار ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تو

سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب محض ایک اضافہ ہے۔
مجموعہ تقاریر پر مبنی کئی اور تصانیف بھی موجود ہیں لیکن ان کو فن خطابت سے کوئی علاقہ نہیں۔ بڑے لوگوں کے ارشادات و ملفوظات کے علاوہ نورانی' ایمانی اور عرفانی طرز کے بھی بہت سے رسائل دیکھے جاسکتے ہیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی انگریزی تقریروں کا مجموعہ "POLITICS OF THE PEOPLE" تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوا تھا اور جسٹس ایم آر کیانی کی تقاریر "افکار پریشان" کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ مذکورہ دو شخصیتوں کا تو بہرحال ایک فنی مقام تھا لیکن صدر ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کی تقاریر کے نمونے بھی دستیاب ہیں۔
الغرض فنی نقطہ نگاہ سے اردو زبان میں کوئی خاص کام نہیں ہوا۔

۴

عربوں میں خطابت کو ایک باضابطہ فن تسلیم کیا جاتا تھا۔ بعض عرب قبائل مثلاً" بنو شعبان اور بنو تمیم کی خطابت درجہء کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ یزید بن ابان نہ صرف خود ایک مانا ہوا خطیب تھا بلکہ اس کے خاندان کا فرد فرد تقریر میں بیباک تھا۔ جبیر' عبداللہ بن عامر' مصعف بن عمر' ابو تمیر' ربیعہ الرائے' سعد بن عبادہ اور ابراہیم بن تیار النظام عربوں میں جادو اثر شمار ہوتے تھے۔
کعب بن لوی ارضیا' عرب کا ایک مشہور مقرر تھا۔ اہل عرب اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو عربوں نے اس کی یاد میں اپنے سن کی ابتدا اس کے انتقال سے کی' جو مدت تک جاری رہا۔
ایک دفعہ صحارا بن عیاش عبری سے امیر معاویہؓ نے دریافت کیا۔
"تم میں بلاغت کیونکر پیدا ہوئی؟"

اس نے کہا۔

"یہ ایک چیز ہے جس کو ہمارے سینے کا جوش ہماری زبان پر پھینک دیتا ہے"

ایک بار عرب کا مشہور خطیب نخار بن لویس عذری ایک معمولی عبا پہنے کسی مجلس کے کونے میں بیٹھا تھا۔ امیر معاویہؓ کی نظر پڑی تو دیکھ کر حقارت سے کہا۔

"ایسا آدمی کیا تقریر کرے گا؟"

وہ بولا۔

"جناب میں بولوں گا میری عبا نہیں بولے گی"

یونان میں فیلقوس کی شورشوں کو ڈیماستھینز اور لی سیاس نے سحر نطق سے سرد کیا تھا۔ قیصر جولیس نے روم کی بدامنی کے زمانے میں اپنی فصاحت ہی کو وقت کی ضرورت کا ہتھیار ثابت کیا اور فرانس نے مسرابو کو دنیا کے سامنے لاکھڑا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ جنرل ڈیرپورا نے برسوں اہل ہسپانیہ کے قلوب پر قبضہ جمائے رکھا۔ جب کبھی وہ کسی مہم کو سر کرنا چاہتا تو اپنے محل سے نکلتا اور عوام سے خطاب کرتا' بالعموم وہی ہوتا جو وہ چاہتا۔

جولائی ۱۷۹۸ء میں احرام مصر کے سامنے نپولین اور اکتوبر ۱۹۲۷ء کو ترکی جمہوری پارٹی کے روبرو مصطفیٰ کمال پاشا نے فصاحت و بلاغت کا بھرپور اظہار کر کے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کی تھی۔ سلطان محمد فاتح نے ایک موقع پر جبکہ فتح کی کوئی صورت نہ تھی' صرف دس منٹ کی تقریر کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور ظہیر الدین بابر نے پانی پت کی جنگ میں بھی خطابت کا جادو جگایا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے جابر گورنر وارن ہیسٹنگز پر شدید مظالم اور شدید اذیتیں پہنچانے کے الزام میں انگلستانی پارلیمنٹ کے چند ممبروں کی جانب سے مقدمہ دائر کیا گیا۔ پارلیمنٹ میں ہیسٹنگز کے احباب بھی موجود تھے اور ان میں سے ایک ایسا بھی تھا جو حقیقی معنوں میں وارن ہیسٹنگز کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ انگلستان کا ایک مشہور جادو بیان خطیب' وارن ہیسٹنگز کے وکیل مخالف کے طور پر کھڑا ہوا اور تقریر شروع کی۔ تقریر شروع کیے ابھی ایک گھنٹہ نہیں گزرا تھا

کہ

کہ ملزم کا دوست بول اٹھا "وارن ہیسٹنگز! یہ کیا بک رہا ہے؟"

دوسرے گھنٹے منظر کچھ اور بدلا۔ تیسرے گھنٹے اس پر مکمل سکوت طاری ہوگیا' چوتھے گھنٹے اس نے کہا:

"وارن ہیسٹنگز! الزام کچھ صحیح معلوم ہوتے ہیں' واقعی تم نے بہت برا کیا"

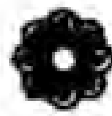
اس کے بعد وہ بول اٹھا۔

"ہیسٹنگز تم نے بڑا غضب کیا' تم یقینی مجرم ہو"

خطاب کے اختتام پر وارن ہیسٹنگز کا جگری دوست کہہ رہا تھا۔

"تو واقعی شیطان ہے' میں تجھ پر لعنت کرتا ہوں"

اس باب میں مولانا کوثر نیازی برک کا تذکرہ کرتے ہیں۔ "اپنے خلاف برک کی تقریر سننے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے اعتراف کیا کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے"۔



خطابت ایک لحاظ سے تدریس سے مشابہ ہے' جس طرح لیکچرار اپنے بیان کو بار بار دہراتا ہے کہ اس کی باتیں اچھی طرح سامعین کے ذہن نشین ہو جائیں اور اگر کچھ لوگ دیر سے پہنچنے کے سبب تقریر کا کچھ حصہ نہ سن سکے ہوں تو وہ پھر سے سن کر سمجھ لیں۔

لوئی جانسن کا کہنا ہے کہ بیان کی خوبی اور رفعت تاثیر زبان سے پیدا ہوتی ہے۔ تاثیر بیان انسان کے ذہن پر نہیں بلکہ جذبات پر اثر کرتی ہے۔ اس کا مقصد سمجھانا نہیں بلکہ ابھارنا ہے۔ تاثیر بیان محض وہبی شے ہی نہیں بلکہ اس کے لئے اکتساب بھی لازم ہے۔ یہ مفکر لفظوں کے سحر کا قائل ہونے کے باوجود الفاظ کو اظہار کا ذریعہ ہی سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خطابت میں جو عظمت' جنوں' قوت بیان' نرمی اور لطافت پیدا ہوتی ہے وہ دراصل الفاظ کے سحر ہی کا نتیجہ ہے۔ اس کا خیال ہے "حسین الفاظ' خیال کے لئے روشنی کا کام دیتے ہیں" جب کوئی حسین خیال حسین الفاظ میں ڈھل جائیں تو "خطابت" ہوتی ہے۔

مزید برآں وہ یہ کہتا ہے کہ کوئی لفظ خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو' موقع و محل کی مناسبت سے ہی اپنا اثر دکھائے گا۔ لفظوں کی عظمت ہر مقام پر بر محل نہ ہوگی۔ اس لئے کہ الفاظ کی عظمت' خیال کے حسن پر مبنی ہے۔ الفاظ خواہ کتنے ہی بلند' عظیم' حسین اور منتخب ترین ہوں اگر خیال بلند' حسین اور منتخب ترین نہیں تو بے اثر ہیں۔ خیال کے حسن کو دوبالا کرنے میں جہاں صداقت کی ضرورت ہے وہاں خلوص اور خون جگر کی بھی ضرورت ہے۔ سامعین میں اثر پیدا کرنے کا فن' خطابت کی جدید صورت سے پہلے بھی موجود تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ سامعین کو متاثر کرکے ہم خیال بنایا جائے۔

روم میں مقرری کا زیادہ چرچا تھا اور نقادوں نے زیادہ تر ان اصولوں پر غور کیا جن سے سامعین پر اچھا اثر ڈالا جاسکے۔ ارسطو زبان کی خوبی' فصاحت و بلاغت اور بیان و بدیع کو "دوسروں کو پھسلانے کی قوت" کہتا ہے۔

کامیاب مقررین کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے اختیار کرنے یا ترک کردینے سے بیان میں کیا خاصیت ابھرتی ہے۔

ایک محقق کا کہنا ہے "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس طرح ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر پرجوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے' خواہ نظم میں ہو یا نثر میں" ـــــــ اگر یہ خوبیٔ بیان' نثر میں ہو تو میرے نزدیک "اعجاز نطق" ہے۔

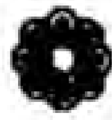
❁

قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی موثر اور دلکش تقریر کرتا تھا' اسی کو شاعر جانتے تھے۔ جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے برجستہ فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال پر فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔

❁

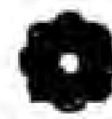
یورپ میں ڈراما کی ابتدا مذہبی ترویج سے ہوئی جن کو مسٹری پلے یا میریکل پلے کہا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ سینکا کی تقلید کی جانے لگی۔ ڈراما سے عمل کو خارج کردیا گیا اور لمبی تقریروں کا رواج ہوگیا جو فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش سے بھری ہوتی تھیں۔

ادھر ہندوستان میں بھی آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کی انفرادیت ان کا وہ انداز خطابت ہے جو انہوں نے بمبئی کے قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد' ابو نصر ماہ سخا ہوشیارپوری اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ مناظروں میں شریک ہو کر سیکھا تھا۔ حشر کے ڈراموں میں خطابت کا جو زور' برجستہ گوئی' روانی' فقرہ بازیوں کی جو شوخی اور شگفتگی و رنگینی کا جو بانکپن ہے وہ انداز بیان کا ہی کرشمہ ہے۔



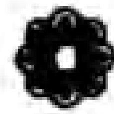
مولوی عبدالحق "دریائے لطافت" کے تیسرے باب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس باب میں نواب عماد الملک' بھاڑا مل' مرزا صدر الدین مغلان اور ملا عبدالفرقان کی دلچسپ تقریریں' خاص کر بی نورن اور میر غضنفر بیتی کی تقریریں پر لطف ہیں"

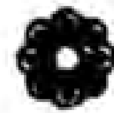


تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی قسم کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا اور قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلنے لگتا ہے۔ غصے میں نہایت روانی و بلند آہنگی کے ساتھ مغلظات اور پورے بدن کا حرکت میں آجانا' نیز غم و اندوہ میں بیساختہ چیخ و پکار جبلت کا خاصا ہے' اس کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ یہی حال ایک مقرر کا ہے۔ ہمارے علم میں ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی تقریر کرتے ہوئے ہمیشہ گھبراتے تھے۔ وہ پیشہ ور مقرروں میں سے نہ تھے تقریر کی واقعیت یا

سے متاثر ہونے کی صورت میں حیرت انگیز تقریریں کرتے تھے۔ دعوتوں یا تفریحی مجمعوں میں ان کی تقریریں بہت اچھی نہ ہوتیں مگر کوئی مرگیا یا رخصت ہو رہا ہوتا یا اس طرح کا واقعہ پیش آجاتا جس سے وہ ذاتی طور پر متاثر ہوں تو وہ ایسی زور دار تقریر کرتے تھے کہ بقول شخصے' ممکن ہے ان کے کسی دوست کے دل میں مر جانے یا چلے جانے کی خواہش کروٹیں لے اٹھتی ہو۔ علاوہ ازیں اردو ہندی قضیے میں نواب محسن الملک نے قومی زبان کی حمایت میں لکھنؤ کے مقام پر ایک جلسے میں یادگار تقریر کی تھی۔

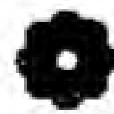


موجودہ دور میں کامیاب خطباء کی آڈیو اور وڈیو کیسٹوں سے بھی اکتساب فن کیا جاسکتا ہے۔ نیز قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر مشق کرنا اور بذریعہ ریکارڈنگ اپنی آواز اور اتار چڑھاؤ کے حسن و قبح کا جائزہ لینا بھی از حد مفید ہے۔

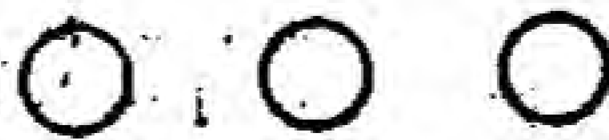


"میں نے بہت سے اساتذہ کی نقل کی یہاں تک کہ خود میرا ایک رنگ بن گیا"

(یہ تجربہ ایک انگریز ادیب رابرٹ لوئی اسیٹونسن نے بیان کیا ہے۔)



فن تقریر کی اہمیت و افادیت ہی کا نتیجہ ہے جس سے متاثر ہو کر مشہور فلاسفی مسٹر لیک (۱۴۳۴ - ۱۷۰۴) نے اپنے مرتبہ نظام تعلیم میں اس کے حصول کو لازمی قرار دیا تھا۔



تاریخ خطابت اور مقررین کی ایک طویل فہرست

- فن تقریر کی تاریخی سرگزشت اور اہمیت
- دنیا بھر کے کامیاب ترین خطباء کا تذکرہ
- قدیم مقررین سے متعلق نرم گرم حوالے
- جدید خطیبوں کی خوبیاں اور خامیاں !!

گفتگو کا سلیقہ بنی نوع انسان کے بنیادی اوصاف میں سے ہے۔ حسن خطابت دراصل انسانی جذبات و احساسات کا فطری اظہار ہے۔ فن تقریر میں ملکہ اظہار شخصیت کا بھی ایک مسحور کن اور قابل ذکر ذریعہ ہے۔ خدائے لم یزل نے اس کا تذکرہ اپنی لافانی و آخری کتاب میں اس طرح بیان فرمایا۔

الرحمن ○ علم القران ○ خلق الانسان ○ علمہ البیان ○

(رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان سکھلایا)

فن نطق و گویائی' بلکہ اظہار و بیان اور کمال حسن خطابت یقیناً زندگی کے لئے پائیدار و لازوال گوہر ہیں اور تمام انسانی خوبیوں کا جوہر قابل بھی۔ حروف و الفاظ کے روپ میں ڈھل کر نکلنے والی آواز کا نام گفتگو ہے۔ فصاحت و بلاغت کے زیور سے آراستہ خطاب و گویائی کو تقریر کہتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگراں خطابت کا مطلب ہے بولنا' خطاب کرنا' دوسروں تک اپنی بات پہچانا اور دلائل سے لوگوں کو سمجھانا۔ حضرت علیؓ تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے ہیں۔

"زبان' آدمی کا ایک جزو ہے اور جب بولنے کی قوت نہ ہو تو فقط بات اسے کوئی مدد نہیں دے سکتی' لیکن اگر بولنے والے میں توانائی ہو تو گفتگو سے مہلت نہیں ملتی اور ہم تو امیر سخن ہیں۔ اس فن کی جڑیں ہمارے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہیں اور اس کی گھنی شاخیں ہم ہی پر سایہ فگن ہیں"

علم النفسیات کی رو سے دنیا میں ہر شخص کی یہ اولین خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بات توجہ سے سنی جائے اور یہ کہ وہ کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی مقصد کے تحت اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کبھی انفرادی طور پر کبھی اجتماعی رنگ میں؛ کبھی خلوت و پردہ میں اور کبھی علی الاعلان و سرعام ـــــــ اسی عمل کا نام

خطابت ہے۔

حسن بیان کی اہمیت و افادیت روایتی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں۔ ہر وقت ' ہر موقع ' ہر جگہ اور ہر حالت میں انسانی کامیابیوں ' بلندیوں اور سرگرمیوں کا سارا راز آداب گفتگو بلکہ کمال گفتگو میں مضمر ہے۔ اس فن کو حاصل کئے بغیر شخصیت کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ ایک مقولہ ہے "تعلیم شخصیت کا آغاز کرتی ہے اور گفتگو اس کی تکمیل" ——— تب ہی تو قدیم یونانی و رومی مفکرین و سیاسی مدبرین نے اسے "فن ترغیب" قرار دے رکھا تھا۔

فصاحت و بلاغت

اظہار و بیان کی دنیا میں فصاحت و بلاغت کا عمل دخل نہایت واضح ہے۔

فصاحت ہے کیا؟

مولانا اصغر علی روحی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "دبیر عجم" میں لکھا ہے کہ "کلمہ فصیح وہ ہے جسے پڑھتے وقت زبان ٹھوکر نہ کھائے یا ثقل سے خالی ہو"

کیفی کے نزدیک "فصاحت ' اجزائے کلام میں حسن ترتیب کا نام ہے"

صاحب غیاث اللغات رقمطراز ہیں "فصاحت ' کشادہ سخن ' تیز زبانی و خوش گوئی کو کہتے ہیں"

منتخب اللغات کے حوالہ سے "فصاحت! بالفتح کشادن ' سخن شدن و تیز زبان شدن"

فیروز اللغات میں اس کے معانی "خوش کلامی و خوش بیانی" کے ہیں۔

مغربی مفکر لارڈ میکالے اس کی تشریح مندرجہ ذیل انداز میں کرتا ہے۔

"[illegible] کے ذہن ان کی کتابیں ہیں ' واقعات زندگی ان کے معلم ہیں اور اہم افعال ان کی فصاحت ہیں"

[illegible] کے الفاظ میں "فصاحت موزوں الفاظ کے انتخاب کا نام ہے اور [illegible] لازم ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال میں احتیاط برتی

جائے" الختصر جذبات کے اظہار کا نام تقریر اور فصاحت و بلاغت اس کا نقطہ عروج ہے۔

تاریخ خطابت کو تاریخ انسانیت سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ درحقیقت تقریر و گفتگو اور نسل آدم ہمدم دیرینہ ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف ادوار میں فلسفہ گویائی کی نوک پلک سنورتی رہی۔ شانہ مشق روز و شب گیسوئے خطابت میں الجھتا رہا۔ فطری تجسس نے حسن بیان کے نقطہ عروج کو پانا چاہا' اسی شوق و جستجو میں کمال خطابت اور اعجاز نطق و گویائی کے تمام راز ہائے سربستہ کی دریافت ہوتی چلی گئی۔

تاہم عام انسانی بول چال کی ہردلعزیزی اور یہ عمدگی سخن دلپذیر اور دل سخن پذیر کی غالباً" انتہائی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اہل علم کے نزدیک اس فن کے موجد رومی ہیں' جب کہ بعض ثقہ مورخ یونانیوں کو بانی و محقق گردانتے ہیں۔
علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے۔

★ "پہلی بار سسلی کے باشندوں نے پانچ سو سال قبل مسیح میں اس فن کے چند بنیادی اصول وضع کئے تھے اور کورکس نامی ایک شخص نے جسے مقدمہ بازی کی عادت تھی' اس کو ایک باضابطہ فن کی حیثیت دی۔ یہ شخص اپنی شعلہ بار اور مدلل تقریروں سے عدالت کو قائل کرکے اپنے حق میں فیصلہ صادر کروالیتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور بہت سے آدمی اس سے باقاعدہ اس فن کی تربیت لینے لگے۔ اس کے شاگردوں میں ایک شخص جس کا نام جارجیاس تھا' یونان کے بادشاہ کے پاس سفیر کی حیثیت سے ایتھنز پہنچا وہاں اس نے عام مجمعوں میں تقریریں کیں تو سارے یونان میں تہلکہ مچ گیا۔ جارجیاس واقعی جادو بیان مقرر تھا"۔۔۔ الغرض تقریر کا فن اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ انسان کی گویائی۔

★ تاریخ خطابت کے مطالعے سے بادی النظر میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ابتداً" اہل یونان نے ہی اس فن کی ترتیب و تہذیب کا بیڑا اٹھایا۔ بعد ازاں اس کے اہل روم کے گرانقدر فکر پارے' معروف [illegible]

اس امر کی گواہ ہیں کہ تحریر و کتابت اور تقریر و خطابت کے اصول و ضوابط مرتب کرنے میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ یونان و روم کے دانشوروں کا یہ امتیاز تو مسلمہ ہے کہ انہوں نے انشاء پردازی' بیان و کلام اور نطق و گویائی کو تکمیلی مراحل طے کرانے کے لئے انتقاد و تحقیق کے قواعد و ضوابط کو جامعہ تحریر پہنایا۔ رومیوں میں ڈیما ستھینز' سقراط' پیر۔ ِکلز' سسرو' کو ٹلین اور لاطینی شاعر ہوریس وغیرہ تو فن خطابت کے شہسوار مانے جاتے ہیں۔

یہ نابغۂ روز گار لوگ اپنے دور کے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ لیکن اس فن پر خون جگر صرف کرکے اسے نقطہ کمال تک پہنچانے کا سزاوار صرف اور صرف یونان و روم کو ٹھہرانے میں کلام ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں اور الہامی کتب قرآن حکیم' توریت' انجیل اور زبور بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ مختلف جگہوں' مختلف ادوار اور مختلف اقوام میں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنے اپنے ماحول میں بڑے حکیمانہ اور بلیغانہ انداز میں تبلیغ و ہدایت کا فریضہ بطریق احسن انجام دیا۔

ارسطو کی کتاب "ر ہطوریک" میں واضح طور پر لکھا ہے "انسانی تمدن کی تاریخ میں صدیوں تک شعر و ادب کا بیشتر کام تحریر کے بغیر ہی چلتا رہا"

قطع نظر اس کے مندرجہ ذیل حکایات ہر کس و ناکس کے علم میں ہیں کہ صدیوں پہلے نمرود کے شاہی دربار میں حضرت ابراہیمؑ کے کمل استدلال و حجت کا مظاہرہ اور فرعون مصر کے سامنے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی سحر بیانی' نیز حضرت شعیبؑ کا خطیب الانبیاء کے لقب سے ملقب ہونا اور لحن داؤدی کی اثر آفرینیاں زبان و کلام کے معجزات کا نمونہ ہیں۔

ان تاریخی حقائق کے پیش نظر حسن فصاحت و بلاغت کو مکمل طور پر روم و یونان کے پلڑے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔

بالغرض زبانوں کی ابتداء ان کے توالد اور مبداء و سرچشمہ کی مختلف کڑیاں ملاتے وقت ہم انبیائے کرام کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کرسکتے بلکہ زبان تیغ کی آبداری اور فن خطابت کا عروج انہی عظیم ہستیوں کا رہین منت ہے۔

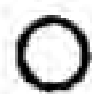
بہر حال خطابت مختلف تاریخی ادوار کی گردش لیل و نہار کے بعد بالآخر حضور پر نور شافع یوم النشور افصح و اکمل سرور کائنات' رفیع الدرجات' فخر موجودات علیہ الصلوۃ والتسلیم کے مقدس و مطہر زمانے میں داخل ہوئی۔ چنانچہ نزول قرآن کے سبب خطابت کو ایک انوکھا روپ مل گیا۔

○ احادیث و سیر کی کتب میں رسول کریمؐ کے حسن خطابت کے بارے میں بہت کچھ رقم ہے۔ نطق بھی آپ کے انداز تکلم پر قربان ہوا جاتا۔ جو کوئی میرے سرکارؐ کے فرمودات ایک بار سن لیتا اس کی خواہش ہوتی کہ دوبارہ سنے۔ پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں سنتے ہی لوگوں کے دلوں میں اتر جاتیں۔ اکناف عالم سے لوگ جوق در جوق آئے اور دعوت حق قبول کرتے چلے گئے۔ اور صرف تئیس برس کے مختصر عرصے میں تاریخ عالم میں ایک فکری' معاشی' معاشرتی اور سیاسی انقلاب رونما ہوا۔

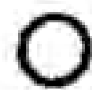
امام غزالیؒ ایک حدیث نقل فرماتے ہیں کہ رسول پاکؐ نے فرمایا۔
"ہم انبیاء کی جماعت ہیں' ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کی حیثیت کے مطابق ان کی پذیرائی کریں اور ان کی عقل کے مطابق ان سے گفتگو کریں"
(عربی سے ترجمہ : بحوالہ' احیاء العلوم جلد اول ص ۳' مطبوعہ مصر)
ایک اور حدیث مبارکہ میں گوہر گرانمایہ ملاحظہ کیجئے۔
"بھول جانا' علم کے لئے آفت ہے اور نا اہل کے ساتھ علمی گفتگو علم کو ضائع کرنا ہے"
(مشکوۃ شریف' کتاب العلم' جلد اول' ص ۳۷ مطبوعہ اصح المطابع' کراچی)
حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایک مرتبہ مجسمہ سوال بن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! آپؐ ہمیں اپنے مسلک سے آگاہ فرمائیں۔ جواباً "صاحب نبوت کے کلام میں نور کی جو لہریں اٹھیں اور دہن مبارک سے جو موتی پیدا ہوئے ان کی مثال تاریخ خطابت میں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ الفاظ محدود' مفاہیم لا محدود' اوبیت و خطابت کا جوش' طرز تکلم منفرد' گفتگو میں روح اخلاص کھلی ہوئی' پر اثر اسلوب اظہار" [illegible]

اصطلاحیں' الغرض دفتر سخن کا ایک ایک لفظ جچا تلا ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"المعرفتہ راس مالی و العقل اصل دینی والحب اساسی و الشوق مرکبی و ذکر اللہ انیسی والثقہ کنزی والحزن رفیقی والعلم سلاحی والصبر ردائی والرضاء غنیمتی والعجز فخری والزھد حرفتی والیقین قوتی والصدق شفیعی والطاعتہ حسبی والجہاد خلقی وقرۃ عینی فی الصلوۃ"



"معرفت میری دولت ہے' عقل اصل دین ہے' محبت میری بنیاد ہے۔ شوق میری سواری ہے' ذکر خدا میرا رفیق ہے۔ مستقل مزاجی میرا مخزن ہے' حزن میرا مونس ہے' علم میرا ہتھیار ہے' صبر میرا لباس ہے (خدا کی) رضا میری غنیمت ہے' عاجزی میرے لئے طرۂ امتیاز ہے' بندگی میرا پیشہ ہے' یقین میری قوت ہے' صدق میرا شافع اور طاعت میرا بچاؤ ہے' جہاد میرا کردار ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"



یہ روز روشن کی طرح ایک واضح حقیقت ہے کہ حضورؐ کی گفتگو نہایت مختصر اور فصیح ہوتی تھی۔ لیکن ایک ایک لفظ سے معانی کے سوتے پھوٹتے تھے۔ الفاظ آہستہ آہستہ اور جدا جدا فرماتے کہ سننے والا ازبر کر سکے۔ کسی مجمع میں گفتگو کے وقت ایک کلمہ عموماً دو بار دہراتے تاکہ عوام الناس کے ذہن نشین ہو جائے۔

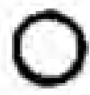


تاریخ اسلام کے اوراق شاہد ہیں کہ حضور اکرمؐ کے وصال کے موقع پر صحابہ کرامؓ ایک عجیب و غریب تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھے۔ حضرت عمرؓ جوش ملال میں [illegible] کہا کہ رسول اللہ کے انتقال سے انکار کر رہے تھے۔ قریب تھا

کہ لوگ ارتداد کی طرف لوٹ جائیں یا مختلف العقائد گروہوں میں بٹ جائیں۔ موقع کی نزاکت بھانپ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ آگے بڑھے اور فرمایا "عمر تم بیٹھ جاؤ" اور مجمع کے ایک طرف کھڑے ہو کر تقریر ارشاد فرمائی۔ خطاب ایسا دل نشیں تھا کہ ہر ایک کا دل مطمئن ہوگیا۔ اس موقع پر آپ نے الفاظ کی قوت سے وہ کام لیا، تاریخ میں جس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

اما بعد! فمن کان یعبد محمدا" فان محمدا" قدمات و من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت' قال اللہ تعالی: وما محمد الا رسول' قد خلت من قبلہ الرسل



"سو جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا' جان لے کہ وہ وصال فرما گئے اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ جان لے کہ وہ تو زندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے' سوائے اس کے نہیں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں' تحقیق آپ سے پہلے بھی کئی رسول گزر گئے"۔

مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد آپ نے بحیثیت خلیفہ جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ حمد و صلوۃ کے بعد آپ نے کہا!

"اے لوگو! میں تمہارا سربراہ مملکت بنایا گیا ہوں۔ میں خود کو تم سے افضل نہیں سمجھتا۔ پس اگر میں نیک کام کروں تو تم میری اعانت کرو اور اگر میں برا کام کروں تو تم مجھے درست کردو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک قوی ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں جو قوی ہے وہ میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک میں اس سے دوسرے کا حق نہ لے لوں (انشاء اللہ)۔ جو قوم جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر ذلت و پستی مسلط کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں اور اگر [illegible]

تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں ' اٹھو! نماز ادا کرنے کے لئے ' اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے"

صاحبزادہ نصیر الدین نصیر گولڑوی ' شہنشاہ بغداد سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے وعظ مبارکہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

○ "حضرت غوث پاکؒ کے تاثیر کلام کا یہ عالم تھا کہ کوئی مجلس وعظ ایسی نہ ہوتی ' جس سے ذوق و شوق ' تصرف و ہیبت اور عظمت و جلال کے باعث کئی جنازے نہ اٹھتے اور سامعین کی کثیر تعداد کئی کئی دن تک مدہوش نہ رہتی۔ دوران وعظ خشیت الٰہی سے گریہ زاری اور آہ و فغاں کا ایک محشر بپا رہتا۔ ہزاروں گریباں چاک ہوتے اور سینکڑوں نیم بسمل مجلس سے تڑپتے اٹھائے جاتے"

اسلامی تاریخ خطابت میں بے شمار ایسے جواہر قابل ہو گزرے ہیں کہ غیر متعصب و غیر جانبدار اہل قلم ان کے حسن بیان کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں۔ ان گنت مسلم معلموں ' متعلموں ' شاعروں ' ادیبوں ' تاجروں ' آجروں ' سیاست دانوں ' حکمرانوں ' سپاہیوں ' سپہ سالاروں ' افسروں اور ماتحتوں نے انداز بیان ' وسعت مطالعہ ' حسن کلام اور میدان بلاغت میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا ہے۔ ایسے ایسے فصحاء و بلغاء کہ ان کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ وہ عظیم مسلمان ہستیاں جنہیں فن خطابت پر دسترس حاصل تھی اور جن کی تقریریں اختصار ' جامعیت ' وسعت معانی ' گہرائی اور سیاسی فراست کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوا کرتی تھیں۔ یوں تو یہ فہرست خاصی طویل ہے لیکن بعض کا تذکرہ نہ کئے بغیر لاعلمی و کم فہمی کے بہانے مزید بڑھ جانے کا خدشہ ہے۔ اس فن میں ید طولیٰ رکھنے والے چند تاریخی مشاہیر کے نام نامی درج ذیل ہیں

[illegible] حضرت ابوبکر صدیقؓ ' حضرت عمر بن خطابؓ ' حضرت سحبان بن وائلؓ ' حضرت علی بن ابو طالبؓ ' سید الشہداء حضرت امام حسینؓ ' حضرت عبداللہ بن زبیرؓ [illegible] عبدالعزیز ' حضرت عکرمہؓ ' حجاج بن یوسف ' عبدالرحمٰن الداخل ' زیاد [illegible] عبداللہ النعیم ' خطیب الامت

قاضی ابوبکر باقلانی' طارق بن زیاد' محمد بن قاسم' موسیٰ بن نصیر' موسیٰ بن غسان' رضیہ سلطانہ' ظہیر الدین بابر' سید جمال الدین افغانی' مولانا فضل حق خیر آبادی اور مصطفیٰ کمال پاشا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

★ عصر جدید کے خطیبوں میں مولانا محمد علی جوہر کی نکتہ آفرینی و جاں فروشی' حضرت حاجی مولانا سردار احمد کا عشق رسول' کمال بلاغت' حق پرستی و نکتہ پروری' مولانا شوکت علی گوہر کی گہرباری و خود اعتمادی' ابوالکلام آزاد کی فصاحت و بلاغت و حریت فکری' سردار عبدالرب نشتر کی شعلہ پروری و خود اعتمادی' مولانا غلام محمد ترنم کی جادو بیانی و اثر انگیزی' عطا اللہ شاہ بخاری کی جرات رندانہ' قرآن خوانی و کمال بلاغت' مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کی علمی بصیرت و فہم قرآنی' آغا شورش کاشمیری کی حق بیانی و شعلہ نوائی ——— مولانا ظفر علی خان کا جذبہ آزادی و شعلہ مقالی علامہ عنایت اللہ مشرقی کے تاریخی خطبے' سید ابوالحسنات احمد شاہ قادری کی علمی بصیرت' قرآن فہمی و آتش بیانی' سید حبیب شاہ کا جذبہ سرفروشی و فن گویائی اور قائداعظمؒ کی زبردست قوت استدلال و بلند فکری کے اپنے اور بیگانے سب معترف ہیں۔

★ مصر کے جمال عبدالناصر اور انڈونیشیا کے احمد سوئیکارنو پوری دنیا میں بالعموم اور عرب ممالک میں بالخصوص مقبول و ہردلعزیز مانے جاتے تھے۔

★ اگر مقررین کو مختلف طبقات اور ادوار میں تقسیم کر دیا جائے تو اظہار رائے میں قدرے آسانی رہے گی۔ سن و سال کے لحاظ سے قبل از زمانہ نبوت' مسلمانان قرون اولیٰ' مسلمانوں کا دور غلامی و زوال' تحریک آزادی و بغاوت' مغربی خطباء اور زمانہ حال و ماضی قریب۔

بناء بریں طبقوں کے باب میں دیکھ [illegible] سیاسی لیڈرز اور مذہبی مبلغ اسلام تحریر میں لائے جاسکتے ہیں۔

★ تاریخ گواہ ہے کہ [illegible] سے زیادہ خطیب [illegible]
کا جوہر تھا کہ ادھر ان کی زبان سے [illegible]

آتیں۔ کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ خطابت کی للکار اور رجز کی پکار کا یہ عالم تھا کہ عربی جامع الکلمات کہلوائی اور واعظین کے زور بیان نے بڑے بڑے سورماؤں کو گمنامی کے جنگل میں عرصہ زیست نبھانے پر مجبور کیا اور کئی ایک غیر معروف افراد کو دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی آخری حدوں تک پہنچایا۔ ان کی زبان سے کسی لڑکی کے بارے میں مدحیہ کلمات صادر ہو جاتے تو پھر عرب کے معزز گھرانے سلسلہ جنبانی میں اولیت کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

○ نذیر الدین احمد صاحب نے اس عہد کی کئی اقدار و حکایات کا تذکرہ کیا ہے۔ معبد بن طوق عنبری' عرب کا ایک مشہور خطیب تھا وہ ایک بار کسی محفل میں تقریر کے لئے کھڑا ہوا اور نہایت عمدہ تقریر کی لیکن اسی محفل میں جب اس کو دوبارہ بیٹھ کر بولنا پڑا تو وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا' اہل مجلس تعجب میں تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ کسی نے معبد سے وجہ پوچھی معبد نے کہا

"جب میں کھڑا ہوتا ہوں تو جوان ہو جاتا ہوں اور جب بیٹھ جاؤں تو بوڑھا ہو جاتا ہوں"

(یاد رہے خطباء عرب عموماً" اونٹ پر سوار ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے)

عرب کے ایک مشہور خطیب ایاس سے لوگوں نے پوچھا

"تم میں صرف یہ عیب ہے کہ اپنے خطبے پر بہت ناز کرتے ہو"

ایاس نے جواباً" کہا:

"میری تقریر تم کو پسند ہے یا نہیں؟"

انہوں نے کہا ——— "کیوں نہیں"

بولا "تو خود میں اس کو کیوں پسند نہ کروں"

★ دمشق کی مسجد میں ایک خستہ حال مقرر آیا' رواج کے مطابق اس کو کوئی اہمیت نہ دی گئی لیکن جب اس نے اپنی خطابت کے جوہر دکھائے' تب سامعین کو مقرر کی شخصیت کا پتہ چلا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ عرب کا مشہور [illegible] کی لو سکتا ہے

"ہم اور تم دونوں مجرم ہیں۔ تم نے فقیروں کی صورت میں آکر بادشاہوں کی طرح تقریر کی"

علیا بن ہشم نے ایک بار حضرت عمرؓ کے سامنے نہایت برجستہ تقریر کی' آپ ہمہ تن گوش رہے' جب وہ چلا گیا تو فرمایا۔

"آدمی کا تجربہ اس کی خوبیوں سے ہو سکتا ہے"

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وہ خطبہ جو آپ نے رسول پاکؐ کے وصل پر' مضطرب و بے قرار ہجوم کے سامنے دیا' تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں دلنشیں و اثر آفرین خطبے فرمائے۔

☆ حضرت علی المرتضیٰ' میدان شجاعت کی طرح دنیائے خطابت میں بھی بے نظیر و بے عدیل اور ایک فرد فرید ہیں۔ علمائے عرب و عجم اس بات پر متفق ہیں کہ آپ سے بڑھ کر ما سوائے انبیا و رسل کے اور کوئی افصح الکلام نہیں۔ نہج البلاغہ' آپ کے خطبات اور مضامین حکمت و موعظت کا مجموعہ ہے۔

☆ سید الشہداء امام عالی مقام حضرت حسینؓ بھی ایوان خطابت کے ایک روشن ترین چراغ' دانش و بینش کا مجسمہ اور مواعظ حسنہ کا ناقابل فراموش کردار ہیں۔ آپ کی ہمشیرہ سیدہ حضرت زینبؓ بھی اپنے عظیم خاندان کے طرۂ امتیاز کے مطابق فصاحت و بلاغت میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ جب اسیران کربلا کا قافلہ کوفے کے بازار میں سے گزر رہا تھا تو ایک موقع پر آپ نے شدت غم میں خطاب فرمایا' اس خطاب کے بارے میں بشیر بن خزیم اسدی کا کہنا ہے۔

"میں نے کبھی ایک پردہ نشین خاتون کو اس طرح پر زور تقریر کرتے ہوئے نہیں سنا تھا' یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپؓ کی زبان سے آپ کے والد بزرگوار' علی ابن طالبؓ بول رہے ہیں۔ آپ کی اس دل ہلا دینے والی تقریر کے دوران میرے گرد و پیش تمام سامعین دانتوں میں انگلیاں دبائے رو رہے تھے"

☆ صوفیاء کرام نے بھی دعوت و ارشاد کا سلسلہ تقریر وعظ کی صورت میں جاری رکھا۔ تمام رہنمایان شریعت سالکان طریقت' قلندران حقیقت اور نوابان معرفت

تقریر و خطابت میں خاص تاثیر رکھتے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام مقرر' سامعین کے دماغوں پر یلغار کرتا جبکہ ایک مرد درویش کا مشن دلوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔ لفظوں کے بازیگر سٹیج پر دھاڑتے چنگھاڑتے اور کرتب دکھاتے ہیں مگر ان مقدس ہستیوں نے "مجالس" میں ملفوظات و ارشادات کے وسیلے سے سچ سچ اپنا اثر دکھایا۔

★ برصغیر پاک و ہند کے خطباء میں زیادہ تر مسلمان معروف ہوئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا ظفر علی خان' نواب بہادر یار جنگ اور مولانا محمد علی جوہر یکتائے روزگار تھے۔ سر فیروز شاہ مہتہ' بدرالدین طیب صاحب اور حضرت قائداعظم بنیادی طور پر عدالتی و قانونی مقرر شمار ہوتے ہیں۔

○ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ہم عصر مشاہیر سے مختلف زاویہء نگاہ رکھتے اور نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے تھے۔ ان کے بارے میں کوثر نیازی کے تاثرات قابل ذکر ہیں۔

"مولانا بنیادی طور پر ایک اعلیٰ پائے کے انشاء پرداز تھے۔ انہوں نے انشاء پردازی کے ذریعے صحافت میں نام پیدا کیا اور صحافت کے رستے سیاست میں داخل ہوئے ——— سیاست' صحافت' تفسیر' حدیث' فقہ اور علم کلام کا یہ شہسوار فن خطابت میں بھی بے مثال اور نادرۂ روزگار تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"لوگوں کی نگاہیں میرے ہونٹوں کی جنبش کا انتظار کرتی ہیں" مولانا امین احسن اصلاحی نے کہا تھا "ان لوگوں کا دماغ کئی ہزار دماغوں کا نچوڑ ہے" مشہور صحافی ملک نصراللہ خان عزیز کے قول کے مطابق "جب مولانا تقریر کرتے تھے تو سامعین پر نور کی ایک چادر تن جاتی تھی"۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان تمام تر کمال کے باوجود عوام کے لئے ثقیل ہوتی تھی۔ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کی وجہ سے ان کی اردو "معرب" اور "مفرس" تھی۔ ان کی تشبیہات' استعاروں اور فارسی کے اشعار کو سمجھنے کے لئے علمی پس منظر کی ضرورت تھی اور یہ خواص میں تو تھا مگر عوام میں نہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ بہت بڑے خطیب ہونے کے

باوجود اہل علم کے طبقے سے نکل کر عوام میں مقبول نہ ہوسکے۔ عوام اگر ان کی تقریروں پر سر دھنتے تھے تو محض حسن عقیدت اور اس جذبہ تاثیر کے ماتحت کہ وہ امام الہند کی تقریر سن رہے ہیں"

آغا شورش کاشمیری، مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر آتے ہی الفاظ کے پیچوں میں الجھ جاتے ہیں

"مولانا ابوالکلام آزاد اردو خطابت کے لئے قدرت کا عطیہ تھے۔ ان کے لئے ہر موضوع ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھا۔ مذہب پر بولتے تو عبقری عصر تھے، ادب پر خطاب کرتے تو ہر ادیب و شاعر کا شعلہ گفتار بجھا جاتا اور سیاست میں خطابت کے تمام اوصاف ان کے چوبدار تھے۔ ان سے بڑا خطیب، اردو زبان آج تک پیدا نہیں کر سکی۔ وہ خطابت کے افق پر صبح خنداں کا اجالا تھے اور الفاظ و مطالب ان کے خانہ زاد تھے۔ انہوں نے ابتدائی عمر میں ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی اور مولانا حالی سے اپنی خطیبانہ صلاحیتوں پر خراج حاصل کیا تھا۔ علامہ شبلی ان کے دماغ کو قدرت کا معجزہ قرار دیتے تھے"

○ بندۂ احقر کو ایک بار صاحبزادہ ایوب سلطان صاحب چوراہی نے بتایا "دہلی میں سیرت کانفرنس تھی، مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کو سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کی تقریر غالباً" تین گھنٹے جاری رہی۔ سامعین ٹکٹکی باندھے مسلسل ان کے چہرے کو تکے جا رہے تھے۔ کیا مجال کوئی اٹھ کر گیا ہو یا کسی نے اکتاہٹ محسوس کی۔ مولانا اپنے سحر خطابت سے کبھی دماغوں پر استیلا پاتے اور کبھی دلوں کے تار ہلاتے تھے۔ ان سے اچھا خطیب میں نے آج تک میری آنکھوں نے دیکھا اور نہ ہی کانوں نے سنا ہے"

○ مولانا محمد علی جوہر بھی خطابت میں یکہ تاز مانے جاتے ہیں۔ ایک ماہر فن کے بقول ان کے الفاظ میں ان کا دل ہلکتا اور خون بولتا تھا، وہ مضمون سے مضمون پیدا کرتے اور رنگا رنگ کے مجمع کو اپنی بنا دیتے تھے۔ ان کی خطابت کے اجزائے ترکیبی میں اخلاص فی العمل کا ولولہ تھا۔ وہ خطابت میں تکرار پیدا کرکے تمام کو وحدت ذاتی کی طرف لے جاتے تھے"

ایک اور صاحب مولانا جوہر کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

"مولانا محمد علی جوہر آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ انہوں نے دو اخبار کامریڈ (انگریزی) اور ہمدرد (اردو) جاری کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی دھوم مچ گئی۔ وہ جتنے اعلیٰ پایہ کے انشاء پرداز تھے اس سے کہیں بڑھ کر مقرر تھے۔ ان کے انداز خطابت کا اعتراف اپنے بیگانوں نے کیا ہے۔ انگریزی زبان کے شہرہ آفاق مصنف ایچ جی ویلز نے ان کے متعلق لکھا تھا "محمد علی کا دل نپولین کا' قلم میکالے کا اور زبان برک کی تھی" مولانا محمد علی جوہر کی لذت تقریر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اپنے زیورات تک اتار کر تحریک خلافت کے فنڈ میں دے دیا کرتی تھیں اور جب انہوں نے ہندوستان کو دارا لکفر قرار دیتے ہوئے ہجرت کی تحریک شروع کی تو ہزاروں لوگ اپنے گھربار چھوڑ کر کابل جا بسے۔ زور بیان اور روانی کے علاوہ ان کی برجستہ گوئی اور حاضر جوابی اپنی مثال آپ تھی۔ طنز و ظرافت کی چاشنی سے بھی کام لیتے تھے۔ آواز ایسی پاٹ دار تھی کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا' کارخانے میں توپیں ڈھالی جا رہی ہیں"

○ مولانا ظفر علی خان بھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ بیک وقت انشاء پرداز' قادر الکلام شاعر' سیاست دان' صحافی اور انقلابی بلکہ باغی مقرر۔ فن خطابت میں ان کا یہ مقام تھا کہ لاکھوں کا ہجوم' ان کی تقریر کے دوران ساکت و صامت ہو جاتا تھا۔ انہوں نے ہی پنجاب میں احرار کی شعلہ بیانیوں کا مقابلہ کرکے اپنا نام تاریخ خطابت میں سنہری حروف سے لکھوایا ہے۔ ان کے ایک نامور شاگرد کے [illegible] مولانا قلم کے دھنی اور زبان کے غنی تھے۔ ان کی خطابت میں ضرب ید [illegible] تک وہ زبان و محاورہ کے استاد تھے۔ ان کے جملے دریائی لہروں کی [illegible]

[illegible] کے دور پر [illegible] ایک دور گزرا

کہ یہ پنجاب میں مقبولیت عامہ کے لحاظ سے سب سے آگے تھے' مگر مجلس میں چوں چوں کے مربہ' ان کی لاابالی طبیعت اور متواتر سیاسی غلطیوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ احرار بلاشبہ علماء کے ذہن' خلافت کی تحریک' الہلال کی فکر اور زمیندار کے قلم کی پیداوار تھے' لیکن ان میں جذباتیت زیادہ اور سنجیدگی کم تھی۔

○ اگرچہ ماضی قریب میں اسلامیان ہند کی صفوں میں ایک سے ایک بڑھ کر خطیب اور واعظ موجود تھا مگر جس جادو بیان نے پورے ملک میں خطابت کا لوہا منوایا اور عوامی حلقوں میں مقبولیت کا وہ رتبہ پایا کہ آج تک کوئی ان کا ہمسرو ثانی نہیں ہے------ یہ آتش نوا' سید عطا اللہ شاہ بخاری تھے------ وہ مختلف تحریکوں سے وابستہ رہے' ان کی نصف عمر جیل اور بقیہ ریل میں گزری۔ بڑے بڑے جلسوں کو ایک جادوگر کی طرح اپنی تقریر سے مسحور کیا۔ وہ عموماً" رات کے نو دس بجے تقریر شروع کرتے تو صبح تک کئے جاتے اور سننے والے اپنے تئیں بالکل تر و تازہ اور آمادۂ سماعت پاتے۔ چٹکلوں اور لطیفوں سے روتے ہوؤں کو ہنسا دینا' قہقہے لگاتے مجمع کو شدت جذبات سے بے اختیار رلا دینا اور جذبہ شہادت و فلسفہ قربانی کے بیان سے تن من دھن لٹانے پر تیار کرنا ان کے روز مرہ کا معمول تھا۔

قرآن حکیم تلاوت فرماتے تو ایسا لگتا تھا جوں شجرو حجر جھوم اٹھے ہوں۔ محسوس ہوتا جیسے کہ پرندے اپنی اڑان بھول گئے ہیں۔ احراری مکتبہ فکر مسلمانان ہند کی کوئی قابل ذکر سیاسی خدمت تو نہ کر پایا لیکن جماعت میں بڑے بلند پایہ اور نامور عوامی مقررین پیدا کئے۔ ان میں شاہ جی تو اپنی مثال آپ تھے۔ آزادی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے اور قومی تحریکوں میں خطاب فرماتے ہوئے کہیں [illegible] شعلے لپکتے اور کبھی ان کے لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ موسیقی کے زیر و بم کی طرح ہوتا۔ دراصل وہ راگ (تقریر) سے آگ لگانے میں [illegible] [illegible]

☆ امرتسر نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے علاوہ جس [illegible] خطیب نے نام کمایا' وہ مولانا غلام محمد ترنم [illegible]

مرتبہ سب سے بلند ہے۔ دینی حلقوں میں واقعی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ چونکہ درویش منش اور تصوف پسند انسان تھے' اس لئے عموماً گوشہ نشین رہنا پسند فرماتے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے سامنے کسی کا بھی چراغ نہیں جلتا تھا۔

ایک ذمہ دار محقق ان کے بارے میں اعتراف عظمت کے طور پر لکھتے ہیں۔
مشکل سے مشکل دینی مسائل کو عام فہم لفظوں اور مثالوں سے اس طرح حل کر دیتے تھے کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء حیران رہ جاتے تھے۔ خطابت پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ ابھی ہزاروں کے مجمع کو رلا رہے ہیں اور یک بیک ہنسانے لگے ہیں۔ ایسے قادر البیان تھے کہ اگر چاہیں تو دوران تقریر سو بار رلائیں اور سو بار ہنسائیں۔ مگر جب واقعات شہادت سیدنا حضرت امام حسینؓ بیان کرتے تھے تو خود روتے تھے اور سارے کا سارا مجمع اشک بار رہتا اور بہتوں کی چیخیں نکل جاتیں ۔ مولانا کا بیان شہادت ' اہل سنت کے عقائد حقہ کے عین مطابق ہوتا تھا اس پر بھی ایک شیعہ ذاکر نے کہا کہ "ہم ترنم صاحب کے مقابلے میں جھک مارتے ہیں۔" حضرت ترنم جب مقام مصطفیٰ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تقریر کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ مضامین عرش سے اتر رہے ہیں۔ اور بعض اوقات ان پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ آنسو گھنی داڑھی سے بہہ بہہ کر قمیض کو تر کر دیتے تھے اور سامعین یہ محسوس کرتے تھے کہ مولانا وجد کی حالت میں ہیں۔"

مولانا ترنم کی اسی شان مقبولیت کے پیش نظر مولانا ظفر علی خان نے کہا تھا۔

ترنم چاند ہے اس شہر میں علم اور حکمت کا
فدرمشاں اس کے ہالے ہیں مسلمانان امرتسر

[illegible] اے حمید صاحب نے ایک مضمون "امرتسر کی ایک گلی" میں مولانا ترنم کی خطابت کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اس مضمون کا وہ حصہ جو مولانا ترنم سے متعلق ہے [illegible] صاحب کے حوالے سے بطور ضمیمہ درج ذیل [illegible]

"مسجد قاصداں کے دونوں میناروں پر اکالی سکھوں نے اپنے زرد جھنڈے گاڑ رکھے تھے اور اس کی محرابوں پر سکھ عورتیں اوپلے تھاپ رہی تھیں۔ یہ وہی مسجد تھی جس کے درودیوار جمعے کے روز مولانا غلام محمد ترنم کی ولولہ انگیز تقریروں سے گونجا کرتے تھے۔ شہر کے دور دراز محلوں سے مسلمان، مسجد قاصداں میں مولوی ترنم کی تقریر سننے آیا کرتے۔ سیاہ کالی گھنی داڑھی، گھٹا ہوا مضبوط بدن، چوڑا چکلا ہر وقت مسکراتا ہوا نورانی چہرہ ———— مولوی ترنم گیندے اور سرخ گلاب کے ہاروں سے لدے پھندے جب منبر پر چڑھتے تو نمازیوں میں عقیدت اور جوش ایمان کی ایک لہر دوڑ جاتی، مسجد کا صحن، ہال کمرہ، چھتیں اور گلی نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ چھت پر تمبو، قناتیں لگی ہوتیں، جہاں پردہ دار بیبیاں ہمہ تن گوش ہوتیں۔ حضرت قبلہ ترنم صاحب عشق رسالت مآب میں سرشار آنکھوں سے مجمع پر نگاہ ڈالتے۔ والہانہ انداز میں گردن کو دائیں بائیں گھماتے اور پھر جیسے خدا کے حضور میں مودب ہو کر آنکھیں بند کر لیتے اور لب معجز گفتار سے یہ الفاظ نکلتے۔

"نحمدہ و نصلی ————"

اس کے بعد خطابت و بلاغت کا ایک دریا بہہ نکلتا جو پر پیچ وادیوں کے ٹیلوں سے ٹکراتا، کھائیوں کو پر کرتا، سنگلاخ چٹانوں کو پیچھے چھوڑتا، بالآخر ایک بحر زخار میں جا ملتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار محرم کے دنوں میں مولانا ترنم شہداء کربلا کا ذکر کر رہے تھے، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو، چھت پر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

ایک جلسے میں کشمیری گھرانوں کی شاہ خرچیوں اور خاص طور پر بیاہ شادیوں کے موقع پر ان کی خوش خوراکی اور بے جا اسراف پر تقریر کر رہے تھے کہ شادی کی دعوت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا۔

"دیگیں" کھل گئی ہیں۔ دسترخوان لگ گئے ہیں، پلاؤ کی مہک اڑنے لگی ہے۔ زردہ، بریانی، فرنی سے بھرے ہوئے

قاب جا رہے ہیں۔ اوئے چھیدے قورمہ ہو ہوئے جا۔ کاکا جی
پشم دی بوٹی بھیج دیا جے۔ نی صغراں تنجن دا اقاب دے جا۔"

لوگ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے۔ اچانک مولانا ترنم کا لہجہ بدل گیا۔ بجلی کی طرح کڑک کر کہا۔

"شرم کرو۔ ہنستے ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہمارے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ ان کے گھر میں فاقہ آ جاتا تھا۔ مسلمانو! کہاں سے چلے تھے اور کہاں آ گئے ہو؟"

اس کے بعد اسلامی تاریخ کے اوراق کچھ ایسے دلگداز انداز میں الٹنا شروع کرتے ہیں کہ وہی مجمع جو ایک منٹ پہلے ہنس رہا تھا سسکیاں بھرنے لگتا۔"

یہ شناور دریائے علم و ادب ' افلاک حکمت کا خورشید خاور ' محیط سخن کا درخشندہ گوہر ' فقیہہ و محقق ' معلم و مفسر ' مدبر و مبصر ' بلا کا مفکر اور جہان خطابت کا ماہ منور ' فصیح البیان ' تاجدار تکلم ' مولانا غلام محمد ترنم ۲۴ر جولائی ۱۹۵۹ء ' جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب سفر آخرت اختیار کر گیا۔ بقول انہی کے:

وہ سوز کہاں مطرب دوراں کی زباں میں
جو سوز ترنم کو عطا تو نے کیا ہے

★ اگر تحریک آزادی کے مقررین کا تفصیلی جائزہ لیا جائے ' تاریخی کتب اور مطبوعہ سرکاری رپورٹیں کھنگالی جائیں تو سینکڑوں ایسے قد آور اور شعلہ بیان مقرر نظر آئیں گے جو وقت کے ساتھ ہی پیش منظر سے پس منظر میں چلے گئے۔ مورخین اور محققین کا قلم بھی ان کا کھوج لگانے سے عاری نظر آتا ہے۔

درحقیقت کوئی عوامی تحریک جس میں عوام کو جھنجوڑنے کے لئے جلسوں کا سہارا لیا گیا ہو ' وہاں یہ جولانیاں نہیں سینکڑوں بلند پایہ خطیب نظر آتے ہیں۔ مذہبی و سیاسی تحریکوں کے دوران ایسے مقررین کا ابھر آنا فطری امر ہے۔

☆ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ میں برطانوی سامراج سے ٹکر لینے والے رضا کاروں اور سیاسی لیڈروں کے خطابت کی بجلیاں جا بجا خرمن باطل پر گرتی رہیں۔ لائل پور (فیصل آباد) سے ۱۹۰۶ء میں اٹھنے والی کسان تحریک نے شہاب الدین جیسا نامور مقرر پیدا کیا۔ اس کے بعد ملک لال خان اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو' رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک میں سامنے آئے۔ تحریک حریت کشمیر نے خطیبوں کی گنتی میں مزید اضافہ کیا۔ شیخ عبداللہ' چوہدری حمید اللہ مرحوم اور اے آر ساغر اسی تحریک نے پیدا کئے اور یہ تینوں میدان خطابت کے مانے ہوئے شہسوار تھے۔ تحریک خلافت' مجلس احرار اور بعد ازاں پیپلز پارٹی نے اپنی اپنی صفوں سے مقررین کے کئی جتھے پیدا کئے۔

☆ اپنے اپنے زمانہ عروج میں خاکسار پارٹی اور مسلم لیگ بھی اس کریڈٹ سے محروم نہیں رہی۔ احرار کی لنکا کا ہر فرد باون گزا تھا۔ عام کارکن سے لے کر قائد تک سب خطیب۔ مولانا گل شیر خان نے فصاحت و بلاغت میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔ چوہدری افضل حق' مولانا مظہر علی اظہر' شیخ حسام الدین' مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور عبدالقیوم ہزاروی بھی خطابت میں اپنی مثل آپ تھے لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تو جواب ہی نہیں۔ وہ لاکھوں میں ایک تھے۔ آغا شورش کاشمیری اور صاحبزادہ فیض الحسن آلو مہاروی نے بھی اپنی خطابت کے دائمی نقوش چھوڑے ہیں' انہیں اس حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

☆ صاحبزادہ افتخار الحسن' سید مظفر علی شمسی' مولانا محمد علی جالندھری' ماسٹر تاج الدین انصاری' قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا غلام غوث ہزاروی کا نام شاید ہی کسی نے نہ سنا ہو' یہ سب آسمان خطابت کے درخشندہ ستارے اور احراری کان کے ہیرے تھے۔

☆ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے خطابت کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ بعض تحریکوں اور احتجاجی سلسلوں نے تقریر و بیان کے جوہر دکھائے اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان نے نظریاتی پہلو بھی نکھار دئیے تھے۔

☆ مسلم لیگ کے روح رواں' محسن ملت' بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے تفصیلی تذکرے کے بغیر جس طرح برصغیر کی سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی' اسی طرح تذکرۂ خطابت میں بھی ان کا ذکر انتہائی اہم ہے۔

☆ اس بارے میں ایک فاضل نے بڑا دلچسپ تذکرہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے' لکھتے ہیں:

"اس کا احساس شاید کم لوگوں کو ہے کہ ایک انتہائی بلند کردار' راست گفتار اور عظیم سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے پارلیمانی مقرر بھی تھے۔ کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن بنوا کر ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس نے انہیں بقائے دوام کی سند عطا کی ہے۔ لیکن یہ کارنامہ جہاں بڑی حد تک ان کی ایمانی قوت اور حسن تدبر کا نتیجہ ہے وہاں اس کے لئے ان کی مہارت تقریر کو بھی خراج تحسین پیش کرنا پڑے گا۔ تعلیم کے دوران وہ برطانوی پارلیمنٹ میں مسٹر گلیڈ سٹون' مسٹر مورلے' مسٹر چیمبرلین اور دوسرے برطانوی مدبرین کی تقریریں بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتے تھے اور ان کا ذہن اندر ہی اندر آئینی مباحثوں اور سیاسی تقریروں کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں وہ ہندوستان کی مرکزی کونسل کے رکن منتخب ہوئے' ۱۹۴۷ء تک متواتر منتخب ہوتے رہے' پارلیمانی بحث مباحثوں میں کوئی شخص ان کے مقابل کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اسمبلی میں ان کی تقریریں جوش اور ہوش کا حسین امتزاج ہوا کرتی تھیں۔ وہ جس موضوع پر بولنے کا ارادہ کرتے اس کے متعلق پوری تیاری کر کے اسمبلی میں جایا کرتے تھے۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا' ان کا انداز تقریر نہایت واضح اور غیر مبہم تھا۔ وہ بہت تیز بولتے تھے اور نہ بہت آہستہ اور نہ بہت اونچی اور نہ بہت دھیمی آواز میں۔

ان کی تقریر ولولہ انگیز ہوتی تھی لیکن اس کے اندر ٹھوس منطقی استدلال ہوتا تھا اور ہرچند کہ ان کی ہر تقریر میں جوش اور جذبہ پایا جاتا تھا لیکن جذبات کو

مشتعل کرنے والی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ وہ الفاظ کے استعمال پر پوری طرح قادر تھے اور اپنی تقریر میں ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی صرف نہ کرتے تھے۔ اسمبلی کے طویل زمانہ رکنیت میں انہوں نے جو تقریریں کی ہیں وہ ان کی غیر معمولی قانونی قابلیت اور آئینی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

پارلیمانی خطابت سے گزر کر جب ہم عوامی جلسوں میں ان کی تقریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں وہ عام طور پر پہلے سے تیار کئے ہوئے خطبات سے کام لیتے تھے لیکن بسا اوقات انہیں فی البدیہہ تقریریں بھی کرنا پڑتی تھیں اور یہ فی البدیہہ تقریریں کبھی کبھی بہت طویل بھی ہوتی تھیں' لیکن کیا مجال کہ کہیں ربط ٹوٹے یا ذرہ برابر جھول آئے۔ لوگ ان کی تقریروں سے مسحور ہوجایا کرتے تھے اور وہ لوگ بھی جو ان کی تقریر سمجھ نہ سکتے تھے' ان کے لب و لہجہ اور انداز خطابت سے ایسے متاثر ہوتے کہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھے نہایت عقیدت و احترام سے ان کی تقریر سنتے رہتے " عقیدت و احترام کے یہ سلسلے اپنی جگہ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی طرح قائداعظم بھی کوئی عوامی مقرر نہ تھے۔ ممکن ہے ان کے خطاب میں ضمنی طور پر کوئی فنی خصائص شامل ہوں لیکن وہ کوئی خطیب یا واعظ نہ تھے۔ تاہم وہ مرہون خطابت بھی نہ تھے۔ ان کا قد کاٹھ اتنا بلند تھا کہ خطباء ان سے فیض اٹھاتے۔ ہاں' قائداعظم ایک کامیاب پارلیمانی مقرر اور قانونی مباحث نبھانے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔

☆ پنجاب مسلم لیگ میں میاں افتخار الدین ایک ایسے مقرر تھے جو پبلک جلسوں اور پارلیمنٹ دونوں میں اپنے فن خطابت کی خصوصیات کی وجہ سے ہر دلعزیز رہنما تھے۔ تحریک آزادی کے دنوں میں مسلم لیگ اچھے مقررین سے بھری ہوئی تھی۔ بنگال میں ۱۹۴۷ء سے پیشتر کئی مقرر شعلہ بیانی میں بے مثل تھے۔ اے کے فضل حق' حسین شہید سہروردی' مولانا ترکباغیش' حمید الحق چودھری محمد

الحق، عبدالحمید خان بھاشانی، عطاء الرحمٰن خان اور شیخ مجیب الرحمٰن اپنی خطابت کے باعث شہرت عام رکھتے تھے اور ان حلقوں میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

★ روزنامہ سیاست کے مدیر و مالک سید حبیب شاہ صاحب ادیب تو نہیں لیکن خطیب بہت اچھے تھے۔ آواز میں گونج اور گرج تھی۔ قلندرانہ انداز میں مطلب کی بات کرتے۔ وہ یونہی بے پر کی ہانکتے اور نہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے۔

○ سردار عبدالرب نشتر، دنیائے خطابت کا ایک روشن نام ہے۔ وہ اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی خاصا نام پا چکے تھے۔ آگے چل کر جدوجہد آزادی کے دوران ان کے اخلاص عمل، سلاست و روانی، حاضر جوابی و برجستہ گوئی، قائداعظمؒ کی قیادت پر اعتماد، شعر و ادب سے گہرا لگاؤ، اردو زبان سے عشق، اشارات کے طلوع و غروب اور لہجے کا نشیب و فراز برملا پکارتا تھا کہ خطابت کا جوہر گویا ان پر ختم ہے۔

"سردار عبدالرب نشتر علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کا لہجہ منجھا ہوا تھا۔ انتہائی اعتماد سے بولتے اور بیان کے پھیلاؤ سے اجتناب برتتے تھے۔ خطابت میں مولانا محمد علی جوہر سے فیضان پایا تھا۔ سرحد میں قائداعظم جناحؒ کے سفیر تھے۔ ان کا اسلوب نطق یہ تھا کہ دلازار الفاظ سے پرہیز کرتے اور کسی عنوان سے کوئی چٹکی لیتے تو مطائبات کی حدود میں رہتے"۔ کردار و افکار اور اسلامی اقدار کے لحاظ سے بھی ایک عظیم انسان تھے۔

○ مسلم لیگ کے دائرے میں خطابت کا روشن ترین چراغ اور اس لڑی کے سب سے قیمتی گوہر کا نام، نواب بہادر یار جنگ ہے۔ آپ ایک منٹ میں تین سو کے لگ بھگ الفاظ بولتے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ بڑے وضعدار انسان، دل درد مند رکھنے والے مسلمان، مستقل مزاج اور بیباک و نڈر سپاہی، ہمہ جہت، ہمہ رنگ، ہمہ صفت، ہمہ پہلو اور آتش بیان مقرر تھے۔ ان کی خطابت میں آبشار کا بہاؤ اور لہجے میں نسیم صبح کی غنچہ کشائی کا کیف ہوا کرتا۔

تمکنت' صبا رفتاری' بلند آہنگی' پرکشش شخصیت' جوش عمل' پیکر اخلاص' فنی لوچ پچ' آواز میں نفاست' لہجے میں اعتماد و اعتقاد اور اثر آفرین خطاب کے بادشاہ تھے۔

★ قوم و ملک کی بدقسمتی تھی کہ عنفوان شباب میں جہان آخرت کو سدھار گئے۔ موت کا انتخاب اور اس پر تاثیر دعا کا ثبوت ایک علیحدہ موضوع اور ایمان افروز باب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جوہر خطابت کا لاجواب ملکہ عطا کیا تھا۔ ان کے خمستان سخن میں ہر طرح کے جام اور ہر رنگ کی شراب تھی۔ بناء بریں ان کی آواز میں لٹک اور کھنک کا جوہر نمایاں تھا۔

★ "نواب بہادر یار جنگ تحریک پاکستان کے بڑے سرگرم کارکن اور قائداعظم کے انتہائی مخلص اور جانثار ساتھیوں میں سے تھے (بالخصوص) دکن کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ اپنی خطابت کے زور پر وہ جلد ہی ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور اور مقبول ہوگئے۔ ان کا انداز خطابت دوسرے تمام رہنماؤں میں نمایاں اور انفرادیت کا حامل تھا۔ چونکہ وہ سرتاپا خلوص اور عمل تھے' اس لئے ان کا ایک ایک لفظ پر تاثیر اور سامعین کے دل میں گھر کرنے والا ہوتا تھا۔۔۔۔۔ ان کی تقریر میں روانی بھی بہت تھی اور موضوع کی مناسبت سے کبھی یہ روانی آتش فشاں لاوے کی طرح ہوتی تھی اور کبھی نرم رو جوئے بار کی طرح۔ ان کے لہجہ میں تلوار کی کاٹ تھی اور بیان میں جوش ایمان کی فراوانی"۔۔۔۔۔

★ نواب مرحوم مجمع کو زور بیان سے پلٹ دیتے۔ آپ سرمایہ تقریر کی جمیع خوبیوں کا ہالہ تھے۔ ہوائیں رک رک اور وقت ٹھہر ٹھہر کر انہیں سنتا تھا۔ بے ریا کردار' بلند نصب العین' صداقت شعاری' طلاقت لسانی' وحدت مقصد' بے عیب آواز' اخلاص فی العمل اور عظمت فکر و عقیدہ ان کے تاریخ ساز ہونے پر گواہ ہے۔ ان کی تقریر میں پھول کی مہک' کندن کی دمک' ہیرے کی ڈلک' چاند کی چمک' رعد کی کڑک' غنچے کی چٹک' فضا کی کھنک' پائل کی کھنک اور ڈھول کی دھنک ہوا کرتی تھی۔

☆ آہ! نواب بہادر یار جنگ، جوانی کے پہلے موڑ پر ہی داغ مفارقت دے گئے ورنہ ان کو سننے والے بتاتے ہیں کہ اگر زندگی ان سے وفا کرتی تو نہ صرف ہندوستان کے نامی گرامی مقرر ان کی جوتیاں سیدھی کرتے بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کا ملکہ خطابت بہرحال تسلیم کیا جاتا۔ نواب بہادر یار جنگ کو سننے والے ایک ماہر فن کا کہنا ہے کہ "سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس دشت کی سیاحی میں پوری عمر گزار کر جو مقام حاصل کیا وہ معراج خطابت نواب مرحوم کو عہد شباب میں ہی حاصل تھی۔ مقصد یہ ٹھہرا کہ اگر یہ شعلہ مستعجل جلد نہ بجھتا تو شاہ جی ان کے خوشہ چینوں میں ہوتے۔ آغا حشر کاشمیری ایک مقبول عام، شعلہ نوا اور کامیاب ترین مقرر تھے۔ بناء بریں نسیم حجازی نے تاریخی ناولوں میں اپنے مرکزی کرداروں سے دل میں اتر جانے والی تقاریر کروائی ہیں۔ مگر یہ محض موصوف کے قلم کا کرشمہ ہے کیونکہ ان کے ہیرو تو تاریخی افسانوں کا حصہ ہیں۔

☆ پنجاب کمیونسٹ پارٹی میں بھی اچھے مقررین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکن اس کی آغوش میں ایک ایسے مقرر نے بھی پرورش پائی جس کی تقریر عالمی شہرت کی حامل تھی اور ہندوستان بھر میں انہیں چوٹی کے خطیبوں میں جانا جاتا تھا۔ یہ شخصیت کامریڈ ڈاکٹر اشرف کی تھی۔ انہوں نے آزادی کے چند برس بعد، جوانی و کہولت کی سرحد پر انتقال کیا۔ منشی احمد دین پنجاب میں سوشلسٹوں کے جنرل سیکرٹری تھے۔ جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہو گا کہ وہ ایک بلند پایہ اور کامیاب مقرر تھے۔ الفاظ کا چناؤ، مطالب کا تسلسل، منطق کی گہرائی، استدلال کا خلوص، زبان کی روانی، بیان کا سحر، غرض ایک بڑے مقرر میں جو کچھ ہونا چاہیے ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔

☆ ڈاکٹر شیخ محمد عالم ایک اعلیٰ پایہ کے مقرر اور دانشور سیاست دان تھے مگر ان کی طبیعت میں اکلاؤ اور عمل میں ٹھہراؤ نہ تھا۔

☆ جمعیت العلماء ہند کے ایک مانے ہوئے مقرر جس کی شہرت پنجاب کی

سرحدوں سے باہر جاچکی تھی' مولانا احمد سعید دہلوی تھے ـــــ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی قابل ذکر ہیں ـــــ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بعض عقیدتمند ان کو ہندوستان کے حجازی خطیب کہا کرتے تھے۔ دیو بندی مکتبہ فکر کی اکثریت مجلس احرار سے وابستہ تھی' ان کا تذکرہ قبل ازیں آچکا ہے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا ضیاء القاسمی' مولانا عبدالشکور دین پوری' مولانا عبدالستار تونسوی اور مولانا منظور احمد چنیوٹی کو بھی واعظانہ مقررین میں شمار کرسکتے ہیں۔ آج کل اس حلقے میں سعید احمد ملتانی کا نام خاص طور پر سنا جاتا ہے' حالانکہ اسے خطیب کہنا ہی فن خطابت کو رسوا کرنے کے مترادف ہے۔ یوں بھی یہ شخص مذہبی فتنہ پرداز' غیر سنجیدہ و کم فہم اور مغلظات و غیر معیاری طرز سخن کا رسیا ہے۔ بناء بریں یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مولانا حق نواز جھنگوی مرحوم نے اپنی محنت و خطابت سے کم از کم جھنگ کی حد تک انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

☆ "منیر انکوائری رپورٹ" میں نوشہرہ ورکاں (گوجرانوالہ) کے ایک اور احراری مقرر کا تذکرہ ملتا ہے جو دیہاتی فضا اور سیاست کی سرد بازاری کے سبب وقت کے ساتھ ہی گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔

☆ ابو شوکت صفدر سلیمی مرحوم کا تذکرہ بھی ان اوراق میں از حد ضروری ہے۔ وہ خاکسار تحریک کے ایک منجھے ہوئے مقرر شمار ہوتے ہیں۔ اپنے لوبانہ اور جذباتی رنگ خطاب کی وجہ سے حلقہ مقررین میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

○ مجموعی لحاظ سے جماعت اسلامی کا مکتب فکر خطیبانہ جوہر سے محروم ہے۔ جیسا کہ مولانا کوثر نیازی صاحب روزنامہ "جنگ" ۲۸۔ مارچ ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں۔

"اس جماعت کے اکابر کی تقریریں' خشک تحریروں کی مانند ہوتی ہیں اور ان تقریروں میں وہ ایسی ثقیل اور مشکل اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جو اکثر اوقات سامعین کے سر سے گزر جاتی ہیں۔"

بایں ہمہ تین شخصیتیں اس جماعتی رنگ سے مستثنیٰ تھیں۔ وہ ہیں جناب

مولانا امین احسن اصلاحی' نعیم صدیقی صاحب اور مولانا گلزار احمد مظاہری۔ یہ تینوں اچھے مقرر شمار ہوتے ہیں۔ ان کا وعظ و خطابت میں اپنا ایک رنگ ہے ان کی تقریریں علم اور جذبے سے خالی نہیں ہوتیں۔

★ الغرض عہد حال میں ان کے لیاقت بلوچ' پر اعتماد لہجے میں اپنا مافی الضمیر بطریق احسن ظاہر کرسکتے ہیں' کیونکہ ان میں ایک اچھے مقرر کی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جماعت اسلامی کی ایک مقررہ آپا نثار فاطمہ' میدان خطابت میں ایک اونچا مقام رکھتی ہیں۔ سابقہ قومی اسمبلی میں محترمہ موصوفہ کی نقری آواز غنیمت تھی۔ برقعہ پوش آپا کی آواز جب ایوان میں گونجتی تو تقدس کا ایک خوشگوار ماحول پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

○ نوابزادہ نصراللہ خان' جدید و قدیم طرز خطابت کا سنگم ہیں۔ ظفر و شورش کی روایت کا آخری فرد۔ ان کی تربیت مجلس احرار میں ہوئی تھی۔ یہ بند ہوتے ہوئے بازار کا آخری ٹمٹماتا ہوا چراغ ہیں۔ شرافت کا پیکر اور تہذیب کا مرقع! دوران تقریر میں اساتذہ کے بر موقع و منتخب اشعار' منفرد انداز میں پڑھتے اور تڑپاتے ہیں چونکہ خود بھی کلام موزوں کرتے ہیں' اس لئے ادائیگی و تلفظ قابل رشک ہے۔ فطرتاً" اختلافی مزاج رکھتے ہیں "اتحاد سازی" میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ فی زمانہ فن میں ان کا درجہ سب سے برتر و اعلیٰ اور قابل ذکر ہے۔

○ اہلحدیث علماء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری ایک قد آور مناظر تھے۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کو بھی ایک اچھا مقرر سمجھا جاتا ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر اپنی شخصیت اور ڈرامائی پہلوؤں کے بل بوتے پر سامعین کی توجہ کا مرکز بن جایا کرتے تھے۔

○ ایک لحاظ سے وکلاء کا پیشہ بھی "تقریر" ہے۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں قانونی نکات اور فنی معاملات میں اثر انگیز لب و لہجہ و گفتگو اپناتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سیاست کی ہنگامہ آرائی اور مہم جوئی [illegible] کی سب بد نظمی نے انہیں صرف [illegible] کر رکھا ہے۔ قانون دان طبقے میں ایک سے ایک منجھا ہوا مقرر

ذ

ہے لیکن جو منفرد مقررین کے طور پر شہرت رکھتے ہیں اور جو شیلی تقریر کرنے میں جنہیں مہارت تامہ حاصل ہے ان میں اعتزاز احسن' چوہدری رفیق احمد باجوہ' ایس ایم ظفر اور میاں محمود علی قصوری بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ایم آر کیانی مرحوم (سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ لاہور) بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

○ جمعیت العلمائے پاکستان کے پلیٹ فارم پر جن حضرات نے اپنی شعلہ نوائیوں' پر اثر گفتگو اور دلائل کے سبب خطابت کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کیا وہ کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے اصول خریدے جاسکتے ہیں اور نہ انہیں حق بات کہنے سے باز رکھا جاسکتا ہے۔

یہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے داعی اور نظریہ پاکستان کے دوست ہیں۔ عشق رسول ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ سیرت النبی پر بول رہے ہوں یا سیاست کی ہما ہمی موضوع گفتگو ہو۔ حکومت کی غلط پالیسیاں تنقید کی زد میں ہوں تو ارباب اقتدار کا رنگ فق' ہے' ہنگم اچھل کود کی مذمت ہو تو سامعین منہ تکتے رہ جائیں۔ عشق رسالت کی بات چلے تو ریت کے ذروں میں دھڑکتے ہوئے دل پیدا ہو جائیں۔ خلفائے راشدین کا تذکرہ مقصود ہو تو عظمت کی داستان کانوں میں رس گھولنے لگے۔ سوشلزم و کیمونزم کا رد کرتے وقت بلاغت کی چاشنی سے سطح ذہن پر اسلامی اقدار کے دائمی نقوش مرتسم ہو جائیں۔ الغرض کوئی پہلو ہو مقررین موصوف اپنی خطابت کا منفرد انداز رکھتے ہیں۔ میرا اشارہ جماعت مذکور کے بعض رہنماؤں کی طرف ہے۔

☆ میرے خیال میں ان حضرات کی بطور خطیب کامیابی کا راز صاف گوئی اور جذبہ خلوص میں مضمر ہے۔ دل کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے کے بعد جو بات بھی ہونٹوں پر مچلے وہ اپنے اندر اثر ضرور رکھتی ہے۔ یقیناً یہ اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔

○ اس حلقے میں سب سے بلند اور محترم نام مولانا شاہ احمد نورانی کا ہے۔ مولانا موصوف کا کردار بے داغ [illegible] اور [illegible]

ہے۔ تلاوت قرآن پاک میں تو وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ سات زبانوں پر مکمل عبور ہے۔ انگریزی بڑی شائستہ بولتے اور موتی رولتے ہیں۔ حکومت نوازی ان کی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ فطرتاً" تنقیدی اور حزب اختلاف کا مزاج رکھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں پورے ایوان پر بھاری ہوا کرتے تھے۔ حق بات ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں۔ نورانی میاں غالباً" بغیر کسی تیاری کے تقریر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار ان سے اپنے مقام سے کمتر جملے بھی صادر ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نورانی صاحب کی صلاحیتوں کا آدمی بمشکل ہی مل سکتا ہے اور خطابت و موعظت میں ان کا ایک منفرد اور روشن مقام ہے۔

○ مولانا عبدالستار خان نیازی' زمانہ طالب علمی میں یقیناً اچھے مقرر رہے ہوں گے۔ لیکن اب گلا ان کا ساتھ نہیں دیتا۔

لیکن باوجود اس کے "مرد حق مرد غازی' خان نیازی خان نیازی" کے نعرے لگتے اور بالعموم دلچسپی سے سنے جاتے ہیں۔ سامعین میں زیادہ تعداد روایتی عقیدت مندوں کی ہوتی ہے۔ مولانا صاحب کی سیاسی فرقہ پرستی اور کھری کھری گفتگو سے عوام کے لئے تفریح کا سامان ہو جاتا ہے۔

○ ادارہ منہاج القرآن کے بانی اور پاکستان عوامی تحریک کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر علامہ محمد طاہرالقادری تو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ نکتہ سنجی' نکتہ رسی' نکتہ دانی اور نکتہ بیانی ان کی منفرد خصوصیت ہے۔ آواز کی گرج' نشیب و فراز اور درست تلفظ کی صفات ان کے حسن بیان کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ پروفیسر صاحب کا انداز حیرت انگیز تھی۔ میں نے بچشم خود دیکھا کہ آپ خطاب فرما رہے ہیں سامعین میں سے کثیر تعداد اشکبار ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ دل و دماغ میں جا [illegible]۔ آپ استدلال کے بادشاہ ہیں۔ تقریر دھیمے انداز میں شروع کرتے' [illegible] پھیلاتے' باہم کڑیاں ملاتے' ایک نکتہ اٹھاتے' اس کی وضاحت فرماتے' [illegible] سمیٹ کر جال میں لاتے' دماغوں کو اجالتے' خطابت کی تہ سے

موتی اچھالتے' کہیں کہیں اچھوتے انداز میں مسکراتے اور بیان کو بڑے احسن طریقہ سے انجام تک پہنچاتے ہیں۔

پروفیسر طاہرالقادری صاحب نوجوان طبقے میں زیادہ مقبول ہوئے اور تمام مکاتیب فکر کی آنکھوں کا تارا رہے ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ جچا تلا اور اگلی پچھلی کڑیوں سے مربوط ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے عام طور پر تیاری کے بغیر کبھی لب کشائی نہیں کی۔ ظاہر ہے اپنے بیان کی نوک پلک ہر لحاظ سے سنوارتے ہوں گے۔ راقم الحروف نے دو چار مرتبہ ان کے خطاب میں عدم ربط اور روایتی انداز بھی دیکھا۔ شاید اس لئے کہ وہ تیاری کو صحیح وقت نہیں دے سکے تھے۔ بہرحال

اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ اپنے دور کے ناقابل فراموش خطیب ہیں بالخصوص مذہبی موضوعات اور جدید علمی تحقیقات میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ وعظ و خطابت کے بادشاہ اور فی الواقع بے مثل مقرر ہیں۔

○ سید ریاض حسین شاہ صاحب' ادارہ تعلیمات اسلامیہ راولپنڈی' کے ڈائریکٹر اور اتفاق مسجد ماڈل ٹاؤن' لاہور میں خطیب ہیں۔ پروفیسر طاہرالقادری صاحب ان کے پیشرو تھے۔ اسی لئے بعض احباب تقابلی جائزہ کیا کرتے اور معاصرانہ چشمک گمان میں لاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں حضرات کے مزاج خطابت میں خاصا اختلاف ہے۔ پروفیسر طاہرالقادری صاحب اپنے منطقی انداز سے عقل و دماغ کا شکار کرتے جبکہ حضرت قبلہ شاہ صاحب دلوں کے تار ہلاتے اور جذبات میں بہا کر لے جاتے ہیں۔ پروفیسر موصوف دلائل و مباحث میں یکتائے روزگار جبکہ شاہ صاحب ولولوں اور جذبوں کو ساتھ بہا لے جانے میں فرد وحید ہیں۔ الغرض سید ریاض حسین شاہ صاحب اپنی ایک الگ دنیا بنائے ہوئے ہیں۔ عمیق مطالعہ' علم الحدیث اور رموز قرآن کے اوصاف آپ کو کامیاب واعظوں کی صف اول میں لاکھڑا کرتے ہیں اور رعب دار شخصیت انہیں دبدبہ [illegible] بخشتی ہے۔ عشق رسول کا سرور' قرآن کا [illegible] شبنم کی ٹھنڈک' گلاب کی مہک' بلبل کی [illegible] کا [illegible] کی

کیفیت اور بلند آہنگی و شیریں بیانی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان کی نگاہ میں بہ نسبت چھلکے کے مغز کی زیادہ وقعت ہے۔ آپ الفاظ کے چناؤ اور شعروں کے جڑاؤ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر الفاظ کے زیر و بم اور باقاعدہ تیاری پر توجہ دیں تو شہریار خطابت تسلیم کئے جائیں گے۔

○ حاجی محمد حنیف طیب دھیمے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے مطالعہ سے رشتہ نہیں توڑا اس لئے ان کی تقریریں موثر اور معلومات افزا ہوتی ہیں۔ شعر و ادب سے ان کا خاص لگاؤ ہے اور دوران تقریر میں ان کا بیساختہ استعمال کرتے ہیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ حاجی صاحب ایسی یادداشت شائد ایک عجوبہ ہے ان کا دماغ ایک کمپیوٹر ہے۔ موصوف کی قوت حافظہ ناقابل یقین حد تک تیز ہے۔ انہی گوناگوں اوصاف کی وجہ سے حنیف طیب صاحب کا خطاب پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور غور سے سنا جاتا ہے۔

○ مولانا اکبر ساقی مرحوم اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ گئے ہیں۔ یہ آواز گزشتہ دنوں ہمیشہ کے لئے چپ ہوگئی۔ ہر حلقے میں ان کا احترام تھا اور باذوق سامعین گوش ہوش سے سنتے تھے۔ شیعہ مجلسوں میں مرحوم کو بوجوہ پسند کیا جاتا۔ مولانا محمد اکبر ساقی کو بات کہنے اور سمجھانے کا سلیقہ تھا اس لئے ان کا نفس کلام مربوط ہوتا۔ چونکہ ساقی صاحب کا گلا بلند آہنگی کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا لہٰذا وہ آواز کو ایک مناسب ٹھہراؤ میں رکھتے۔ اس سے غنائیت و موسیقیت کا رنگ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اپنے انداز کے پہلے اور آخری مقرر تھے اور خطابت کا تذکرہ ان کے بغیر نامکمل و تشنہ رہے گا۔

○ علامہ نصرت نوشاہی (بھرچور شریف) علمی قابلیت، بالغ نظری، فلسفے کی گہرائی، آنکھوں میں گہرائی، صحت تلفظ، بلاغت کی چاشنی، مضامین کی رنگارنگی، منقول اور عقلی دلائل، حاضر کی شخصیت اور وسیع مطالعہ کا مرقع ہیں۔ ان [illegible] کے سبب محترم علامہ صاحب چوٹی کے واعظوں کی صف اول میں شمار [illegible]

ہوتے ہیں۔ مضامین مثنوی' تاریخی واقعات' روح تصوف اور نکتہ سنجی ان کا اصل میدان ہے۔ علامہ موصوف عربی' فارسی' اردو اور پنجابی پر مکمل درک رکھتے ہیں۔ آپ ایک مدت تک ریڈیو پاکستان سے منسلک رہ کر خطابت و مواعظت نبھاتے رہے اور اس میں بڑا نام کمایا۔ نہایت ہی خوش اخلاق' خوبصورت اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے انسان ہیں۔ فصاحت و بلاغت میں شاید ہی ان کا کوئی ثانی ہو۔ کئی مرتبہ ان کا وعظ سننے کے علاوہ ایک دو دفعہ مجلس میں بیٹھنے کا شرف بھی مقدر ٹھہرا۔ آپ کی وسیع النظری اور علمی فوقیت کا اندازہ بھی ہوا اور اپنی علمی بے بضاعتی و کم فکری کا بھی۔ ان کے لہجے میں مٹھاس اور انداز بیان میں وہ سوز کہ چلتے چلتے مسافر رک جائیں۔ اڑتے اڑتے پرندے ٹھہر جائیں۔ ادھر ہونٹ وا ہوئے' ادھر کانوں کے دریچے کھلے اور الفاظ پھوار کی طرح دل میں اترتے چلے گئے۔

○ صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی' عہد حاضر کے ایک سنجیدہ و متین مقرر ہیں۔ جملہ اصناف سخن اور نثری گوہرپاروں پر ان کی ناقدانہ نگاہ رہتی ہے۔ ان کے واعظوں سے مترشح ہوتا ہے کہ جدید ادب سے نسبتاً" زیادہ متاثر ہیں۔ دوران تقریر میں اقوال زریں اور اشعار کا برموقع استعمال فرماتے ہیں۔ ایوان اتحاد کے بانی اور ماہنامہ الفجر لاہور کے حقیقی مہتمم ہیں۔ اتحاد امت اور فرقہ وارانہ زہر کی بیخ کنی کے لئے شب و روز کوشاں۔ آپ کی خطابت کا پسندیدہ موضوع بھی یہی ہے۔ بولتے ہیں تو موتی رولتے ہیں۔ علامہ نصرت نوشاہی اور صاحبزادہ گیلانی صاحب عوام میں کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئے۔ سبب ظاہر ہے کہ سامعین میں متانت کم ہے اور تبحر علمی نہیں رہا۔ بھلا لڑنے لڑانے والوں کا طوطی بولتا ہو تو سچے موتیوں کے قدردان کس طرح میسر آئیں گے۔

○ نذیر احمد غازی صاحب جو لاہور ہائی کورٹ میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل ہیں' ایک مقرر کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ میدان خطابت میں ان کی کامیابی کا راز غالباً یہ ہے کہ انہوں نے انتخاب الفاظ و اشعار میں تیاری کو ملحوظ

نظر انداز نہیں کیا۔

○ اہلسنت والجماعت المعروف بریلوی مکتبہ فکر میں اچھے خطیبوں کی کوئی کمی نہیں۔ مولانا محمد بخش مسلم بی اے اور مولانا غلام محمد ترنم کہنہ مشق اور منجھے ہوئے مقرر تھے۔ بعض اوقات ان کا بیان ایسا ہوا کرتا تھا کہ سامعین حسرت و ارمان' شوق و محبت اور سوز ساز میں اٹھ اٹھ کر روتے اور رو رو کر بیٹھتے تھے۔

ظہور الحسن بھوپالی سیاسی و مذہبی خطابت کا ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھا۔ ان کے بلند قد کاٹھ کا تذکرہ الفاظ میں کسی طور بھی ممکن نہیں وہ اپنے دور میں صحافت' سیاست' خدمت' شجاعت اور خطابت ہر میدان میں نمایاں رہے۔ ان کے بلند اور بیباک لہجے کی گھن گرج ابھی تک کراچی میں سنائی دیتی ہے۔ بھوپالی مرحوم' بلا مبالغہ اپنے عہد کے بے مثل مقرر تھے۔ صد حیف کہ بزم خطابت کا یہ عظیم چراغ عین جوانی میں ہی موت کے ہاتھوں بجھ گیا' وگرنہ ملک بھر میں کوئی ان کے برابر نہ ٹھہرتا۔

عطاء المصطفیٰ جمیل بھی اپنا موضوع خوب نبھاتے ہیں۔ شہیدان ناموس رسالت کا بیان ہو تو خود روتے دوسروں کو رلاتے ہیں۔ مطالب کی ادائیگی میں تو گویا ان کا ہدف ثریا ہے۔ مولانا غلام رسول غازی (چنیوٹ) اور سید عبدالرحمٰن شاہ بخاری (قائداعظم لائبریری) بھی اپنے اپنے حلقوں میں روشن نام ہیں۔ نوجوانان لاہور میں احمر بلال صوفی نامی ایک مقرر بھی دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔ مولانا ضیاء القادری صاحب بھی فن خطابت میں کسی سے کم نہیں۔ علامہ حامد سعید کاظمی مذہبی خطبات میں مہکتے اور سیاسی تقریروں میں خوب چمکتے ہیں۔ ان کا انداز خطابت اپنے اندر کشش کا وافر سامان رکھتا ہے' شعر و ادب سے انہیں خاص دلچسپی اور منشور حیات خاصا بلند ہے۔ مولانا محمد یار مرحوم آف گڑھی اختیار خان' مسلک کی ترجمانی میں جس زور بیان سے کام لیتے وہ انہی کا حق تھا۔

○ ایک اور مرحوم و مغفور ہستی کے بارے میں "شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو" کا بیان [illegible] ہوتا ہے۔

"یہ سحر آفرین آواز حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی" (۱۹۷۰ء) کی تھی۔ جادو بیان مقرر اور خطیب تھے وجیہہ اور طرحدار خطیب ہونے کے علاوہ ایک جید عالم با علم، تفسیر و حدیث کے ماہر، غیر معمولی مناظر و منطقی اور معقول و منقول شخصیت تھے۔ حاضر جوابی، شگفتہ بیانی، طنز بلیغ، لحن داؤدی اور حق گوئی و بیباکی اس مرد آہن کا طرۂ امتیاز تھا۔ بعض اوقات تو علم سے پیدل اور ظاہری چمک دمک رکھنے والے لوگوں، نام نہاد دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، مفاد پرست سیاستدانوں، جعلی صوفیوں اور جاہل پیروں کو برسر عام جھاڑ پلادیتے——— ایک مرتبہ ملک کے نامور اور درویش سیرت ادیب محترم عزیز ملک صاحب نے بیان کیا کہ فروری ۱۹۵۳ء میں جب ختم نبوت کی ملک گیر تحریک چل رہی تھی تو راولپنڈی میں ایک جلوس کے اختتام پر لیاقت باغ میں حضرت قبلہ بابو جی اور علامہ ہزاروی سٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ مجمع ایک لاکھ سے کچھ ہی کم ہوگا۔ مولانا مرحوم نے جب اپنے مخصوص سحر انگیز بیان میں متنبی قادیان کے دجل و فریب کے بخیے ادھیڑے تو ان کی تقریر کے خاتمہ پر بقیہ علماء نے یہ کہہ کر اختتام جلسہ کا اعلان کردیا کہ علامہ ہزاروی" کے بعد کون سی میخ رہ گئی ہے۔ جو متنبی قادیان کے تابوت میں پیوست کی جائے"۔

○ گوجرانوالہ کے ایک درویش صفت واعظ مولانا غلام نبی صاحب (گزشتہ دنوں انتقال فرماگئے ہیں) کا خطاب مردہ دلوں میں نور ایمان بھردیتا تھا۔ سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، عشق رسول کی شدت، اظہار بیان کا سلیقہ، موزوں اقوال زریں اور دل کو موہ لینے والی نکتہ آفرینیاں، پردۂ سماعت سے ٹکراتیں تو آنکھ کے خشک جھروکوں سے سیلاب اشک اڈنے لگتا تھا۔

ایک دفعہ میں مسجد سے ملحقہ روڈ پر جارہا تھا کہ کانوں میں ایک میٹھی آواز نے رس گھول دیا۔ قدم بے اختیار اسی جانب اٹھ گئے۔ اس دن کے بعد بے قراری کے ساتھ جمعہ کا انتظار رہتا۔ جی چاہتا تھا کہ تقریر کے الفاظ ختم ہی نہ ہوں۔ میں نے دیکھا کہ مولانا غلام نبی صاحب [illegible]

آنکھیں ان کے چہرے پر جمی ہیں کہ ادھر الفاظ ان کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہیں اور ادھر مجمع میں کھلبلی مچ جاتی۔ روتے روتے بارہا لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آقائے مدنی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی ہر دل میں تڑپ پیدا ہوتی اور چار سو بے خودی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔"

○ جب فن تقریر کا ذکر چل نکلتا ہے تو یار لوگ پیر سید یعقوب شاہ مرحوم آف پھالیہ' کبیر علی شاہ صاحب' سید شبیر شاہ حافظ آبادی' مولانا احمد علی قصوری اور جناب سعید احمد مجددی کو بھی کامیاب واعظین میں شمار کرتے ہیں۔ اس فہرست میں کئی اور نام بھی شامل ہیں۔ ہر علاقے اور ہر طبقے میں لازماً" کوئی نہ کوئی ہر دلعزیز مقرر موجود ہیں نیز یہ کہ اپنا ایک وسیع حلقہ بھی رکھتے ہیں۔

○ حسن اتفاق سے مجھے صاحبزادہ ایوب سلطان صاحب صدیقی نقشبندی چوراہی کے وعظ سننے کا موقع ملا۔ داد خطابت کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صاحبزادہ موصوف کے کالبد میں علامہ فیض الحسن سہاروی کی روح تڑپ پھڑک رہی ہے۔ بجلی کی تیز روی' رنگ تغزل' نگاہ بلند' سخن دلنواز' مصلحانہ انداز' ساز آشنائی' اشارات و کنایات' سیاسی بصیرت' طنز و مزاح اور نوک جھونک پر انہیں مکمل دسترس تھی۔ سوز میں آجائیں تو ہنستوں کو رلا دیں۔ زمزمہ کی چوٹ سے اگر ساز چھڑ جائے تو چٹکی بھر میں روتوں کو ہنسانے لگیں۔ چونکہ پیشہ ور اور خود نما مقرر نہ تھے اس لئے شہرت نہ ملی اور قضا نے بے وقت ہی مار دیا۔

○ انجمن طلباء اسلام نے بھی مقررین کی ایک کھیپ تیار کی۔ ان میں محمد عثمان نوری' نور المصطفیٰ رضوی' امجد علی چشتی' راؤ ارتضیٰ حسین اشرفی' حافظ محمد تقی صاحب (سابق ایم پی اے و صوبائی مذیر سندھ)' ڈاکٹر ظفر اقبال نوری نمایاں نام ہیں۔

المختصر یہ کہ مذہبی نقطہ نگاہ سے ہر مسلک کے مبلغین کا رنگ جدا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں اکثریت کا پیشہ ہی وعظ و خطابت ہے جس کے تسلسل نے بیشتر مبلغین کی قطار میں لاکھڑا کیا ہے۔

★ شیعیت کے حلقہ اثر میں مجلس پڑھنا اور ذاکری کو چونکہ ایک خاص مقام حاصل ہے اس لئے تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ طلباء کو مقرر اور خطیب بنانے پر بھی کافی محنت کی جاتی ہے۔ قاری جان محمد' مولانا غلام حسین نجفی ساہیوالوی' مولانا ضمیر الحسن رضوی' مولانا شبیر' مفتی جعفر حسین' محسن نقوی' شجر حسین شجر' کلغام حسین اور رائے مہدی حسن اپنے حلقے میں مقبول واعظ تصور کئے جاتے ہیں۔ ریاض حسین موچھ کو بھی بحیثیت ذاکر خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔

○ علامہ نصیر الاجتہادی مرحوم کا تو رنگ ہی اور تھا۔ بندۂ ناچیز نے ان کی چند مجلسیں سننے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ وہ خطابت میں واقعی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ فلسفیانہ انداز بیان' موزونیت الفاظ' خوشگوار ادائیگی اور سحر انگیز زیر و بم میں انہیں چا بکدستی حاصل تھی۔ مترادفات کا بحر بیکراں' استعارات کا جہان تو اور تلمیحات و محاورات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ تقریر مسجع و مقفیٰ ہوتی تھی۔ ان کی وفات حسرت آیات سے گویا باب آگہی بند ہوگیا ہے۔

شیعہ مکتب فکر کے چند دیگر اہم حوالے مولانا کوثر نیازی گنواتے ہیں۔

★ "ہمارے برصغیر میں مرثیہ گوئی کی طرح شیعہ طرز وعظ و خطابت کا سب سے بڑا مرکز بھی لکھنؤ ہی رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بہت سے خطیبوں اور واعظوں نے اس شہر میں نشوونما پائی ہے۔ ان میں مولانا سبط حسن اور حکیم مرتضیٰ حسین بیسویں صدی کے ربع اول میں خطیبانہ عظمت اور شہرت میں بلند مقام پر فائز تھے" مولانا محمد حسین بھی لکھنؤ کے ہی رہنے والے تھے۔ اس دور کے مولانا ناصر حسین اور ان کے والد گرامی جناب حامد حسین موسوی' مولانا نجم الحسن' سید محمد رضی' علامہ باقر علی نجفی' علامہ سید محمد دہلوی' حافظ کفایت حسین' علامہ ابن حسن جارچوی' مظفر علی شمسی' سید اظہر حسین زیدی' علامہ ابن نجفی' علامہ رشید ترابی اور علامہ عقیل ترابی ان مقررین و واعظین میں شمار ہوتے ہیں جن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

★ جیسے کہ ثابت ہوا ہر شعبہ زندگی میں خطابت کا معیار و انداز [illegible] ہے۔ ٹی وی کی دنیا میں طارق عزیز کا بڑا نام [illegible] کے دراز سے [illegible]

یکسانیت کے باوجود چل رہا ہے۔ یہ کامیابی پروگرام کے مذکورہ میزبان کے دم قدم اور طرحدار ادائیگی کے کرشمہ سے ہے۔

○ پارلیمنٹ میں حاجی سیف اللہ اور شیر افگن نیازی کا طرز تخاطب' اعداد و شمار' ادائیگی بیان اور فنی نشیب و فراز یاد رہے گا۔ اول الذکر نے غیر جماعتی الیکشن میں منتخب ہو کر قومی اسمبلی کے اجلاسوں کو گرمائے رکھا تھا اور ثانی البیان نے محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے عہد اقتدار میں بھی ایوان پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھایا۔

○ کراچی اہل زبان کی بستی ہے۔ محمود الحق عثمانی کافی جذباتی مقرر ہیں نیز سندھ میں سردار بھرگری' غلام محمد لغاری اور شیخ عبدالمجید سندھی مانے ہوئے خطیب ہیں۔ شاہ تراب الحق قادری اور شاہ فرید الحق کو بھی مذہبی حلقوں میں دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔ لیکن ایک جوان سال مقرر جو میدان سیاست میں بالکل نو آموز ہے' اس کا نام اس حوالے سے بہت سربلند ہے۔ میرا روئے سخن ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کی جانب ہے کچھ بھی ہو سندھ میں بالعموم اور کراچی و حیدر آباد میں بالخصوص اس کے جوہر خطابت و آتش بیانی نے اچھے یا برے دائمی اثرات بہرحال چھوڑے ہیں۔ الطاف حسین خاصی جذباتی' اشتعال انگیز' تحریک دینے والی اور روانی کے ساتھ تیز تقریر کرتے ہیں۔

○ بساط سیاست کی دو مقررہ خواتین محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نسیم ولی خان کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اول الذکر کے فن خطابت پر مکالمہ کسی اور مقام پر پیش کیا جائے گا تاہم آخر الذکر بیگم صاحبہ مجمع کو قائم رکھنے اور تہذیبی اشاروں کے ساتھ خطاب کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ اسی باب کا ایک دمکتا ہوا نام بشریٰ رحمان ہے۔ موصوفہ عوام میں "چادر' چاندنی اور چار دیواری" کی نسبت سے جانی جاتی ہیں باوجود اس کے کہ اردو کی ناول نگارہ اور شعلہ بیان مقررہ بھی ہیں۔ [illegible] بابا غلام فرید کی کافیاں [illegible] پرورش پاتے اور [illegible] کو اس کی خوشبو میں نہلاتے ہیں۔ بشریٰ رحمان کا شائستہ

انداز' نرم و نازک اور سبک و شیریں جملے' ربط و تاثیر' پاکیزہ احساسات' ارفع خیالات اور صوفیاء کے فکری و نظری نوادرات ان کی متاع زندگی اور حاصل خطاب ہیں۔ اگر محترمہ کے جوہر بیان و گوہر نطق کا اندازہ لگانا ہو تو وہ ایک بار کہیں تقریر سنا چاہیے۔

○ خطابت کی دنیا میں ایک ناقابل فراموش نام چوہدری رفیق احمد باجوہ کا ہے۔ ان کی تحریر و تقریر سے تب ہی صحیح استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبالیات اور دیوان غالب کا گہرا مطالعہ ہو۔ یہ اپنے خطاب میں شاعرانہ استعارات و تشبیہات اور ادبی و سیاسی تلمیحات و اصطلاحات کا بیان از حد انوکھے طریقے سے کرتے ہیں۔ تہذیبی روایات' سماجی شعور' دینی مطالعہ' تاریخ شناسی اور عصری تقاضوں کا فہم و ادراک ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کو خطاب و کتاب میں عجیب و غریب اور دلکش تراکیب سوجھتی ہیں۔ صنعت تضاد گویا ان کے ہاتھوں پلی بڑھی ہے۔ مگر عام طور پر فقرے لمبے اور پیچیدہ استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اردو کو فارسی و ہندی کا غسل دے رکھا ہے۔ بہر حال بلحاظ خطابت یہ مولانا ظفر علی خان کے مکتبہ کی آخری کڑی ہیں۔

○ آغا شورش کاشمیری مرحوم کے بارے میں کیا کہوں؟ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی نو عمری کے زمانے میں پیش گوئی فرمائی تھی۔

"اس نوجوان کی تقریر سنی' زبان ہی نہیں دل سے دعا نکلتی رہی۔ اس کی طبیعت کا رخ نہایت خوشگوار ہے۔ اسی قدرتی ملکہ کی اس نے علم و مطالعہ سے حفاظت کی تو اردو زبان ایک ایسے مقرر سے محروم نہیں رہے گی جس کی فی زمانہ اس کو ضرورت ہے"

شورش صاحب نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس صدی کے ایک عظیم المرتبت مقرر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا:

"معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حلق میں گراریاں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آواز میں گھاٹیں نہیں ورنہ ہم لوگ چوکڑی بھول جاتے۔ بحمد اللہ مطمئن ہوا۔ بڑھاپا جوان ہو گیا ہے میں بوڑھا درخت ہوں گر جانے سے پہلے دوسرا پودا لگ

نہیں سکتا۔ شورش میری مراد ہے"۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) نے شاندار خراج تحسین پیش کیا۔

"پنجاب نے اقبال و ظفر علی خان ہی کو نہیں بلکہ شورش کو بھی پیدا کیا ہے"

بناء بریں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ میں پطرس بخاری مرحوم نہایت اعلیٰ پائے کے مقرر تھے۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں انہوں نے جوہر خطابت کی کئی بار چمک دمک دکھائی۔ پروفیسر اشفاق علی خان' پروفیسر فضل حسین چوہدری' علامہ علاؤالدین صدیقی اور ڈاکٹر انوار سید حلقہ درس میں انقلابی نوعیت کے خطیب مانے جاتے ہیں۔

تاریخ خطابت میں چند نام ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں یہ لوگ اپنے اپنے دور اور حلقوں میں معتبر خیال کئے جاتے تھے اور کئی تو اب بھی عظمت فن کی کوئی نہ کوئی جھلک دکھا سکتے ہیں۔

★ میر محمد یوسف (واعظ کشمیر) علامہ عنایت اللہ گجراتی' پروفیسر رشید احمد صدیقی' علی امام' نواب محسن الملک' عزیز مرزا اور نذیر احمد (آخر الذکر دونوں اسماء رموز خطابت میں درج ہیں) نامی گرامی خطیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔

★ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مجلس احرار کے بعد من حیث الجماعت سب سے زیادہ عوامی مقرر پاکستان پیپلز پارٹی نے پیدا کئے۔ جماعت مذکور کے بانی و چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو خود بھی عالمی قد کے ایک ناقابل فراموش مقرر تھے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ قائد عوام کی بین الاقوامی سطح پر شہرت و سربلندی کا اہم سبب خارجہ امور میں مہارت تامہ کے علاوہ جولانی خطابت ہے۔ بھٹو صاحب کا ذکر چل نکلا ہے تو بات پھیل جائے گی' کیونکہ ان کی زندگی کا یہ گوشہ ایک علیحدہ باب کا متقاضی ہے۔ الغرض جناب بھٹو کی دو تقریریں ہمیشہ یاد رہنے والی ہیں۔ ایک وہ موقع تھا جب انہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق اقوام متحدہ میں اپنے وطن کی ترجمانی کی اور دوسرا موقع جب یحییٰ خان کی طرف سے

سقوط ڈھاکہ کا اعلان ہوا۔ معاہدۂ تاشقند سے قبل بھٹو مرحوم نیو یارک پہنچے حالانکہ وہ ایک لمبا تھکا دینے والا سفر تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ ستائے بغیر اقوام متحدہ کی عمارت کا رخ کیا اور سلامتی کونسل کے اجلاس میں پاکستانی موقف پر ایک ایسی حیرت انگیز تقریر کی، جس کو مبصرین عالم نے اقوام متحدہ کی تاریخ میں سب سے عمدہ اور بہتر تقریر قرار دیا۔ جناب بھٹو اپنی اس تقریر کے دوران بعض مواقع پر اس قدر جذباتی ہوگئے کہ ان کی آنکھوں میں شدت غم کے باعث آنسو بھر آئے اور آواز کپکپا گئی۔ انہوں نے ہندوستان کی جارحیت کا ذکر کیا اور پاکستان کے عزم و ثبات کی داستان اقوام عالم سے کہی اور یہ اعلان فرمایا کہ اگر کشمیر کا جھگڑا اقوام متحدہ نے حل نہ کیا تو پاکستان سلامتی کونسل کو چھوڑ دے گا۔

○ بی بی سی کے نامہ نگار کے مطابق یہ تقریر ایک جادو تھی۔ "ڈان" کراچی نے لکھا "پاکستان کے وزیر خارجہ نے ۲۲۔ ستمبر کو اقوام متحدہ میں جو تقریر کی تھی اسے مختلف حلقوں میں ایک عظیم خطاب سے تعبیر کیا گیا۔ بی بی سی کے نامہ نگار خصوصی متعینہ اقوام متحدہ کا بیان ہے کہ سلامتی کونسل میں موجود بہت سے نمائندوں نے اس تقریر کو اقوام متحدہ کی سب سے عمدہ تقریر قرار دیا ہے"

★ دوسری تقریر اس موقع پر کی گئی جب ڈھاکہ کی پلٹن گراونڈ میں امیر عبداللہ خان نیازی (ٹائیگر) یحیٰ خان کے حکم و اجازت سے جنرل اروڑہ کو اپنے تمغہ جات اور پستول پیش کرکے ذلت ناک شکست کی دستاویزات پر دستخط کر رہا تھا۔ ان کی یہ تقریر اپنے اندر اندوہ و غم، جذبہ انتقام اور عزم و حوصلہ کا سامان لئے ہوئی تھی۔ کہیں کہیں آپ جذباتیت کی رو میں بھی بہہ گئے مگر قوت استدلال، بین الاقوامی صورتحال کا کھرا کھرا تجزیہ اور نتائج و عواقب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

★ آپ کے انداز خطابت کے بارے میں مولانا کوثر نیازی کے مشاہدات و تاثرات کا خلاصہ یہ ہے کہ ماضی قریب کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو جس طرح سیاست میں اپنا ایک جداگانہ اسلوب رکھتے تھے اسی طرح خطابت میں

بھی ان کا ایک مخصوص اور منفرد انداز تھا۔ انگریزی ان کا اصل میدان تھا اور اس میں انہوں نے بڑے بڑوں سے لوہا منوایا تھا۔ وہ جب انگریزی بولتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ مترادفات کا ایک دریا موجزن ہے۔ وہ ہنساتے بھی اور رلاتے بھی۔ چٹکی بھی لیتے اور نشتر بھی لگاتے۔ مشہور امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کے اعزاز میں انہوں نے ایک ضیافت دی اور اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں فی البدیہہ اور برجستہ تقریر کی۔ اس تقریر کی ادبیت' طنز و ظرافت اور فصاحت و بلاغت کا اثر یہ تھا کہ کسنجر جیسے عالمی مدبر کو بھی سر محفل یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ان کی تقریر میں جو روانی اور جولانی ہے میں اس کا جواب لانے سے قاصر ہوں۔ اس دن حاضرین نے یہ بھی محسوس کیا کہ کسنجر اور بھٹو صاحب کی خطابت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

★ انگریزی کے بعد روانی کے لحاظ سے ان کی تقریر میں دوسرا نمبر سندھی کا تھا۔ مزید برآں یہ اتنی سادہ' رواں اور عام فہم ہوتی تھی کہ کوئی بھی اردو بولنے والا اسے باسانی سمجھ سکتا تھا۔

★ سچ تو یہ ہے کہ پیپلز پارٹی دیگر جملہ سرگرمیوں' جذباتی نعرہ بازیوں سیاسی دھینگا مشتیوں اور انقلابی چارہ جوئیوں کے علاوہ اپنے ساتھ میدان سیاست میں مقررین کی ایک وافر تعداد بھی لائی تھی۔ محرر سطور نے خود دیکھا کہ لیڈر تو ایک طرف' عام سیاسی کارکن بھی سٹیج پر کھڑے ہو کر عوام الناس میں زبردست جوش و خروش پیدا کر دیا کرتے تھے۔ تقریر و گفتگو کے آداب و اطوار سیاسی فراست اور طبقاتی شعور پر بحث و مباحثہ اس دور میں پسندیدہ موضوع رہا۔

★ پاکستان پیپلز پارٹی کے عرصہ اقتدار میں جن مقررین کے الفاظ کی حدت سے کئی شعلے جنم لیتے تھے' ان میں معراج محمد خان' مختار رانا' کوثر نیازی' حنیف رامے' غلام مصطفیٰ کھر' معراج خالد' شیخ رشید اور محمد حیات خان شیرپاؤ بلند پایہ خطیب گنے جاتے تھے۔ مولانا کوثر نیازی اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کو انفرادی امتیاز [illegible] بھی حاصل رہی۔ کوثر نیازی صاحب اپنی سیاست کو مذہب کی شکل میں

اوڑھا کر بات کرتے ہیں۔ دین و ادب کے وسیع مطالعہ نے ان کے طرز خطابت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کی تقریروں میں انقلابی سوچ کا اظہار ہوتا اور اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔

○ جناب غلام مصطفیٰ کھر' اپنے سیاسی مرشد بھٹو صاحب کے لہجے میں عوام کو مخاطب کرتے' تجسس برقرار رکھتے' اشتعال دلاتے' آنکھ میں آنکھ ملاتے اور عوام میں گھل مل جاتے ہیں۔ کھر صاحب کو ملکہ خطابت بھٹو مرحوم کی قربت و شاگردی سے حاصل ہوا اور ان کی تقریروں میں آج بھی کسی حد تک ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی خوشبو آتی ہے۔ زور بیان سخت کلامی اور بھڑکیلا انداز۔ ان کے لہجے میں پنجابیت اور الفاظ میں مصطفیٰ قریشی کا شوخیانہ عنصر ملتا ہے۔

○ محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ بھی عالمی سطح کی ایک خوش نام خطیبہ ہیں۔ ان کے اصل جوہر مختلف بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں میں لیکچرز اور پریس کانفرنسوں کے دوران کھلتے ہیں۔ اپنے والد مرحوم کی طرح محترمہ کا اصل میدان بھی انگریزی ہے اور ایسے ہی وہ سندھی میں بھی روانی سے بول سکتی ہیں مگر اردو میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ضیائی مارشل لاء میں لمبی مدت تک جلا وطن رہنے کے بعد جب جونیجو دور حکومت میں پہلی بار مملکت خداداد میں آئیں اور اور مینار پاکستان پر بلا مبالغہ ملک کی تاریخ کے سب سے بڑے جلسہ عام سے خطاب کیا تو بھٹو مرحوم یاد آگئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ ایک جمہوریت پسند' اعلیٰ تعلیم یافتہ بے شمار خوبیوں کی مالک اور حلقہ خطابت میں اسم بامسمیٰ یعنی بے نظیر خاتون ہیں۔ ان کی آواز سپاٹ اور گلا صاف ہے۔ تقریر کیا کرتی شعلے اگلتی ہیں۔ تاہم کئی مرتبہ وہ عوامی اجتماعات میں اتنی پرجوش و بے خود ہو جاتی ہیں کہ ذوق لطیف کو کھٹکتا ہے اور ان کے مقام و مرتبہ سے کمتر نظر آتا ہے۔

★ دراصل اس جماعت سے وابستہ مقامی مزدور تنظیمی ڈھانچہ کے ارکان' ضلعی مجلس عاملہ کے ممبر اور صوبائی سطح کے لیڈروں میں بھی ان گنت آتش نوا مقرر موجود تھے' جو طویل مارشل لاء کی پابندیوں اور زباں بندیوں کے باعث پیشت

فارم سے او جھل ہو گئے۔ چند ایک نے اب کے پر نکالے ہیں۔ ان میں نوابزادہ غضنفر گل، فضل حسین راہی، آزاد کشمیر کے سابق وزیر اعظم ممتاز راٹھور اور بعض وکلاء حضرات شامل ہیں۔

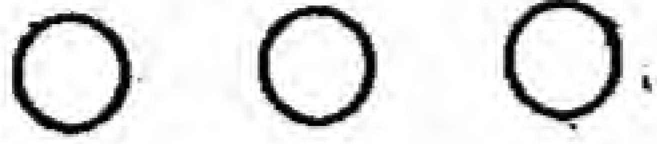
★ اس باب میں انگلستان کے نامور مقرروں اور پارلیمانی خطیبوں کا تذکرہ لابدی ہے چونکہ اردو زبان کے سامعین و خطباء کے لئے برطانوی حوالوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا طوالت میں جانا بے سود ہو گا۔ چارلس جیمز فاکس، ونسٹن چرچل، ایڈمنڈ برک، جوزف چیمبرلین، ہنری جان، پامرسٹن، مورلے، بنجمن ڈسرائیلی، ولیم گلیڈ سٹون اور جان برائٹ پارلیمنٹ کے عظیم مقرر تھے۔ بالڈون، شریڈن، برکس، فاکس، بیون، ایٹلی، انتھونی ایڈن اور اڈمن نامور خطیب گزرے ہیں۔ ہور سٹنگس، ہاٹمیس، لارڈ بیکنسفلڈ، پٹ اور کیننگ بھی اسی میدان کے شہسوار تھے۔ عبدالمجید سالک "سرگزشت" میں لکھتے ہیں کہ مسز اینی بسنٹ دنیا کے چھ سات جلیل القدر خطیبوں میں سے تھیں۔

★ امریکی خطباء میں ابراہام لنکن اور ولیم فرینکلن گراہم عرف بلی گراہم کے بغیر تذکرۂ خطابت مکمل نہیں ہو سکتا۔ جارج واشنگٹن بھی ایک آتش بیان مقرر تھے۔

★ اس صدی کے چند دیگر کامیاب مقررین میں ایڈولف ہٹلر، کرنل قذافی، یاسر عرفات، کمال اتا ترک، سائنور مسولینی، فائیڈل کاسترو اور خالدہ ادیب خانم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہٹلر محض اپنی خطیبانہ صلاحیتوں اور تنظیمی قابلیتوں کے بدولت ہی جرمن کا مطلق العنان حاکم بنا تھا۔

★ ہندوستان میں فن خطابت کو راجہ اشوک نے جدتیں عطا کیں۔ مہاتما بدھ اور مہابیر جی اسی سلسلے کے دو روشن نام ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کاروبار خطابت ڈیرہ اسماعیل خان کے لالہ بھگوان داس نے چمکایا۔ بابو کیشب چندر سین، دادا بھائی، نوروجی، ولبھ بھائی، لوکمانیہ تلک، گوکھلے، سرتیج بہادر

سپرو اور لالہ لاجپت رائے اس بزم کے چراغ ہیں۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ سر نیواس شاستری' سروجنی نائیڈو' سر راما سوامی مدلیار' ستل واڈ اور نہرو تاریخ خطابت کا جزو لازم ٹھہر چکے ہیں۔



سحر خطابت کے چند نادر نمونے

خطبہ نبویؐ

(آپؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا)

"لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہ ہوں گے۔ لوگو! تمہارے خون' تمہارے مال اور تمہاری عورتیں ایک دوسرے پر اسی طرح ہیں جیسا کہ تم آج کے دن کی' اس شہر کی اور اس مہینہ کی حرمت کرتے ہو۔ لوگو! تمہیں عنقریب خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال کرے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کو کاٹنے لگ جاؤ۔ جاہلیت کی ہر ایک بات کو میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں اور جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے ملیا میٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو اپنے خاندان کا ہے یعنی ربیعہ بن الحارث کا خون' جو بنی سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہذیل نے اسے مار ڈالا تھا' چھوڑتا ہوں۔ جاہلیت کے زمانہ کا سود ختم میٹ کر دیا گیا ہے' پہلا سود جو اپنے خاندان کا میں چھوڑتا ہوں' وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے' یہ سب کا سب چھوڑ دیا گیا ہے۔

لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا تعالیٰ کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا تعالیٰ کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے۔ تمہارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر پر غیر مرد کو نہ آنے دیں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو اچھی طرح کھلاؤ' اور اچھی طرح پہناؤ۔

مخلوق' خدا تعالیٰ کا کنبہ ہے اس لیے اس کے نزدیک محبوب ترین وہ شخص ہے جو خدا تعالیٰ کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔

لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے وہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

لوگو! نہ میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت پیدا ہونے والی ہے۔ اچھی طرح سن لو' اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ دیا کرو۔ خانہ خدا کا حج بجالاؤ اور اپنے اولیائے امور کی اطاعت کرو۔ جس کی جزا یہ ہے کہ تم اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو گے۔

لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت پوچھا جائے گا' مجھے ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیا جواب دو گے؟

(سب نے متفق اللفظ ہو کر کہا کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک پہنچا دیے۔ آپ نے رسالت و نبوت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے ہم کو کھرے کھوٹے کی بابت اچھی طرح بتا دیا۔)

یا اللہ! سن لے' تیرے بندے کیا کہہ رہے ہیں؟ یا اللہ! گواہ رہیو کہ یہ لوگ گواہی دے رہے ہیں۔ یا اللہ! شاہد رہیو کہ یہ سب کیسا صاف اقرار کر رہے ہیں۔

دیکھو! جو لوگ موجود ہیں' وہ ان کو جو موجود نہیں ہیں اس کی تبلیغ کرتے رہیں ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں' جن پر تبلیغ کی جائے"

○ نضر بن حارث کا اظہار حقیقت پسندی :

(رسولؐ خدا کو قتل کرنے کی سازش کی ناکامی پر ابو جہل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا)

"اے گروہ قریش! تمہارے اوپر ایک ایسا معاملہ آن پڑا ہے کہ آگے چل کر اس کے خلاف تمہاری کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ محمدؐ تمہارے درمیان ایک نو عمر لڑکا تم میں سب سے بڑھ کر امانت دار' یہاں تک کہ اس کی کنپٹیوں میں سفید بال آگئے وہ تمہارے لیے ایک پیغام لایا ہے تو تم نے اسے جادوگر بتا دیا۔ واللہ! وہ

جادوگر نہیں ہے۔ ہم نے جادوگروں کے جنتر منتر دیکھے ہوئے ہیں۔ تم کہتے ہو وہ کاہن ہے۔ نہیں، خدا کی قسم! وہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کی کہانت دیکھی ہے۔ تم کہتے ہو وہ شاعر ہے، نہیں، خدا کی قسم! وہ شاعر نہیں ہے۔ ہم نے شاعر دیکھے ہیں اور جملہ اصناف شعر کو جانتے ہیں۔ تم کہتے ہو وہ دیوانہ ہے، نہیں، خدا کی قسم! وہ دیوانہ بھی نہیں ہے، ہم نے دیوانگی خوب دیکھی ہے۔ نہ یہ اختلاجی حالت ہے اور نہ دیوانگی کی بے سروپا گفتگو۔

اے گروہ قریش! اپنے موقف پر غور کرو کیونکہ قسم ہے خدا کی، تمہارے سامنے ایک امر عظیم آچکا ہے" (ماخوذ، سیرت ابن ہشام)

○ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

"لوگو! مجھے خلافت کی خواہش نہیں تھی مگر اب جبکہ تم نے مجھے اپنا حاکم بنا لیا ہے تو تمہیں میری اطاعت کرنا پڑے گی درآنحالیکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ مجھ سے یہ توقع تو بے جا ہے کہ میں وہی معیار قائم کرسکوں جو رسول پاکؐ کا منصب تھا۔ ان کے لئے آسمان کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور دم بدم ان پر وحی الٰہی نازل ہوا کرتی تھی۔ میں ایک بہت معمولی سا شخص ہوں تاہم میں انتہائی کوشش کروں گا کہ تم پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کروں۔ جب تک میں اللہ اور رسول کا فرمانبردار رہوں تم پر میری اطاعت لازم ہے لیکن اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے درست کردو وگرنہ تم پر میری اطاعت لازم نہ رہے گی۔ یاد رکھو! تم میں سب سے کمزور انسان میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق ظالم سے نہ لے لوں اور تم میں سب سے طاقتور شخص میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک میں مظلوم کو اس کے پنجے سے نہ چھڑا لوں"

○ فاروق اعظمؓ کا حسن بیان:

خلیفہ ثانی سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے انتخاب پر بعض لوگ آپ کی سخت گیری اور غصیلے مزاج کی وجہ سے [illegible]

اعتراف فرمایا بھی تو کتنے خوبصورت اور اثر آفرین انداز میں۔

"تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری ان سختیوں میں جو تم دیکھا کرتے تھے ظلم اور تعدی روا رکھنے والوں کے لئے کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے اور کمزور مسلمانوں کا ان کے قوی سے حق لینے پر بھی۔ میں اپنی شدت کے بعد اپنا رخسارہ زمین پر رکھ دینے والا ہوں۔ پاک دامن لوگوں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے معصیت سے رک جائیں اور اللہ کے فرمان کو تسلیم کرلیں۔ پس اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور اپنے نفسوں کے خلاف میری اعانت کرو کہ ان نفوس کو میری سزا سے روکو اور میرے اپنے نفس کے خلاف بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے میری اعانت کرو"۔

○ حضرت عثمان غنیؓ کے خطاب کی مختصر جھلک :

"لوگو! تم میرے قتل کے کیوں درپے ہو' میں تمہارا والی اور مسلمان بھائی ہوں۔ خدا کی قسم' جہاں تک میرے بس میں تھا' میں نے اصلاح کی کوشش کی لیکن بہرحال میں انسان ہوں اس لئے اصابت رائے سے لغزشیں بھی ہوئیں۔

یاد رکھو! بخدا اگر آج تم نے مجھے قتل کردیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھو گے اور نہ کبھی ایک ساتھ جہاد کرو گے۔"

○ حضرت علیؓ کا ایک پر درد خطاب :

گزشتہ صفحات میں ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ تقریر جو آپ نے منصب خلافت سنبھالتے ہی لوگوں کے سامنے ارشاد فرمائی تھی' نقل کر آئے ہیں۔ ذیل میں ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس طویل و بلیغ خطبے کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو آپ نے خلیفہ اول کی وفات کے موقع پر لوگوں کو تلقین صبر کے سلسلے میں ارشاد فرمایا۔ حضرت ابوتراب نے صدیق اکبرؓ کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ ... [illegible] ... اور ... سب سے زیادہ مضبوط اور محکم ... [illegible]

تعالیٰ سے آپ سب سے زیادہ ڈرتے تھے اور آپ نے سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے دین کو نفع پہنچایا۔ خدمت نبویؐ میں سب سے زیادہ حاضر رہنے والے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے شفیق اور بابرکت' رفاقت میں سب سے زیادہ بہتر' فضائل میں سب سے آگے' درجہ میں بلند' سیرت' ہیئت' مہربانی اور فضل میں رسولؐ اللہ کے سب سے زیادہ مشابہ اور قدر و منزلت میں سب سے بلند تھے' اللہ تعالیٰ آپ کو اسلام کی جزائے خیر دے۔

آپ رسولؐ اللہ کے نزدیک بمنزلہ ان کی سمع و بصر تھے۔ آپ نے رسولؐ اللہ کو اس وقت سچا جانا' جب سب انہیں جھٹلاتے (نعوذ باللہ) تھے۔ اسی لئے آپ کا نام صدیق ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا

" والذی جاء بالصدق و صدق به"

(وہ جوؐ سچ لائے اور جسؓ نے انؐ کی تصدیق کی)

سچ لانے والے جناب رسولؐ خدا تھے اور اس کی تصدیق کرنے والے جناب صدیق اکبرؓ۔

جس وقت کہ دوسرے لوگوں نے رسول پاکؐ کے ساتھ تنگدلی کا برتاؤ کیا' اس وقت آپ نے آنحضرتؐ کے ساتھ غم خواری کی۔ آپ دو میں سے ایک تھے اور غار میں رفیق! اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ پر سکینت نازل فرمائی۔

آنحضرت کی وفات کے بعد جب لوگ مرتد ہوگئے اور آپ کے ساتھی سستی کرنے لگے اور آپ کو کہنے لگے کہ مرتدین کی تالیف قلوب ہونی چاہیے اور ان سے نرمی کا برتاؤ مناسب ہے تو اس وقت آپ نے دشمنوں کی کثرت اور اپنی کمزوری کا خیال نہیں کیا بلکہ احیائے دین کے لئے دلیرانہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگرچہ آپ کے خلیفہ ہونے کے وقت باغی لوگ غیظ و غضب میں تھے' کفار کو رنج تھا اور حاسدوں کو آپ کے خلیفہ ہو جانے کے باعث کراہت تھی۔ تب بھی آپ بلا نزاع و تفرقہ خلیفہ برحق تھے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد لوگوں کی گھبراہٹ اور ہلچل کے وقت آپ ثابت قدم رہے اور لوگوں کو بھی اپنا ہونا کر ان کو منزل

مقصود تک پہنچا دیا اگرچہ آپ کی آواز پست تھی لیکن آپ کا تفوق سب سے بڑھا ہوا تھا۔ آپ کا کلام باوقار تھا اور گفتگو باصواب! آپ کی خاموشی طویل اور قول بلیغ تھا۔ آپ عمل میں سب سے بزرگ' معاملات میں واقف کار اور شجاع ترین انسان تھے۔

خدا کی قسم! آپ مومنین کے سردار تھے۔ لوگوں کے ارتداد کے وقت آپ آگے بڑھے اور ان کو ارتداد سے بچالیا اور ان کی پشت و پناہ بن گئے۔ امت محمدیہ کے لیے آپ بمنزلہ باپ کے تھے' شفیق اور مہربان۔ اہل دین بمنزلہ اولاد کے ہو۔ئے جن کی فروگذاشتوں کی آپ نے نگہداشت کی اور جو کچھ وہ نہ جانتے تھے ان کو سکھایا۔ ان کی عاجزی کے وقت آپ نے جانبازی اور ثابت قدمی دکھائی' فریادیوں کی فریاد کو پہنچے۔ وہ اپنی رہنمائی کے لیے آپ کے پاس آئے اور آپ نے خدا کی مہربانی سے ان کو کامیاب بنایا۔ آپ کی شجاعت' تہور اور اولوالعزمی کا صدقہ ان کو وہ کچھ ملا جس کا ان کو وہم و گمان تک بھی نہ تھا۔

کافروں کے حق میں آپ برق سوزاں سے کم نہ تھے اور مومنین کے لئے باران رحمت سے زیادہ تھے۔ آپ اس پہاڑ کی مانند تھے جس کو نہ تو زمانے کے شدائد ہلا سکتے تھے اور نہ تند و تیز ہوا کے طوفان جنبش دے سکتے تھے۔ اگرچہ آپ بدن کے ناتواں تھے مگر آپ کا دل سب سے زیادہ قوی اور دلیر تھا نہ تو آپ کی دلیل کو شکست ہوئی نہ آپ نے بزدلی دکھائی اور نہ ہی آپ کا دل راہ راست سے بھٹکا۔

آپ کے مال نے آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ نفع پہنچایا جس کے لیے وہ ہمیشہ آپ کے احسان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اور جس کا اجر عظیم خدائے تعالیٰ آپ کو مرحمت فرمائے گا۔

اگرچہ آپ اپنے آپ کو ہمیشہ ناچیز تصور کرتے رہے لیکن خدا تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے رسولؐ کی نظروں میں نیز تمام لوگوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ گراں قدر ہیں اور ہم سب سے فضائل میں بازی جیت لی۔ آپ کی نسبت

کسی کو طعن کا موقع نہ ملا۔ کیونکہ آپ نے کبھی کسی کی بے جا رعایت نہیں کی۔ اس لیے لوگوں کے دلوں میں آپ کا جلال اور رعب و وقار قائم تھا۔ کمزور آپ کے نزدیک قوی تھا جب تک کہ اس کا حق نہ لے لیتے تھے۔ آپ کا سب سے زیادہ مقرب وہی تھا جو سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کا فرمانبردار اور مطیع ہوتا۔

آپ کی رائے میں دانائی اور اولوالعزمی پائی جاتی تھی اور اس کے طفیل آپ نے باطل کو شکست دے کر فنا اور مشکلات کا راستہ صاف کردیا اور آپ کی توجہ سے اسلام قوی بن گیا اور مسلمان مضبوط ہوگئے۔

اگرچہ آپ کی وفات نے ہماری کمر توڑ دی لیکن آپ کی شان آہ و بکا سے ارفع ہے۔ آپ کا ماتم آسمان عظیم پر ہے لیکن ہم ماسوائے انا للہ و انا الیہ راجعون کے اور کیا کہہ سکتے ہیں اور بجز اس کے رضائے الٰہی پر رضامند رہیں اور کچھ نہیں کرسکتے۔ خدا تعالیٰ کے حکم کو مان کر صبر و شکر کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی قسم! آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپ کی وفات سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہ آئے گی۔ آپ اسلام کے لیے عزت اور مسلمانوں کے لیے ملجا و ماویٰ تھے۔ اس کی جزا میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کو جناب رسالت پناہؐ سے ملائے اور ہمیں آپ کے اجر سے محروم اور آپ کے بعد گمراہ نہ کرے۔ اخیر میں ہم پھر انا للہ و انا الیہ راجعون کہتے ہیں"

"آپ کا یہ خطبہ اس قدر موثر اور ولولہ انگیز تھا کہ حاضرین نے نہایت سکون و خاموشی سے اسے سنا اور اس قدر روئے کہ گویا رحلت نبویؐ کے زخم پھر سے تازہ ہوگئے ہوں)

○ حضرت امام عالی مقام کا احقاق حق:

جگر گوشہ رسولؐ نور چشم بتولؑ سید الشہدا حضرت امام حسینؓ کا وہ خطبہ علیہ جو آپ نے بطور اتمام حجت خاک کربلا پر ارشاد فرمایا تھا ایمانی خطابت کا ایک روشن چراغ ہے۔ آپ نے لشکر اعداء کو خطاب کیا۔

"ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں؟ پھر اپنے گریبانوں میں جھانکو اور سوچو کہ کیا تمہارے لئے میرا خون بہانا اور میرے احترام کو پامال کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبیؐ کا نواسہ نہیں ہوں اور کیا میں ان کے چچا زاد بھائی ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا سید الشہداء حضرت امیر حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہیں تھے؟ اور کیا جعفر طیارؓ میرے چچا نہیں تھے؟ کیا یہ حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے میرے اور میرے بھائی حسنؓ کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانان جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتاً وہ سچ ہی ہے کیونکہ میں نے آج تک کبھی کوئی غلط بات نہیں کی تو پھر کسی اور بات کی ضرورت نہیں۔ لیکن تم اگر میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص موجود ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتا دیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے' ابو سعید خدریؓ سے' سہیل بن سعد ساعدیؓ سے' زید بن ارقمؓ سے اور انس بن مالکؓ سے' وہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے رسالت مآب (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے اس حدیث کو اپنے کانوں سے سنا ہے۔ پھر کیا یہ چیز تمہیں میرا خون بہانے سے روکنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اگر اس حدیث کی صحت میں پھر بھی تمہیں شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمہارے رسولؐ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم آج دنیا میں مشرق سے مغرب تک میرے سوا کوئی نبیؐ کا نواسا موجود نہیں۔ نہ تم میں اور نہ تمہارے سوا اقوام عالم میں اور میں تو تمہارے ہی نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لئے آمادہ ہوئے ہو؟ کیا اپنے کسی مقتول کا قصاص لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کیا تھا؟ یا اپنے کسی مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہو؟ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو جو کسی کو میرے ہاتھوں لگا ہے؟"

○ [illegible] لڑائی میں:

[illegible] تو امام عالی مقام کی خیمو [illegible]

حضرت سیدہ زینبؑ نے دیکھا کہ اہل شہر مختلف جگہوں پر کھڑے انہیں دیکھ رہے ہیں اور بہت سے لوگ خاندان رسالتؐ کے اس حال پر آنسو بھی بہا رہے ہیں تو خطیبہء اہل بیت نے ایک جگہ مجمع سے اضطراراً" خطاب فرمایا اور صورتحال بیان فرمائی۔

"حمد کا سزاوار اللہ ہے اور صلوۃ و سلام میرے پدر بزرگوار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کی عزت کے لئے مخصوص ہے۔ اے اہل کوفہ! اے اہل مکر و دغا! تم روتے ہو؟ خدا کرے تمہارے آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور تمہارے نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون پیدا نہ ہونے پائے۔ کیا تم لوگ سچ مچ آنسو بہا رہے ہو اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ حقیقتاً تمہارے لئے ہے بھی یہی کہ زیادہ روؤ اور کم ہنسو۔ تم نے سمجھنے کی کوشش بھی کی کہ کس طرح تم نے رسول خدا کے جگر کو چاک کیا؟ ان کے محترم اہل حرم کو بے پردہ کیا اور ان کی ہتک حرمت کی؟ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان نے خون برسایا؟ یہ تو کچھ نہیں۔ آخرت کا عذاب بڑا سخت ہو گا اور اس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ اس چند روزہ مہلت پر خوش نہ ہونا۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کو موقع ہاتھ سے جانے کا اندیشہ نہیں، وہ تمہیں ایک وقت تک تمہارے حال پر چھوڑے رکھے گا"

○ سقراط میدان بلاغت میں :

جب دنیا کے مشہور عالم سقراط پر بت پرستی کے خلاف دعا گوئی اور کارکنان اقتدار کے خلاف تقریریں کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا تو ایک پیشی کے دوران انہوں نے خطاب کرتے ہوئے لوگوں سے کہا:

"میں اسی کو کافی سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی تمام عمر میں کوئی گناہ اور فریب نہیں کیا۔ اس وقت تک میری عمر ستر برس سے کچھ زیادہ ہو چکی ہے اور میں لگاتار اخلاقی ترقی کرتا رہا ہوں اور لوگوں کو بھی اخلاقی تعلیم دیتا رہا ہوں۔ تمام لوگ میری

عزت کرتے رہے ہیں اگر میری زندگی منقطع نہ ہو تو بڑھاپا مجھے ستائے گا۔ میرے حواس کام نہیں کریں گے۔ میری فراست میں کمی آجائے گی۔ ایسے حالات میں زندگی کی مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ اب اگر مجھے مجرم گردان کر مار ڈالا جائے گا تو لوگ بچوں کے قتل کو قابل نفرت خیال کریں گے اور میرے خلاف کوئی اتہام نہ لگائیں گے بلکہ ممکن ہے کہ میری موت کی وجہ سے میری عزت پہلے سے بڑھ جائے۔

اے میرے ہم وطنو! سنو' اگر میں خود غرض ہوتا تو کیا میں اپنی ذلت کی طرف سے اتنا بے پروا ہوتا؟ جن لوگوں نے مجھ پر تہمتیں تراشی ہیں ان سے پوچھ کر دیکھو' وہ بھی کہیں گے کہ میں نے کسی شخص سے کسی شکل میں کوئی حق الخدمت قبول نہیں کیا۔ میری مفلسی' بے زری اور ناداری' میری صداقت کا ثبوت اور میری سچائی پر گواہ ہے"

○ حجاج بن یوسف کا رنگ خطابت :

تاریخ بتاتی ہے کہ حجاج بن یوسف سا قادر الکلام' زبان آور' موقع شناس اور فصیح مقرر' مادر گیتی نے کم ہی جنم دیا ہے۔ امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حجاج بن یوسف اور حضرت حسن بصریؒ سے بڑھ کر کوئی ماہر دعوت و خطابت نہیں دیکھا۔ ان کے منہ سے موتی برستے اور پھول جھڑتے تھے۔ حضرت امام حسن بصریؒ فصاحت میں حجاج کے ہم پایہ بلکہ ایک لحاظ سے بلند پایہ تھے۔ یوں تو حجاج کے بہت سے خطاب تاریخ کا حصہ ہیں لیکن اس کی ایک تقریر بہ اختلافات الفاظ' تاریخ و سیر کی ہر اہم کتاب میں موجود ہے۔ جس کا نفس مضمون درج ذیل ہے:

[illegible] اگر میری زندگی [illegible] تم پر حاکم مسلط کیا گیا ہوں۔ گویا [illegible] لیے [illegible] آلودی اور خطرناک تیر پھینکا ہے [illegible] اور منہ زور قزاقوں سے

خلیفہ وقت کے صبر کا پیمانہ لبریز کردیا ہے۔ قبل ازیں تم اپنے حاکموں پر پتھر کی کنکریاں برسا کر ان کا استقبال کرتے تھے اور خلیفۃ المسلمین کے احکامات کا مذاق اڑاتے رہے ہو۔ اب شاید جرات سرتابی کے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی کے دن بھی پورے ہوچکے ہیں۔ مجھے تمہاری داڑھیاں لہو میں تر بتر اور سفید عمامے خاک و خون میں لت پت دکھائی دے رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ سروں کی فصل پک چکی اور کٹائی کا موسم بھی آن پہنچا ہے۔ میں تمہاری ہڈیاں تڑوا کر اور ناکیں کٹوا کر رکھ دوں گا۔ تمہارے نورانی چہرے اور خوب صورت جسم یقیناً جنگلی درندوں کی خوراک بننے والے ہیں۔

وہ دیکھو! ہیبت ناک نوجوان' تیز دھار تلواریں لیے تمہارے ارد گرد کھڑے ہیں جو ایک اشارہ پاتے ہی اپنا کام شروع کردیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے تن کا رشتہ گردن سے کٹ کر رہ جائے گا۔

آج کے بعد یہاں مائیں بیٹوں کو پیٹیں گی۔ بہنیں اپنے بھائیوں کا ماتم کریں گی اور بیویاں شوہروں کو روتی رہیں گی۔ اگر اب بھی تمہارے ہوش ٹھکانے نہ آئے تو یقیناً میری تلوار کی پیاس تمہارے ناپاک اور گندے خون سے بجھ کر رہے گی"

○ طارق بن زیاد کی ایک بے مثل و لاجواب تقریر:

(دریائے رہلا کے کنارے پر کشتیوں کو نذر آتش کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں کا جذبہ بڑھانے کے لئے کہا)

"سرفروشان اسلام! تمہارے سامنے ایک وسیع میدان کارزار ہے اور تمہارے عقب میں ایک متلاطم سمندر ہے۔ مبارزت سے گریز کی کوئی صورت نہیں۔ تمہاری آنکھوں نے ایسے خون رنگ منظر کئی مرتبہ دیکھے ہیں' جب محدود تعدلو کی اسلامی سپاہ کفار پر غالب آئی۔ اگر میں مارا گیا یا شہید ہو جاؤں تو مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ میرے بعد کوئی ایسی بات [illegible]

عساکر اسلام کو رسوا کردے۔ کسی طور پر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہ کرنا۔ اگر تم نے بر بنائے مصلحت اور خدا کی بخشی ہوئی عزت و شرف کے باوجود کوئی ایسی رسوا کن صورت قبول کرلی تو یاد رکھو کہ ذلت کا جوا ہمیشہ تمہاری گردنوں پر بوجھ بنا رہے گا اور ایسے خسارے سے دوچار ہو جاؤ گے جس کی تلافی کبھی نہ ہوسکے گی۔ اس لیے نذرانہ خون پیش کرو کہ جنت تمہاری منتظر ہے"

○ سومنات شکن کا جوش جہاد و خطابت! :

سلطان محمود غزنوی نے جب سومنات پر حملہ کیا تو ہندو لشکر و سپاہ کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی اور انہیں برابر کمک مل رہی تھی۔ ایسے نازک دوراہے پر بت شکن مجاہد نے خطابت کے دریا بہا اور جوہر لٹا دیے۔

"دشمن سامنے ہے اور لق و دق صحرا پیچھے۔ اگر ہم عزم' حوصلے اور اللہ پر توکل رکھتے ہوئے لڑے تو سومنات میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گے اور پھر فازیانہ شان و شوکت کے ساتھ غزنی کی طرف لوٹیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہم نے حوصلہ ہار دیا تو ہم میں سے کوئی بھی غزنی واپس نہ پہنچ سکے گا' بلکہ راجپوتانہ کے صحرا میں ہمارے بے گور و کفن لاشے بکھرے پڑے ہوں گے اور گدھ انہیں نوچ رہے ہوں گے۔ اس لئے پیچھے ہٹنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ بلکہ آگے ہی بڑھتے جاؤ' یہاں تک کہ غازی یا شہید ہو کر دنیا اور عقبیٰ میں سرخروئی حاصل کرو"

○ حضرت قائداعظمؒ کی قوت استدلال :

"میری ذاتی قیام گاہ کو قابل رشک سمجھنے والے بتائیں کہ میرے پاس حملہ' اور اسلحہ کہاں ہے؟ میرا اسلحہ صرف اٹیچی کیس' ایک ٹائپ رائٹر اور ایک [illegible] میں ہار ماننے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے اپنی قوم پر پورا [illegible] ایمان ہے کہ مسلمان تمام اقوام سے بہتر سیاسی دماغ رکھتے ہیں۔ [illegible] میں دو ڈیڑھ ہے [illegible] ہوگا کہ ہمارا فیصلہ چند آدمیوں کا نہیں بلکہ پوری قوم کا

فیصلہ ہے تو میں خوشی سے پیش قدمی کا حکم دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ قوم کی اکثریت ہوش اور ارادے کے ساتھ متفق الرائے ہو۔ اگر یہ بات پیدا ہو گئی تو پھر میں سینے میں گولی کھانے کو تیار ہوں"

آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے کسی اجلاس میں حضرت قائداعظمؒ کی ایک رقت انگیز تقریر کا مندرجہ ذیل حصہ جدوجہد آزادی کی روح اور بابائے قوم کے خلوص عمل کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ خطاب سنتے ہوئے حاضرین زار و قطار رو رہے تھے۔

"مسلمانو! میں نے دنیا کو بہت دیکھا' دولت' شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے' اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی' تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل' میرا اپنا ایمان' میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے واقعی مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح تم مسلمانوں کی تنظیم' اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔"

○ نواب بہادر یار جنگ کا ایک انقلابی خطاب :

(جنوری ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں سرد لہو کو گرماتے ہوئے فرمایا)

"اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ میں نے اپنے جس عزم کا اظہار کیا ہے میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ چلو اپنی بیویوں کے سہاگ چھوں اور اپنے بچوں کی مسکراہٹوں کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو۔ اپنا

تجارت اور ذرائع معاش کی ساری تباہیوں کا تصور کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو۔ مسلمانو! وہ تصفیے جو جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کیے جاتے ہیں' بسا اوقات عارضی اور فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں' جو شجر ملت پر پھول بن کر چمکنا چاہتے ہیں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بنیں کہ زمین میں جذب ہوتی ہے۔ جو مٹی اور پانی سے مل کر رنگین پھول پیدا کرتی ہے۔ جو خود فنا ہوتی ہے مگر پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتی ہے۔

ہمیں ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر اور دل فریب نظارہ بن کر خیرہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں"

☆—— ہند و پاک کے مایہ ناز اور سب سے عظیم مقرر نواب بہادر یار جنگ نے ایک مرتبہ "اقبال" کے موضوع پر تقریر ارشاد فرمائی۔

"اقبال نے ہمارے قومی تشخص کو نمایاں کیا ہے۔ ہم یورپی افکار کے اندھیروں میں ناک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ ہمارا سورج' زوال اقتدار کے بعد گہن میں آگیا تھا۔ ہم نے مغرب کے نقرئی چراغوں کی روشنی ہی کو اصل روشنی سمجھ لیا تھا۔ اقبال نے ایک باطل کے مقابلہ میں دوسرے باطل کی طرفداری کرنے سے انکار کیا اور واشگاف لہجہ میں کہا کہ ہم کسی باطل کا اس لیے ساتھ نہیں دے سکتے کہ وہ جدوجہد کر رہا اور حریف باطل کو شکست دے کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ [illegible] کی جگہ غلطی لے تو اس سے صحیح نہیں ہوتی اور نہ خرابی ہی خوبی ہو سکتی [illegible] اقبال کا ہم پر سب سے بڑا ذاتی احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں وطنیت و [illegible] کے فن فریب سے نجات دلائی ہے اور ملت کے پشتیبان کی حیثیت میں [illegible] سیاسی افکار کے ارتداد و الحاد کی

سرگزشت ہیں۔ اقبال کی فکر، ایشیائی مسلمانوں کے اضطراب کا عکس، اور عالمی مسلمانوں کے التہاب کی پکار ہے۔ وہ یورپ کے ذہنی استیلاء سے کسی حال میں مرعوب نہیں ہوئے اور نہ ہندوستان میں قومیت کی جدوجہد کے سامنے سپر انداز ہوئے۔ انہوں نے ہر حال میں مسلمان کی حیثیت سے سوچا اور اپنی ملت کی سوانح عمری کے خطوط جمع کرتے ہوئے اعلان کیا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اپنے دور کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ انہوں نے مغرب کی علمی قیادت کے چیلنج کو نہ صرف اس کے مفتوح ذہنوں سے خارج کیا بلکہ مسلمانوں کی ملی حدود کا تعین کرکے ان کے نصب العین کو اجاگر کیا۔ ہم آج اس نصب العین ہی کے لیے سرگرم جہد ہیں۔

"مجھے دھمکایا جا رہا ہے کہ میری جاگیر اور خطاب چھین لئے جائیں گے۔ مجھے ڈرایا جا رہا ہے کہ شہربدر کردیا جائے گا۔ جہاں تک جاگیرات کا تعلق ہے میں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ نہ جان میری ہے نہ مال میرا ہے۔ سب اللہ کا ہے۔ رہا خطاب کا تعلق تو جب میں پیدا ہوا تو میرا نام ماں باپ نے محمد بہادر خان رکھا اور آپ کی عنایت سے ۱۸ سال سے نواب بہادر یار جنگ سے پکارا جاتا ہوں اور حضرت محمدؐ کی وابستگی سے محروم کردیا گیا ہوں۔ بڑا اچھا ہو کہ وہ محبوب و متبرک نام پھر سے میرے ساتھ رہے۔ لہٰذا مجھے اس کا ملال کیونکر ہوگا؟ آؤ اور اپنے خطاب اور جاگیریں واپس لے لو"

○ سردار عبدالرب نشتر اور اعجاز نطق!:

سردار عبدالرب نشتر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اور خلافت میں مولانا محمد علی جوہر سے فیض یافتہ تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے [illegible] ایک تقریر میں فرمایا:

"کچھ لوگ پاکستان کے تصور کو شاعر کے خیال [illegible]

کے خیال میں پاکستان فی الواقع شاعر کا خیال ہے تو وہ اس سے پریشان کیوں ہیں؟ اور ان کی ذہنی صعوبت کا سبب کیا ہے؟ وہ اپنے سفر میں لگے رہیں' ہمیں اپنی راہ میں چلنے دیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے خیال حقائق کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس طرح کچھ لوگ اپنے دماغ کی اڑانوں کا سہارا لے کر پاکستان کے موقف کو مسلمانوں کے لئے مہلک قرار دیتے ہیں۔ حیرت کا موجب ہے کہ انہیں بھی مسلمانوں کی حیات کا احساس ہے۔ جو لوگ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کو ان کے حقوق دینے کے لئے تیار نہیں' وہ مسلمانوں کی بقاء کا ذکر کرتے ہیں تو خامہ انگشت بدنداں اور ناطقہ سربگریباں ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے ان سیاسین کے خیال میں 'پاکستان کا مطالبہ کرکے اپنی ہلاکت کا راستہ اختیار کیا ہے تو ان مخلصین کو ان کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ ہم ایک عظیم ماضی کے وارث ہیں اور ہمارے سامنے تاریخی تجربوں کا انبار ہے۔ ہمارا حال ان تجربوں سے ابھر رہا ہے اور ہم نے اپنی شاہراہ ڈھونڈھ لی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ہم نے جو قدم اٹھائے ہیں وہ ہمیں کس مستقبل کی طرف لے جا رہے ہیں؟ ہماری منزل کہاں ہے؟ تو میں اپنے ان سیاسی مشیروں اور قومی نقادوں سے کہوں گا کہ وہ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم جینے اور مرنے کی راہوں سے آشنا ہیں۔ ہم نے پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے علم گاڑے ہیں۔ دھرتی کے سینوں کو چیرا ہے اور سمندروں کے عمق سے موتی نکالے ہیں۔ اب یہ ممکن ہے کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صبح و شام اپنی رفتار بدل لیں اور وقت کچھ دیر کے لئے ٹھہر جائے لیکن جو قافلہ قائداعظم کی راہنمائی میں رواں ہوچکا ہے' وہ اب منزل مقصود پر پہنچ کر ہی دم لے گا اور دنیا جان لے گی کہ "حق کا سورج کیوں کر طلوع ہوتا ہے"

مولانا آزاد عدالت کے کٹہرے میں:

[illegible] مقدمہ ... [illegible]

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں [illegible]

ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی ہے۔

میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پر پیچ فریب نے جتلا کر رکھا تھا۔

پس گورنمنٹ اگر مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس کے لیے سزا دلانا چاہتی ہے تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو۔

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے' بلا تامل مجھے دیدے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے۔ کسی ایک پرزے سے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی' پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا ہے اور تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کریں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے' وقت اس کا جج ہے' وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا"

☆ ——— مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک اور تقریر جو انہوں نے کلکتہ کے اجلاس میں فرمائی۔

"پہلے میری آواز اس میدان میں ایک محدود حلقہ تک پہنچتی تھی۔ گزشتہ چند سالوں سے پورے میدان میں انجمن کی مساعی اور سائنس کی ایک مفید ایجاد کی مدد سے پہنچنے لگی۔ لیکن اس مرتبہ جیسا کہ مجھے یقین دلایا گیا ہے، میری آواز ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچ رہی ہے بلکہ اس مرتبہ مجھے اس بات کا بھی یقین دلایا گیا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹیاں، سمندر کی موجیں اور صحرائے عرب کے بگولے بھی میری آواز روک نہیں رہے ہیں۔ بمبئی کلکتہ سے تیرہ سو میل کے فاصلے پر ہے، پشاور پندرہ سو میل ہے لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے کانوں سے تمہارے دل کی دنیا کتنی دور ہے؟ میری آواز تمہارے کانوں کے پردے سے ٹکرا کر رہ جاتی ہے اور دل کوئی اثر قبول نہیں کرتا وہ دل جس پر تم نے قفل چڑھائے ہیں حالانکہ میرے مخاطب تمہارے کان نہیں بلکہ تمہارے دل ہیں"

○ مولانا آزاد کا منفرد اسلوب بیان :

"کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں، حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں بہا؟ کیا تم نے ان زبانوں کے متعلق کچھ سنا جو چیختی ہیں حالانکہ انہوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے ان جسموں کا تماشا نہیں کیا جو تہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ ان کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟ پھر کیا اس غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں مگر دل نہیں۔ کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے۔ کیا وہ کان بھی نہیں ہیں جو گو سامع ہیں مگر نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں جو گو بصیر ہیں مگر آنکھیں نہیں ہیں کیونکہ نہیں دیکھتیں"

جوہر مرحوم اور حریت نطق:

(لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر انگریز کو للکارتے ہوئے فرمایا)

"میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں، [illegible] کیا فرق ہے میں اسی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ اگر لارڈ ریڈنگ [illegible] مسلک اختیار نہیں کیا تو میں نے بھی اسلام ترک نہیں کیا۔

میں جہاں پہلے تھا وہیں اس وقت ہوں۔ کاش! انگلستان میں آپ کے پاس کوئی ایک آدمی بھی ایسا ہو جو در حقیقت انسان ہو۔ جو دل و دماغ رکھتا ہو "ڈیلی ہیرلڈ" نے لکھا ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کرلیا ہے اور گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں شیطان کے ساتھ مل کر بھی کام کرسکتا ہوں بشرطیکہ خدا کے راستے میں کام کرنا ہو۔

آج میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ جب میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک میں واپس نہ جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک کہ وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دے سکتے تو پھر آزاد ملک میں آپ کو میرے لیے قبر کی جگہ دینا پڑے گی"

☆ ـــ جوہر کی شعلہ گفتاری :

(مولانا محمد علی جوہر کا خطاب شعلہ و شبنم کا آمیختہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک اور نمونہء تقریر ملاحظہ کیجئے۔)

"میں نہ تو ذو معنی باتیں جانتا ہوں اور نہ مصلحت کے غلاف چڑھا کر خطاب کرنا میرا شیوہ ہے۔ بات وہی دل میں اترتی ہے جو صاف ہو! بامعنی ہو' سہل ہو اور سیدھی ہو۔ جس بات کے عقب میں خوف ہو یا جس سخن کے ساتھ تذبذب ہو اور لہجہ لیپا پوتی کا ہو' وہ بات کسی حال میں موثر نہیں ہوتی۔ وہ سونا نہیں ملمع ہے۔ وہ کاغذ کا پھول ہے جو خوشنما ہو سکتا ہے' خوشبودار نہیں۔ میں لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اب اس طرح کہو جس طرح بادل برستے اور بجلی کڑکتی ہے۔ وہی بات [illegible] کو چھو سکتی ہے جس میں تلوار کی کاٹ ہے۔ میں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ برطانیہ کو ہندوستان سے چلے جانا چاہیے۔ اس کی حکومت ہماری قومی غیرت [illegible] کی توہین ہے۔ کوئی غیرت مند شخص اپنی توہین [illegible]

رہا ہے کہ برطانیہ کو اس کی دھرتی سے چلے جانا چاہیے۔ ہم فی الحال ترک موالات اور عدم تشدد کے شریفانہ ہتھیاروں سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جس قوم کی آزادی سلب ہو جائے اس کو حق پہنچتا ہے کہ غاصبوں کے ساتھ ہر طرح لڑے اور جو ہتھیار اٹھانا چاہتی ہے، اٹھائے۔ اس راہ میں ہر ہتھیار جائز ہے۔ ہم نے ایک الاؤ روشن کیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ دم واپسیں تک پہنچ چکی ہے"

○ مولانا ظفر علی خان کا رنگ خطابت :

(مولانا شبلی نعمانی کی وفات حسرت آیات کے موقع پر شذرۂ قلم کا ایک تاریخی نمونہ)

"فرشتہ قضا نے ہم سے اسلام کی عظمت چھین لی مگر ہم بے دل نہ ہوئے اس لیے کہ ہم میں اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے شبلی موجود تھا۔ قرآن کی حکومت چھین لی مگر ہم کو تشویش نہ ہوئی اس لیے کہ اس کا خضر طریقت شبلی موجود تھا۔

فاروق اعظم کی سطوت چھین لی مگر ہم پر بے دلی نہ چھائی اس لیے کہ "الفاروق" کا سکہ بٹھانے والا۔ شبلی موجود تھا۔ مامون عباسی کی برکتیں چھین لیں مگر ہم مضطرب نہ ہوئے اس لیے کہ "المامون" کا مصنف شبلی موجود تھا۔

امام اعظم ابو حنیفہ نعمان کوفی کا علم و فضل چھین لیا مگر ہم ناامید نہ ہوئے کہ "سیرۃ النعمان" کا مصنف شبلی موجود تھا۔

امام غزالی کے برکات و فضائل چھین لیے گئے مگر وقف یاس نہ ہوئے اس لیے کہ "الغزالی" کے زمانے کا تعارف کرانے والا شبلی موجود تھا۔

مولانا روم کا فلسفہ چھین لیا گیا مگر ہم پر اضطرار طاری نہ ہوا اس لیے کہ [illegible] شبلی موجود تھا۔

[illegible] علم الکلام چھین لیا گیا مگر ہماری [illegible] اس لیے کہ الکلام

[illegible]

کا شارح حقیقت شبلی موجود تھا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی جاہ و جلالت چھن گئی مگر بے حوصلہ نہ ہوئے' اس لیے کہ اس کے آثار و وقار بتانے کو شبلی موجود تھا۔

خلافت امویہ کا تمدن چھن گیا مگر ہم نے جزع فزع نہ کیا' اس لیے کہ الاعتقاد کا بدائع نگار شبلی موجود تھا۔

رسولؐ اللہ کی فیض مجسم و رحمت تمام' زندگی پر اعتراضات ہو رہے تھے مگر ہم نے اعتنا نہ کی اس لیے کہ "سیرۃ النبیؐ" لکھنے کے لیے شبلی موجود تھا۔

انیس و دبیر کی ادبی قابلیت ہم سے چھن گئی مگر ہم پر اثر نہ پڑا اس لیے کہ ان کی قابلیت کا موازنہ کرنے والا شبلی ہم میں موجود تھا۔

بایزیدؒ کی روشن ضمیری ہم سے چھن گئی' مگر ہم نے محسوس نہ کیا اس لیے کہ شبلی ہم میں موجود تھا۔

اس وقت نہ صرف شبلی کے ماتم دار اس کے فضائل کے ماتم دار ہیں' بلکہ اسلام کے سوگوار ہیں۔ اسلامی تمدن کے سوگوار ہیں' اس لیے کہ شبلی کی وجہ سے یہ سب زندہ تھے اور خدا کرے کہ اب کوئی دوسرا شبلی اٹھے کہ ان سب کی حیات جاوید کو صدمہ نہ پہنچے"

○ سید حبیب شاہ کی خطیبانہ جھلک:

(۱۹۲۹ء میں غازی علم الدین شہید کی نعش کی حصولی کے سلسلے میں لاہور کے مسلمانوں سے فرمایا)

"کل عصر کے وقت لاہور میں میانوالی سے کئی تار موصول ہوئے جن سے معلوم ہوا ہے کہ آج صبح صادق کے وقت غازی علم الدین کو شہید کر دیا جائے گا یہ خبر بجلی کے ذریعے سے آئی اور بجلی ہی کی تیزی سے تمام شہر میں پھیل گئی۔ صد ہا مسلمان رات کے دس بجے تک دفتر "سیاست" میں آئے' اس لیے کہ اس خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی درج تھی کہ حکومت پنجاب شہید کی لاش کو لاہور لانے کی

اجازت نہیں دی۔ میاں علم الدین نے جو کام کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ آپ نے صفحہ دہر پر انمٹ الفاظ میں اپنے خون سے یہ حقیقت منقش کردی ہے۔

مسلمان لاکھ برے ہوں، مگر نام محمدؐ پر
وہ تیار ہیں ہر حالت میں اپنا سر کٹانے کو

میاں صاحب شہید ہیں اور ہم ان کا لاشہ حکومت سے طلب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر بت پرست، ہر خدا پرست، ہر عیسائی اور موسائی، غرض ہر مذہب کے لوگ مرنے والے کی وصیت کو پورا کرنا فرض سمجھتے ہیں اور شہید مرحوم نے وصیت کی ہے کہ ان کو لاہور دفن کیا جائے۔ اس فرض کو پورا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ شہید مرحوم اب اپنے والد یا رشتہ داروں کا مال نہیں رہے۔ وہ خدا اور اس کے رسول پاکؐ کا مال ہیں۔ وہ ہم مسلمانوں کا ورثہ ہیں۔ ان کی عزت ہماری عزت ہے اور خدا و رسولؐ کی عزت ہے۔

نیز مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے مرنے والے بھی ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں ان کا فیض مرنے سے ختم نہیں ہوتا اور شہید تو زندۂ جاوید ہیں۔ ہر شہید گناہ سے پاک ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نماز جنازہ مرحوم اور زندوں دونوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ مرحوم نیک ہو تو نماز ادا کرنے والے بخشے جاتے ہیں اور اگر نمازیوں میں ایک بھی مرد مقدس موجود ہو تو مرنے والے اور نمازیوں کے سب گناہ بخش دیے جاتے ہیں"

۵۔ عنایت اللہ خان المشرقی:

(آپ نے لاہور کی ایک مسجد میں نہایت دردمندی کے ساتھ خطاب کیا:)

میرے مسلم بھائیو اور خاکسار سپاہیو! ایک سال چار ماہ کی مدت کے بعد پھر [illegible] ہوں کہ ایک غلامی میں ماری ہوئی، خوف سے دبکی ہوئی، بھوک اور [illegible] ہوئی، بیماری اور شکست سے چور اور بستر مرگ پر پہنچی ہوئی قوم کو [illegible] اور دوا کا نیا انداز دوں۔ مجھے تسلی ہو رہی ہے کہ مسلمان

بلکہ غیر مسلمان میری دی ہوئی کڑوی دوائیاں منہ بنا بنا کر جھنجلا جھنجلا کر بلکہ گالیاں دے دے کر بالآخر پی رہے ہیں۔ بیماری میں اپنی بات رکھنے اور حکیم کو برا کہنے کی آن دکھلانے کے باوجود سمجھ رہے ہیں کہ دوائیاں کڑوی اور بیماریاں لمبی ہی ہوا کرتی ہیں"

○ بلبل ہزار داستان کی للکار :

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ خطابت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ذات درخشندہ ستارے کی مانند ہے۔ ان کو مرقع خطابت قرار دیتے ہوئے شورش کاشمیری نے لکھا ہے۔

"رعد کی برق' بادل کی گرج' ہوا کا فراٹا' فضا کا سناٹا' صبح کا اجلا' چاندی کا جھلا' ریشم کی جھلملاہٹ' ہوا کی سرسراہٹ' گلاب کی مہک' سبزے کی لہک' آبشار کا بہاؤ' شاخوں کا جھکاؤ' طوفان کی کڑک' سمندروں کا خروش' پہاڑوں کی سنجیدگی' صبا کی چال' اوس کا نم' چنبیلی کا پیرہن' تلوار کا لہجہ' بانسری کی دھن' عشق کا بانکپن' حسن کا اغماض اور کہکشاں کی مسجع و مقفی عبارتیں انسانی آواز میں ڈھلتے ہی خطابت کی جو صورت اختیار کرتی ہیں اس کا جیتا جاگتا مرقع شاہ جی کی ذات ہے"

بہر صورت ان کی ایک تقریر تاریخی نوعیت کی حامل ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا بلکہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ تقریر انہوں نے ۴ جولائی ۱۹۲۷ء کو رسوائے زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" کی اشاعت کے خلاف درگاہ شاہ محمد غوث بیرون دہلی دروازہ لاہور کے سامنے احاطہ شیخ عبدالرحیم میں ہزاروں لوگوں کے سامنے ارشاد فرمائی۔ کلمات حریت کے غیظ و غضب میں دفعہ ۱۴۴ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھر گئیں۔ (وضاحت کے لئے ملاحظہ کریں راقم سطور کی کتاب' غازی علم الدین شہید)

☆ — شاہ جی نے برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے سوال پر ایک اور جلسہ سے خطاب میں فرمایا۔

"وہ زمانہ آگیا ہے جس کا انتظار تھا۔ نگاہ اٹھاؤ اور دیکھو کہ جنگ عظیم گھنگھور گھٹاؤں کی طرح سروں پر منڈلا رہی ہے۔ نہ جانے کب جل تھل ہو۔ غیب کا علم تو اللہ کو ہے' وہی علام الغیوب ہے لیکن مشیت ایزدی نے ظالموں کا یوم حساب قریب کردیا ہے۔ جنگ ہوگی' ضرور ہوگی۔ یورپ کے میدانوں میں ہوگی اور اپنی ہولناک بربادیوں کے ساتھ پھیل جائے گی۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہو' اس کے بارے میں حکم نہیں لگایا جاسکتا اور نہ کوئی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ علیم و خبیر ذات الٰہی ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنگ کیا لائے گی اور کیا چھوڑ جائے گی۔ جن لوگوں نے پہلی جنگ عظیم میں فتح حاصل کی اور اس کے بعد مغرور ہوگئے پھر نسل انسانی کو تقسیم کیا اور ملکوں کی بندر بانٹ کی۔ انہیں معلوم ہوچکا ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور انہیں کہاں پہنچنا ہے؟ انہیں جنگ کے تھپیڑوں سے محسوس کرنا چاہیے کہ اس زمانہ میں کوئی بھی قوم نہ تو غلام رکھی جاسکتی ہے اور نہ غلام رہ سکتی ہے۔ ہندوستان آزاد ہوگا۔ آئندہ جنگ کے دوران آزاد ہوگا۔ جنگ اپنے انجام کو پہنچے گی تو آزاد ہوگا۔ اب اس کی آزادی موقوف و معطل نہیں کی جاسکتی۔ قدرت اپنے فیصلے انسانوں کی خاطر نہیں بدلا کرتی۔ ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ عرش کی رفعتوں پر ہوچکا ہے۔ جو لوگ اب بھی اپنی پیشانیوں پر وفاداری کا [illegible] لگا کر اپنی غلامی کی عمر کو طول دینا چاہتے ہیں' انہیں اس تعبد کا حق پہنچتا ہے۔ [illegible] ضمیر آزادی کی لذت سے آشنا ہی نہیں۔ ان کے لیے ممکن ہے یہ سب تمرد [illegible] ہو اور وہ اسے توشہ آخرت خیال کرتے ہوں لیکن اب جو سفینہ ڈوبنے [illegible] ڈوب کے رہے گا۔ اسے بچایا نہیں جاسکتا۔

[illegible] اپنی عمر اس جدوجہد میں بتادی ہے۔ میں اب عمر کی اس منزل میں [illegible] ہوں۔ میرے بالوں میں سفیدی آگئی ہے لیکن بعض دلوں کی [illegible] نہیں ڈھلی۔ ان کے نزدیک ہم باغی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ

بغاوت کیا ہوتی ہے؟ کیا اپنی آزادی کا مطالبہ کرنا بغاوت ہے؟ اور جب یہ الفاظ وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں اپنے ہندوستانی ہونے سے انکار نہیں اور مسلمان کہلاتے ہیں تو میرا دل کھول اٹھتا ہے۔ مرا دماغ دہکنے لگتا ہے۔ مری زبان انگارے اگلنا چاہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں یہی لوگ ہیں جو اپنے ہی ایمان کی جانکنی کا تماشا دیکھتے ہیں۔ کس زبان سے کہوں کہ ان مادر زاد نلواروں نے برطانیہ کے عشق میں اپنی جانیں دے کر یا پھر حریت خواہوں کے سر اتار کر قومی آبرو کو مجروح کیا اور حریت ضمیر کے چہرے پر کالک ملی ہے۔ اب وہی کالک ان کے چہروں کو سیاہ کر چکی ہے اور آزادی کا چہرہ صبح کے سورج کی طرح دمک رہا ہے۔ انہیں سلطنت کے فرزند ہونے پر ناز ہے ہمت ہے تو تاریخ کی رفتار روک لیں۔ تاریخ اس تیزی سے پلٹا کھا رہی ہے کہ انگریز کو ہندوستان خالی کرنا ہوگا اور ہم آزاد ہو کر رہیں گے۔ موذن صبح کی اذان دے چکا ہے اور اب صبح کو ملتوی نہیں کیا جاسکتا ہے"

☆ ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس میں اور بعد ازاں اسی برس اجمیر میں "آل انڈیا سنی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ جس میں برصغیر کے تقریباً" دو ہزار علماء و مشائخ اور لاکھوں اہلسنّت احباب نے شرکت فرمائی تھی۔ اس تاریخی موقع پر کی جانے والی تقاریر کے دو اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

○ مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی :

"میرے دینی رہنماؤ اور بھائیو! میں نے عرضداشت میں ابھی ابھی پاکستان کا لفظ استعمال کیا ہے اور پہلے بھی کئی جگہ پاکستان کا لفظ آچکا ہے۔ ملک میں اس لفظ کا استعمال روز مرہ بن گیا ہے۔ در و دیوار پر "پاکستان زندہ باد!" تجاویز کی زبان میں "پاکستان ہمارا حق ہے" نعروں کی گونج میں "لے کے رہیں گے پاکستان" مسجدوں میں، خانقاہوں میں، بازاروں میں، ویرانوں میں لفظ "پاکستان" لہرا رہا ہے۔ اس لفظ کو پنجاب کا یونینسٹ لیڈر بھی استعمال کرتا ہے اور ملک بھر میں ہر کانگریسی بھی بولتا ہے اور ہم سنیوں کا بھی یہی محاورہ ہے۔

یونینسٹ کا پاکستان وہ ہوگا جس کی مشینری سردار جوگندر سنگھ کے ہاتھ میں ہوگی ——! جن سنیوں نے لیگ کے اس پیغام کو قبول کیا ہے اور جس یقین پر اس مسئلہ میں لیگ کی تائید کرتے پھرتے ہیں' وہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے اس حصہ پر اسلام کی 'قرآن کی آزاد حکومت ہو' جس میں غیر مسلم ذمیوں کے جان و مال' عزت و آبرو کو حسب حکم شرع امان دی جائے۔ ان کو' ان کے معاملات کو' ان کے دین پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ جانیں ان کا کام جانے ——اور بجائے جنگ و جدل کے صلح و امن کا اعلان کردیا جائے۔

اگر سنیوں کی اس سچی تعریف کے سوا لیگ نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو اسے کوئی سنی قبول نہیں کرے گا —— وہ صرف اتنا سمجھ کر کہ قرآنی حکومت اور اسلامی اقتدار' لیگ کا مقصد ہے اس کے ساتھ ہوگئے ہیں اور ان کو چھوڑ کر لیگ باقی ہی نہیں رہتی۔ اس کے دستور اساسی کا کیا مطلب ہے؟ وہی تجاویز متفقہ بھی ہیں۔ لیگ ان کے لیے کوئی نیا دین نہیں جس کو سوچ سمجھ کر' ٹھونک بجا کر قبول کیا جائے بلکہ لیگ ان کے جذبات کی محض ترجمان ہے۔ جس کو ہر معترض سے زیادہ خود سمجھ رہے ہیں —— آل انڈیا سنی کانفرنس کا "پاکستان" ایک ایسی خود مختار آزاد حکومت ہوگی جس میں شریعت اسلامیہ کے مطابق فقہی اصول پر کسی قوم کی نہیں بلکہ اسلام کی حکومت ہو۔ جس کو مختصراً یوں کہئے کہ خلافت راشدہ کا نمونہ ہو۔ ہماری آرزو ہے کہ اس وقت ساری زمین پاکستان ہو جائے۔

مسلم لیگ کا پروگرام عارضی ہے جو صرف پاکستان پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور آل انڈیا سنی کانفرنس کا پروگرام دوامی ہے۔ سنی کیسا پاکستان بنائیں گے۔ اس میں بحث کی گنجائش نہیں۔ عہد صدیقی کو دیکھ لیا جائے اور دور فاروقی کی پیروی [illegible]۔ عثمانی زمانے کو تصور کے سامنے لایا جائے۔ خلافت علویہ کا دیدار کرلیا [illegible] کا پاکستان بنائیں گے۔

[illegible] ہندوستان پر حکومت کرنے سے جھک گیا ہے اور [illegible] الگ رہنا چاہتا ہے اور وہ کوئی سی حکومت ہندوستان کو دے

ڈالنا ہی چاہتا ہے اور مانا کہ یہ دیکھ کر ہندوستان کی اکثریت کے منہ میں پانی بھر آیا ہے اور وہ بلا شرکت غیرے اس حق کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ہم کو لیگ سے اس قدر امید رکھنا چاہیے کہ اس کا جو قدم سنیوں کے سمجھے ہوئے پاکستان کے حق میں ہوگا اور اس کے جس پیغام میں اسلام اور مبلغین کا نفع ہوگا۔ آل انڈیا سنی کانفرنس کی تائید اس کو بے دریغ حاصل ہوگی۔ نو کروڑ سنیوں میں روٹھے ہوؤں کو منایا جائے اور ان کو مرنے سے پہلے ذمہ داری دی جائے کہ مرنے سے پہلے فی کس دس نہیں تو ایک غیر مسلم کو مسلمان کرنا ہے۔ ان کو تعلیم دین سے آراستہ کر کے ان کے علم کو، ان کے اخلاق کو پاک کرنا ہے۔

زمانہ میں روشنی کے نام پر الحاد کی تاریک آندھیاں چلیں۔ دین فروشوں نے دین کے نام کو پیٹ کا دھندہ بنایا۔ کھلے بازار میں ملت فروشی کی جا رہی ہے۔ ضمیر فروشی اور قوم فروشی کی بلیک مارکیٹ قانون کی زد سے بھی آزاد ہے۔ نام دارالعلوم رکھا اور کام مندر کا کیا۔ نام پوچھو تو "احرار" بتائیں اور کام دیکھو تو "غلاموں کی غلامی" پر اتر آئیں "یا رسول اللہ" سن کر گھبرائیں اور "بندے ماترم کا گانا گائیں" نعرۂ تکبیر سے الجھیں اور اپنے باپو کی جے منائیں ——— اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارا مقصد بھی نہایت بلند پایہ ہے۔ آج ہمارا اجمیر میں وہی مقصد ہے جو کہ چشت کا راجا صدیوں پہلے لاچکا ہے۔ جس نے جیلان والے غوث کو بغداد پہنچایا ہے۔ جس کے لیے اللہ کا حبیب مکہ سے مدینہ اور پھر مدینہ سے فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ مکہ پہنچا۔ جس کا مقصد مختصر اور صاف ہے۔ خدا کے دین اور اس کے دیندار کی آزادی ہے۔ ذرہ ذرہ کو مسلم بنانا اور اسلام کے پرچم کو آزاد رکھنا ہے۔ انسان کو پاک رکھنا اور انسانی آبادی کو پاکستان بنانا ہے۔

اے سنی بھائیو! اے مصطفیٰ کے لشکریو! اٹھو خوابِ [illegible] اب تم کیوں سوچو کہ سوچنے والے مہمان آ گئے اور تم کہاں [illegible] خود بخود آ گئی۔ اب جنت کی [illegible] اب [illegible] اور [illegible] چلے

چلو' ایک منٹ بھی نہ رکو' پاکستان بنا لو تو جا کر دم لو کہ یہ کام اے سینو! سن لو کہ صرف تمہارا ہے"

○ مولانا ظہور الحسن درس :

"آپ سنیں اور غور سے سنیں' دل کے کانوں سے سنیں' ہم وہ پاکستان چاہتے ہیں جہاں قرآن حکیم کے احکام نافذ ہوں۔ ہم وہ پاکستان چاہتے ہیں جہاں محمد رسول اللہ کی پیروی واجب العمل ہو۔ اور شریعت مقدسہ کے مطابق فیصلے ہوں۔ ہم وہ پاکستان چاہتے ہیں جہاں پاک لوگ بسیں۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' ارکان اسلام کی توہین نہ ہو۔ ہم وہ پاکستان چاہتے ہیں جہاں مقابر و مساجد کی حرمت کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہم وہ پاکستان چاہتے ہیں جہاں لا مذہبیت اور دہریت کی جڑیں اکھاڑ پھینک دی جائیں۔ ایسے پاکستان کو حاصل کرنے کے لئے اگر جان تک بھی کام آئے گی تو ہم دریغ نہیں کریں گے اور انشاء اللہ العزیز لے کے رہیں گے"

○ — ڈاکٹر سیف الدین کچلو معرکہ آراء اور جادو بیان خطیب تھے۔ انہوں نے جلیانوالہ باغ' امرتسر کے حادثہ کے سبب خاص شہرت پائی۔ ان کی تقاریر کے چند زاویے درج ذیل ہیں۔

★ "مسلمان اور غلامی ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ہم نے کبھی دو ضدوں کو اس طرح جمع ہوتے نہیں دیکھا جس طرح ہندوستان کا مسلمان غیر ملکی غلامی سے چپک کے رہ گیا ہے"

★ "بزدل اور بہادر کی یہی پہچان ہے کہ بزدل زندگی ہی میں مر جاتا ہے اور بہادر مر کے بھی زندہ رہتا ہے جن لوگوں نے حریت ضمیر کے لئے جانیں دی ہیں وہ جانتے ہیں کہ بہادر کی موت زندگی کی ابتدا ہے"۔

پہلے تاریخ [illegible] بادشاہوں کے تذکرے کا نام تھا۔ اب تاریخ انسانوں کی [illegible] اور قوموں کی جدوجہد کا نام ہے۔ اب اس کے دامن میں وہ سپاہ [illegible] کے بیان کی جگہ [illegible] قلم کی

نوک سے ہٹ کر نیزہ کی نوک پر آچکی ہے۔ وہ دور بیت گیا جب محل کے نغمے محفوظ کیے جاتے تھے۔ اب جھونپڑوں کے نوحے تاریخ کا حصہ ہیں"

☆ "میں نوجوانوں سے کہتا ہوں' آگے بڑھو یا وقت کی رفتار روک لو۔ وہ جوانی میرے نزدیک عناصر اربعہ کا کفن ہے جس میں مقصد کی تب و تاب اور آزادی کا ولولہ و عشق نہیں۔ جس قوم سے راست باز زبانیں اٹھ جائیں' وہ قوم گور غریباں ہو کر رہ جاتی اور اس کا شعلہء احساس چتا کی راکھ ہو جاتا ہے"

☆ خالدہ ادیب خانم نے ایک دفعہ نوجوانان ترکی سے خطاب کرتے ہوئے مادر وطن کی طرف اشارہ کر کے یوں اظہار خیال کیا۔

"کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے شہید ترکوں کا لہو ہے' جنہوں نے اپنے خون کے قیمتی قطرے تیرے سینہ پر گرائے۔ کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں ہیں جنہوں نے اپنی جان' اپنی شان تیرے قدموں پر فدا کر دی۔ تیرے سینے پر جان دینے کے لئے اور اپنی ہڈیاں تجھے سپرد کرنے کے لئے صدہا سال تک غربت زدہ' ابلہ پیا' خستہ حال اور بے یار و مددگار مجاہد تیرے کام آئے ہیں"

☆ مسولینی نے ۲۶۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو اٹلی کی پارلیمنٹ میں پہلی مرتبہ خطاب کرتے ہوئے کہا تھا (یہ اس افتتاحی تقریر کا ایک مختصر جزو ہے)

"میں چاہتا تو اسمبلی ہال کو لاشوں سے پاٹ دیتا۔ میں چاہتا تو اسمبلی کے دروازوں کو مقفل کر کے ایک خالصتاً" فاشسٹ حکومت قائم کرتا۔ میں یہ دونوں کام ایک ساتھ بھی کر سکتا تھا لیکن کم از کم وقتی طور پر میں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ میری اعتدال پسندی کا مظاہرہ ہے"

○ چرچل نے قوم سے کہا:

(ایک جنگ میں مکمل پسپائی کے بعد انگریز قوم کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اپنے [illegible] اظہار کیا)

"ہم [illegible] ہارے ہیں گے نہ [illegible]

ہم فرانس میں لڑیں گے۔ ہم سمندروں اور بحیروں میں لڑیں گے۔ ہم اپنے بڑھتے ہوئے اعتماد اور بڑھتی ہوئی طاقت سے فضاؤں میں لڑیں گے۔ ہم اپنے جزیرے کا تحفظ کریں گے' چاہے اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ ہم ریتلے ساحلوں پر لڑیں گے۔ ہم ہوائی اڈوں پر لڑیں گے اور ہم کھیتوں میں لڑیں گے اور گلیوں میں لڑیں گے۔ ہم پہاڑوں پر لڑیں گے' ہم شکست قبول نہیں کریں گے"۔

○ ابراہام لنکن کا خطاب :

(امریکہ میں خانہ جنگی کے آثار ظاہر ہونے پر اپنے عوام کو توجہ دلائی)

"میرے غیر مطمئن ہم وطنو! اس وقت خانہ جنگی کی باگ میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ حکومت تم پر حملہ نہیں کرے گی۔ اگر تم حملہ آور بنو گے' تو پھر انتشار پھیلنے کا خدشہ ہے۔ تم نے حکومت کو تباہ کرنے کی کوئی قسم نہیں کھا رکھی لیکن مجھے ایک بڑی مقدس قسم کا پاس ہے۔ تم اسے توڑنے کی کوشش کرو گے مگر میں اس کی حفاظت کروں گا "امن یا جنگ؟" کا فیصلہ میرے بجائے تمہیں کرنا ہے۔ ہم آپس میں دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں۔ ہم کیوں ایک دوسرے کے دشمن بنیں۔ ہمیں اپنے جذبات کو مشتعل ہونے سے روکنا چاہیے۔ ورنہ یہ ہمارا رشتہ رفاقت توڑ دیں گے۔ یادداشتوں کے وہ پر اسرار تار جو اس ملک کے ہر میدان جنگ سے' ہر محب وطن اور ہر دھڑکتے ہوئے دل سے منسلک ہیں' جب انہیں دوبارہ چھیڑا جائے گا تو ان میں سے اتحاد کے نغمے پھوٹیں گے"

○ آنجہانی لنکن کی ایک افتتاحی تقریر :

"آؤ ہم خدا کے حضور صدق دل سے دعا مانگیں کہ جنگ کے یہ اڑتے بادل جلدی سے گزر جائیں لیکن اگر خدا کا یہی منشا ہے کہ گزشتہ تین ہزار [illegible] زمین پر جو محنت کی ہے وہ ساری اکارت جائے تو پھر بھی [illegible] خدا کے فیصلے اٹل اور راستی پر مبنی ہوتے ہیں۔

ہر قسم کے جذبہ حقارت سے بلند ہو کر نیکی کا خیال دل میں لے آؤ۔ ہم خدا کی مدد سے وہ کام ختم کریں گے جس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ آؤ ہم قوموں کے زخم مندمل کریں۔ جو شخص میدان جنگ میں کام آئے گا اس کی بیوہ اور یتیم بچوں کی نگہداشت کریں۔ وہ سب کچھ کریں جس کے باعث دنیا کی تمام قوموں میں امن کا ایک پائیدار رشتہ قائم ہو جائے"

○ وینڈل فلپ کا ایک معرکتہ الاراء خطاب:۔

(توسین لا اووچر کے بارے میں)

"میں اسے نپولین کہوں گا لیکن نپولین وعدے توڑ کر اور خون کے دریا سے گزر کر سلطنت پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس شخص نے کبھی ایک غلط لفظ بھی زبان سے نہ نکالا تھا۔ اس شخص کی زندگی کا دستور العمل "عدم مکافات" تھا۔ اس نے آخری بار اپنے بیٹے سے فرانس میں یہ الفاظ کہے تھے۔

"بیٹا! ایک دن تمہیں واپس سانتوڈومنگو جانا ہے۔ بھول جاؤ کہ فرانس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا"

میں اسے کرام ویل کے نام سے موسوم کروں گا مگر وہ تو فقط ایک سپاہی تھا اور اس کا عہد حکومت اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہوگیا تھا۔

میں اسے واشنگٹن کہوں گا مگر وہ غلام رکھنے کے حق میں تھا لیکن یہ شخص اپنے چھوٹے سے گاؤں میں غلاموں کی تجارت کی اجازت دینے کے بجائے اپنے بڑے عہدے سے برطرف ہونے کو تیار تھا۔

آج کی رات آپ لوگ مجھے دیوانہ کہیں گے کیونکہ آپ نے تاریخ کا مطالعہ تنگ نظری سے کیا ہے لیکن آج سے پچاس سال بعد جب سچائی کی شنوائی ہوگی تو تاریخ کی دیوی یونان میں فوسیون کا، اٹلی میں برولس کا، انگلستان میں ہمپ ڈن کا اور فرانس میں لافاییت کا نام جلی حروف میں لکھے گی۔ واشنگٹن ہماری ابتدائی تہذیب کا شگفتہ پھول اور جان براؤن دوپہر [illegible]

روشنائی میں تر کر کے ان سب کے اوپر سپاہی' سیاستدان اور شہید توسین لااودچر کے نام لکھے گی"

○ میکالے کی ایک تاریخی تقریر :

"ہم اس (چارلس اول) پر الزام دھرتے ہیں کہ اس نے تاجپوشی کا حلف توڑ دیا مگر اپنی شادی کی قسم پر قائم رہا۔ ہم اس بات پر اس کی مذمت کرتے ہیں کہ اس نے عوام کو تو بے رحم پادریوں کے ظلم و ستم کا شکار ہونے کے لئے چھوڑ دیا اور خود اپنے بچے کو گھٹنوں پر بٹھا کر چوما کرتا تھا۔ ہم اسے ملامت کرتے ہیں کیونکہ اس نے حق اختیار کی شقوں کی خلاف ورزی کی تھی' جب اس نے سوچ سمجھ کر وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا پابند رہے گا۔ پابند رہنے کا وعدہ کرنے کے باوجود ہمیں بتایا گیا ہے کہ صبح چھ بجے دعا سننے کا عادی تھا۔ ان باتوں اور ان باتوں کے علاوہ اپنے شاندار و لندیزی لباس ہی کے باعث وہ موجودہ دور میں ہردلعزیز ہوا ہے"

○ مختار رانا کی شعلہ گوئی :

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے دوران مختار رانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیل میں تھے۔ الیکشن میں پی پی پی کی کامیابی کا اعلان ہوا تو قیدیوں نے جوش جذبات میں ایک جلسے کا اعلان کردیا۔ وہ کیفیت دیدنی تھی اور قید خانہ کے حکام کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پروگرام ہونے دیں۔ یوں شام کے کوئی ۴ بجے گراؤنڈ میں جیل کی تاریخ کا غالباً" پہلا سیاسی جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر مختار رانا نے کہا:

محنت کشوں کے بیٹو! انہوں نے تمہیں پابند سلاسل کر رکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں تم معاشرے کا سکون تباہ کرنے کے درپے ہو۔ تمہیں مجرم اور گنہگار کہہ [illegible] عدالت کا حوالہ ہے لیکن آج تک کسی نے یہ نہ سوچا کہ تم مجرم کیسے [illegible] بنا دیئے گئے۔ تمہیں زندگی گزارنے کے مواقع نہ دیئے [illegible] تمہیں مجرم بنانے

والا اور آج کے دور کا سب سے بڑا قاتل کون ہے؟ اے مجبور لوگو! یہ قاتل تمہارے ارد گرد پھیلا ہوا استحصالی معاشرہ ہے۔ جی ہاں! یہ معاشرہ جو دولت کی بنیاد پر انسان میں تفریق ڈالتا ہے۔ یہ نظام جو لوٹ کھسوٹ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہ ماحول جس میں جنگل کا قانون جاری ہے۔ یہ قاتل نظام' یہ جابر معاشرہ --- اور یہ غیر انسانی رسوم' یہ ہیں ہماری اور تمہاری مجرم۔ ہماری جنگ ان کے خلاف ہے۔ ہم نا انصافی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ظلم کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ ہمیں وہ سارے اسباب ختم کرنے ہیں جو انسان کو حیوان بنا دیتے ہیں اور یہ ناممکن شے نہیں۔ دنیا میں ایسا ہوتا رہا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب معاشرے کی حالت دیکھو' قدیم نظام کی تبدیلی کے ساتھ ہی سارے ظلم باطل ہو گئے تھے۔ آج کے دور میں چین کو دیکھو' جہاں انقلاب سے پہلے دنیا بھر میں سب سے زیادہ قتل و غارت' چوری اور زنا ہوتا تھا' لیکن آج یہ خطہ پاکیزگی کا مکمل نمونہ ہے۔

پیپلز پارٹی جب تک تمہارے لیے جنگ کرے تم ہمارے ساتھ رہنا۔ اے لوگو! ہم جب تک صحیح راستے پر چلیں' ہمیں نہ چھوڑنا۔ اگر ہم صحیح راستے کو چھوڑ دیں تو ہماری گردنیں دبوچ لینا۔ ہمارا بھی وہی حشر کرنا جو آج تم نے بڑے بڑے دولتانوں اور ٹوانوں کا کیا ہے۔ ہم آسمان سے نہیں اترے۔ تم میں سے تمہاری طرح کے عام انسان ہیں۔ ہماری قوت اس ملک کے غریب عوام ہیں۔ مجبور محنت کش ہیں' بے کس کسان ہیں' ہم ان سے کبھی دھوکہ نہ کریں گے۔ زنداں کے باسیو! جبر و قہر کی ایک زبردست آندھی نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ظالموں نے اپنے مطلب کے قوانین بنا رکھے ہیں۔ جب ان بھیڑیوں کو تشنگی محسوس ہوتی ہے وہ دنیا کے ہر خطے میں بلا روک ٹوک انسانی خون بہانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح اور بھی کئی بے بس لوگ ظالموں کی قوت کا نشانہ بنے۔ کشمیر آج بھی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ فلسطین ہمارا قبلہ اول' دمشق کا وہ پہلا گھر آج بھی سامراج کے پاؤں تلے ہے۔ سامراج نے [illegible] کے سینے میں زبردست خنجر گھونپ رکھا ہے۔ دنیا میں ایک ملک [illegible]

نشانہ بنایا اور وہ ہے ویت نام، یہاں اتنے بم پھینکے گئے کہ مٹی بھی سیاہ ہو گئی۔ یہ ملک پچھلے ۳۰ سال سے مغربی آقاؤں کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ ہم ان عظیم ماؤں، بیٹیوں اور بیبیوں کو سلام کرتے ہیں جن کی کوکھ سے نکلنے والے جانباز ہر قدم پر سامراج کے دانت کھٹے کر رہے ہیں"

○ "قائد عوام" کی خطابت کے شعلے :

قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۲۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کو سلامتی کونسل کے "چوہدریوں" اور ان کے حاشیہ نشینوں سے خطاب کیا۔ بظاہر ان کا لہجہ بڑا مودب، شائستہ اور تحمل تھا لیکن الفاظ بڑے غیرتمندانہ اور سرمایۂ خیال باغیانہ تھا۔

"صدر گرامی! میں آپ کا اور سلامتی کونسل کے ارکان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے رات کے اس آخری منظر میں مل بیٹھنے کی تکلیف گوارا کی اور میرے وطن کے بہت ہی ناگزیر مسئلہ کو زیر بحث لائے ——— ہمارا مقابلہ ایک مہیب دیوپیکر دشمن سے ہے جو بڑا جارح اور ہمیشہ جارحیت پر تلا رہتا ہے ——— جموں اور کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بالکل نہیں ہے اور نہ یہ صورت حال پہلے کبھی پیدا ہوئی ہے ——— یہ علاقہ ہندوستان کی نسبت پاکستان سے بہت زیادہ مربوط و متصل ہے ——— جموں و کشمیر کے لوگ پاکستانی باشندوں کا گوشت پوست بھی ہیں اور خون بھی۔ ان کی زندگی ہماری زندگی ہے اور ہماری زندگی ان کی زندگی ہے ——— ہم اور وہ ایک ہی شے ہیں۔ وہ ہمارا جسم ہیں اور ہم ان کا جسم۔ ہمیں بھارت سے ایک ہزار سال تک لڑنا پڑا تو ہم اس سے لڑیں گے ذرا جھجک محسوس نہ کریں گے ——— میں نے یہ بات پچھلے سال بھی سلامتی کونسل سے کہی تھی جبکہ یہ ادارہ اپنی تمام تر دانائیوں اور صلاحیتوں کے باوجود ہمیں ایک ریزولیشن تک پہنچنے پر آمادہ نہ ہوا تھا ——— سلامتی کونسل کا خیال تھا کہ ہم ایک مردہ گھوڑے کی نعش اس کے در و دیوار تک گھسیٹ لائے ہیں۔ لیکن دنیا جان لے کہ پاکستان کے بہادر عوام اپنے اصولوں اور عہد و پیمان کو کبھی نہیں جھٹلائیں گے اور ان

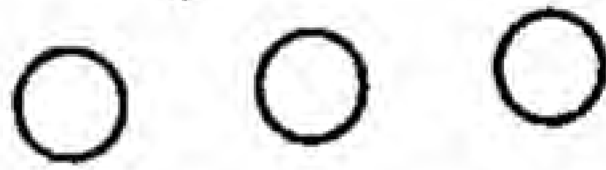
سے کبھی منہ نہ موڑیں گے ـــــــ یہ سلامتی کونسل کا فریضہ تھا کہ وہ یہ تعین کرے کہ کون جارح ہے اور کس پر جارحیت ہوئی ہے۔ میں یہاں ان نکات کو زیر بحث نہیں لاؤں گا جو بعض ملکوں نے پیدا کئے ہیں۔ جو ملک کہلانے کے مستحق نہیں اور جو حق بھی نہیں رکھتے ہیں کہ یہاں موجود ہوتے ـــــــ میں تو یہاں صرف بڑی قوتوں سے مخاطب ہوں ـــــــ تاریخ محض واہمہ نہیں یہ تاریخ شاہد ہے کہ ماضی میں لوگوں نے جنگیں لڑی ہیں اور اپنے اونچے مقاصد کو سربلند رکھا ہے ـــــــ یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی ساری کی ساری وسعتیں تو آپ اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا حق رکھیں مگر جموں و کشمیر کے لوگ اس حق سے محروم رہیں ـــــــ کیا یہ لوگ ہندوستانی سماج کے اچھوتوں کا کوئی گروہ ہیں؟ یا ذات برادری سے باہر کے لوگ ہیں؟ کہ انہیں اپنے مستقبل کے فیصلہ کا حق بالکل نہ دیا جائے ـــــــ میں آپ کو بتا دوں آپ ایک جنگ بندی کرلیں گے، ہوسکتا ہے کہ آپ کے کہنے پر دوسری بار بھی جنگ بند ہوجائے مگر پاکستان کے دس کروڑ باشندے ہر طرح کی تباہی و بربادی قبول کرلیں گے۔ ایک ایک آدمی موت کے گھاٹ اتر جائے گا مگر اپنے اصولوں پر آنچ نہیں آنے دے گا اور کسی بھی بڑی سے بڑی طاقت کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ اپنے زور بازو سے اس کے اصول توڑ ڈالے ـــــــ ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ سلامتی کونسل کو صرف آخری موقعہ دیں گے ـــــــ ہم سلامتی کونسل کو ایک محدود وقت دیتے ہیں اگر اس محدود وقت کے اندر سلامتی کونسل اس قابل نہ ہوسکی کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرسکے جو اس سلسلے میں اس پر عائد ہوتی ہیں تو پاکستان کو اقوام متحدہ سے نکل جانا ہوگا ـــــــ اور جب یہ الگ ہوگا تو دنیا کی ایک تہائی یا اس سے بھی زیادہ تعداد اس تنظیم کو چھوڑ دے گی۔"

★ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سلامتی کونسل کے اجلاس میں [illegible] ایک مرتبہ پھر خطاب فرما رہے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے [illegible] تھا اور بڑی طاقتیں پاکستان کی تقسیم پر [illegible]

بھٹو صاحب کا لہو کھولتا اور جذبہ حب الوطنی جھلکتا ہے۔

"اگر سلامتی کونسل یہ چاہتی ہے کہ میں ہتھیار پھینکنے کی دستاویز پر دستخط کردوں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

اقوام متحدہ پاکستان کے خلاف بھارتی جارحیت کو روکنے میں ناکام رہی ہے۔ اقوام متحدہ فراڈ بن چکی ہے۔ یہ ایک فیشن ہاؤس ہے جہاں مکروہ حقائق کو چھپایا جاتا ہے لیکن مکروہ حقائق چھپائے نہیں جاسکتے۔ تم سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ملک توڑ دو۔ جہنم میں جائیں تمہاری قرار دادیں' یہ ایک ڈرامہ ہے اور میں وقت ضائع نہیں کرسکتا۔ سلامتی کونسل نے پاکستان کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کیا شاید سلامتی کونسل میں یہ میری آخری تقریر ہو"۔



جہانِ خطابت!

- مشاہیر اپنی تقریریں کس طرح تیار کرتے تھے؟
- کامیاب تقریر کے لئے کون سے پہلو ناگزیر ہیں؟
- حسن خطابت کا جادو کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

ا

تقریر کی تیاری اور اس کی اہمیت و افادیت کے علاوہ بحر خطابت کے شناور اور فکر و نطق کے قدر دان اس معاملے میں بھی گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا کے تاریخ ساز مقررین نے اپنی انقلاب آفرین تقریروں کی تیاری کس طرح کی تھی اور ان کی مشق و ریاضت کا رنگ ڈھنگ کیا تھا؟ یہ باب نو آموز مقررین کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے جب کہ سحربیان خطباء کے لئے بھی اس میں کئی پہلو یادگار ہیں۔ اس طرح پتہ چلتا ہے کہ دنیا کا رخ موڑ دینے والی تقریریں کس طرح تیار ہوئی تھیں اور ان خطبات کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے واعظین نے کیا کیا ریاضتیں کیں۔

ڈوائٹ ایل' موڈی نے اپنے روحانی خطبات کے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔

"جب میں کوئی موضوع چنتا ہوں تو ایک بڑے لفافے کے باہر لکھ لیتا ہوں۔ میرے پاس اس قسم کے بہت سے لفافے ہیں۔ کوئی کتاب پڑھتے وقت اگر مجھے کوئی ایسی بات مل جائے جس کا تعلق میری کسی تقریر کے موضوع سے ہو تو میں اسے اس موضوع والے لفافے میں ڈال کر لفافہ اس کی اصلی جگہ رکھ دیتا ہوں۔ میں ہر وقت اپنے پاس ایک نوٹ بک رکھتا ہوں۔ اگر میں کسی تقریر کے موقع پر کوئی ایسی بات سنوں جس کا تعلق میری کسی تقریر سے ہو تو میں اسے لکھ کر اسی موضوع والے لفافے میں ڈال دیتا ہوں۔ ایسی چیزیں ان لفافوں میں سالہا سال تک پڑی رہتی ہیں۔ جب مجھے کوئی تقریر کرنی ہو تو یہ چیزیں بہت کام آتی ہیں۔ ان جمع شدہ چیزوں اور ذاتی مطالعے کے باعث میرے پاس خاصا مواد جمع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ میں باقاعدہ اپنی تقریروں کی چھان پھٹک کرتا رہتا ہوں۔ [illegible] پرانی نہیں ہو گئیں"

ڈاکٹر براؤن اپنی تقریروں کی تیاری کے سلسلے میں کہتا ہے۔

"میں بعض اوقات آدھی رات کو اٹھ کر اپنے خیالات قلمبند کرنے بیٹھ جاتا ہوں کہ کہیں صبح تک ذہن سے نکل نہ جائیں"

سابق سینٹر البرٹ جے بیورج اپنے خطاب کی تیاری کے سلسلے میں لکھ گئے ہیں۔

"میں اپنے موضوع پر پورا پورا عبور حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ تمام حقائق و واقعات کو ترتیب دینے کے بعد ان کا مطالعہ کرکے انہیں ہضم کیا کرتا ہوں"

ڈاکٹر رسل ایچ کانول نے اپنی لاتعداد تقریریں مندرجہ ذیل خاکہ کے تحت تیار کی تھیں۔

۱۔ موضوع سے متعلق حقائق
۲۔ ان کے لئے عقلی و نقلی دلائل
۳۔ ان پر عمل پیرا ہونے کی درخواست

لائیڈ جارج اپنے شہر کی ایک مجلس مباحثہ کا رکن تھا۔ وہ اکثر شہر سے باہر نکل جاتا اور درختوں سے مخاطب ہو کر تقریر کی تیاری کیا کرتا تھا اور عہد شباب میں بریکن رج جیسے نامور مقرروں کی تقریریں سننے کی خاطر تیس چالیس میل پیدل سفر کیا کرتا تھا تاکہ خوشہ چینی کر سکے۔

ہردلعزیز امریکی صدر ابراہام لنکن اپنی تقریریں کس طرح تیار کرتا تھا؟ لنکن کی مشہور تقریروں میں سے ایک تقریر وہ تھی جس میں اس نے پختہ یقین کے ساتھ کہا تھا۔

"ایک تقسیم شدہ مکان کبھی زیادہ عرصہ کھڑا نہیں رہ سکتا مجھے یقین ہے کہ یہ حکومت جو نیم آزاد اور نیم غلام ہے، ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکے گی"

یہ تقریر اس نے روزانہ کاموں کے دوران سوچی تھی۔ کھانا کھاتے وقت، بازاروں میں گھومتے وقت، اپنے فارم میں دودھ دوہتے وقت، بازار سے سودا سلف خریدتے وقت، جبکہ ایک بوسیدہ خاکی شال اس کے کندھوں پر پڑی ہوتی تھی اور اس کے

ہمراہ اس کا چھوٹا سا لڑکا ہنستا کھیلتا اور باپ سے سوالات کرتا چلا جا رہا ہوتا تھا۔ مگر لنکن اپنی تقریر کے متعلق سوچتا ہوا اپنے خیالات میں غلطاں' قدم اٹھائے جاتا تھا۔ اس سوچ بچار کے دوران وہ کبھی کبھی کاغذ کا کوئی پرزہ لے کر یا کسی لفافے سے تھوڑا سا کاغذ پھاڑ کر اس پر کوئی پورا یا ادھورا جملہ لکھ دیتا تھا۔ کاغذ کے ان پرزوں کو وہ ہیٹ میں ٹھونس لیتا اور جب اسے تقریر کرنا ہوتی یا اشاعت کے لئے کوئی مضمون بھیجنا ہوتا تھا تو وہ. کاغذ کے پرزوں کو فائل سے نکال کر ان کے ذریعے اپنے خیالات ترتیب دے لیا کرتا تھا۔

۱۸۵۸ء کی مشترکہ تقاریر میں سینیٹر ڈگلس جہاں بھی گیا اس نے اپنی وہی ایک تقریر کی مگر لنکن مطالعہ کرتا رہا اور اپنے خیالات میں رد و بدل کے باعث اس کے کہنے کے مطابق' پرانی تقریر دہرانے کی نسبت ہر روز نئی تقریر کرنا اس کے لئے زیادہ آسان ہوگیا تھا۔

وائٹ ہاؤس میں جانے سے کچھ دیر قبل اس نے مجلس قانون ساز کے دستور کی ایک جلد اور تین تقریریں لیں اور سپرنگ فیلڈ کے ایک سٹور کے ایک تاریک کمرے میں خود کو مقفل کرلیا۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور وہاں اس نے اپنی افتتاحیہ تقریر لکھی تھی۔

ہاں! لنکن کی بعض تقریریں' جو اس نے دلی لگاؤ سے تیار نہیں کی تھیں' واقعتاً بری طرح ناکام ہوئی تھیں۔ مگر جب وہ غلامی اور یونین کے موضوع پر اظہار خیال کرتا تو اس میں غیر معمولی صلاحیت عود کر آتی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ ان مسائل پر وہ متواتر سوچتا رہا تھا اور انہیں اس نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔ اس کا ایک ساتھی جس نے ایک مرتبہ لنکن کے ہمراہ کسی سرائے کے ایک کمرے میں رات بسر کی دوسری صبح پو پھٹنے پر کیا دیکھتا ہے کہ لنکن بستر پر بیٹھا [illegible] رہا ہے اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔

"[illegible] آدھا غلام اور آدھا آزاد حکومت ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتی"

[illegible] بعض جملے تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ

حضرت مسیحؑ اپنے خطبوں کی تیاری کے لئے لوگوں سے دور چلے جاتے تھے' وہ سوچا کرتے تھے' غور و خوض کیا کرتے تھے" اس وقت سے بقول اس کے "حضرت مسیح نے وعظ کرنا شروع کردیا" ایک دفعہ وڈورڈ ولسن سے پوچھا گیا کہ وہ تقریر کس طرح تیار کرتا ہے تو اس نے بتایا:

"جس موضوع پر مجھے تقریر کرنی ہوتی ہے اس کے ذیلی عنوانات ان کے فطری تعلق کے لحاظ سے ذہن میں ترتیب دے لیتا ہوں۔ یعنی اشیاء کی ہڈیاں اکٹھی کرلیتا ہوں۔ پھر میں انہیں مختصر نویسی میں لکھ لیتا ہوں۔ مجھے اختصار نویسی کی عادت ہوگئی ہے کیونکہ اس طرح بہت سا وقت بچ جاتا ہے ایسا کرنے کے بعد میں ٹائپ رائٹر پر تقریر لکھنی شروع کردیتا ہوں ساتھ ساتھ جملے درست کرنے کے علاوہ نئے مواد کا اضافہ بھی کرتا جاتا ہوں"

ڈیل کارنیگی بتاتا ہے کہ تھیوڈور روز ویلٹ اپنے مخصوص انداز میں تقریر تیار کیا کرتا تھا۔ وہ موضوع سے متعلق حقائق کا کھوج لگایا کرتا تھا' ان پر غور کرتا تھا' انہیں موزوں طریق سے مرتب کیا کرتا تھا' ان میں خیالات کا اضافہ کیا کرتا تھا۔ پھر پورے شوق سے نتائج برآمد کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ تقریر سیکرٹری کو لکھانے لگتا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے بولتا جاتا تھا تاکہ تقریر میں روانی اور روح حیات پیدا ہوسکے۔ پھر وہ لکھی ہوئی تقریر پر نظر ثانی کرتا تھا اور پنسل سے غلطیاں درست کرتا جاتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

"میں نے محنت شاقہ اور پیشگی سوچ بچار کے بغیر کبھی کوئی معرکہ سر نہیں کیا۔ اکثر وہ اپنی تقریریں نقادوں کے سامنے تبصرے کی خاطر پڑھا کرتا تھا۔ وہ اپنی دانائی جتانے کے لئے ان سے بحث نہیں کیا کرتا تھا۔ اسے اپنے ذہن کی پیداوار پر یقین ہوگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تقریر کے مواد کے متعلق اس سے کوئی بات کی جائے بلکہ مواد کو کسی بہتر انداز میں ڈھالنے کا طریقہ اسے بتایا جائے۔ وہ بار بار تقریر کی چھان پھٹک کیا کرتا تھا۔ اس نے تقریر کبھی ازبر نہ کی تھی۔ وہ برجستہ بولا کرتا تھا۔ اس لئے وہ تقریر شائع شدہ تقریر سے مختلف ہو جاتی تھی۔ لیکن

تقریر کو لکھانے اور اس کی چھان پھٹک کرنے کا کام بڑی عمدہ تیاری ہوتی تھی۔ اس طرح وہ اپنے مواد اور اس کی ترتیب سے آشنا ہو جاتا تھا۔ ایسا کرنے سے تقریر اس قدر ہموار اور معتبر ہو جاتی تھی کہ کوئی اور طریقہ بمشکل زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتا تھا"

سر آلیور لاج بتایا کرتے تھے کہ تقریر لکھاتے وقت مواد کو جلد جلد بولتے وقت تقریر کو اس انداز سے لکھانا جیسے حاضرین کے سامنے کی جا رہی ہو۔ ایسا کرتے وقت اسے محسوس ہوتا تھا کہ تقریر کی تیاری اور مشق کا اس سے بہتر طریقہ کوئی نہیں"

اہل عرب اگرچہ فطرتاً" خطیب ہوتے تھے تاہم وہ بھی فن خطابت کی مشق و تعلیم سے بے نیاز نہ تھے۔ ابراہیم بن جبلہ بن مخرمہ السکون اپنے شاگردوں کو خطابت کا درس دیا کرتا تھا۔ ایک بار بشیر بن معمر ادھر سے گزرا بشیر بن معمر نے ان نوجوانوں کو ایک تحریر دی جس میں خطابت کے اصول درج تھے۔ چنانچہ جاحظ نے کتاب موسومہ "البیان و التبین" میں اس کو من و عن نقل کیا ہے"

نذیر الدین احمد' رموز خطابت میں ایک چونکا دینے والا حوالہ لائے ہیں۔

"شریڈن کی اس معرکتہ آلاراء تقریر کے متعلق جو انہوں نے اودھ کے بارے میں لارڈ ہیسٹنگز کے خلاف کی تھی' میکالے کا خیال ہے کہ وہ انسانی یادداشت میں بہترین تقریر تھی۔ دو دن تک شریڈن کی تقریر سننے کو اس قدر لوگ آتے رہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی' حتی کہ ایک داخلہ ٹکٹ پچاس گنا پر خریدا گیا اور حق تصنیف محفوظ کرانے کے لئے ایک دن میں ایک ہزار پونڈ پیش کیے گئے۔ یہ معنی خیز اور اثر انگیز تقریر آسانی سے نہیں کی گئی بلکہ شریڈن ہر اس شخص کے پاس گیا جس سے ہندوستان اور ہیسٹنگز کے متعلق (تھوڑا ہی سہی) مواد ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ اس طرح اس تقریر کی تیاری کے لئے (ایک ماہ سے زیادہ) مسلسل جدوجہد و محنت برداشت کرنا پڑی" انداز بیاں کے صفحہ ۶۵ پر اس تذکرے میں برک کا نام لکھا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ "جب اس نے بیگمات

اودھ کے ساتھ وارن ہیٹنگز کے متشددانہ سلوک کی تصویر کھینچی تو تماشائیوں کی گیلریوں میں بیٹھی ہوئی معزز انگریز خواتین سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔ اثر آفرینی کی انتہا یہ تھی کہ اپنے خلاف برک کی تقریر سننے کے بعد وارن ہیٹنگز نے اعتراف کیا کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔

مسٹر چرچل (برطانیہ کے سابق وزیراعظم) اسکاٹ لینڈ میں انتخابات کے زمانے میں پورا دن اپنے کمرے میں بند ہو کر باواز بلند اپنی تقریر کی مشق کرتے رہے۔ اسی تقریر نے سرونسٹن چرچل کی شہرت کو چار چاند لگائے تھے۔

اس موضوع کو مزید آگے بڑھانے کے لئے "انداز بیاں" سے دو حوالے مستعار لیتے ہیں۔

"بنجمن ڈسرائیلی نے سیاست اور ادب میں بے شمار شہرت حاصل کی۔ اسے برطانوی کنزرویٹو پارٹی کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔ جب وہ پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو اس پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ چند بے تکی باتوں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں قہقہوں اور شور و شغب کا طوفان اٹھ کھڑا ہو اور اسے مجبور ہو کر بیٹھ جانا پڑا۔ لیکن بیٹھتے ہوئے اس نے اتنا ضرور کہا کہ سردست میں بیٹھ جاتا ہوں لیکن وقت آئے گا جب آپ میری تقریر خاموشی سے سنیں گے۔ وہ نہایت عزم، حوصلے اور فن تقریر میں محنت کی وجہ سے وقت آنے پر بڑے پائے کا مقرر بن گیا اور سیاست و خطابت دونوں پر قدرت ہونے کے سبب وزارت عظمیٰ تک پہنچا۔ اس کی خدمات کی بناء پر اسے لارڈ بیکنسفیلڈ بنا دیا گیا وہ ملکہ وکٹوریہ کا بڑا چہیتا وزیر اعظم تھا۔۔۔۔"

"بھٹو صاحب صدر ایوب کی حکومت سے علیحدہ ہوئے اور انہوں نے سیاسی میدان میں نئی جدوجہد شروع کی تو پرانے سیاست دانوں کا یہ خیال تھا کہ وہ پاکستانی عوام کے قائد نہیں بن سکیں گے۔ ان کے نزدیک اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ وہ زیادہ اچھی اردو نہیں جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ موچی دروازہ، چوک یادگار، نشتر پارک اور لیاقت باغ میں انگریزی کو ذریعہ اظہار نہیں بنایا

جاسکتا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں ان کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ بھٹو صاحب اردو میں تقریریں کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دلوں کی دنیا پر چھا گئے۔ آہستہ آہستہ انہیں اردو زبان پر بھی عبور ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں بڑی محنت سے کام لیا۔ مصروفیات کے اژدہام کے باوجود اردو سیکھنے کے لئے وقت نکالا۔ بول چال کی مشق کی اور اتنا ذخیرۂ الفاظ جمع کرلیا کہ اب وہ دو دو اڑھائی اڑھائی گھنٹے بے تکان اردو زبان میں خطابت کرسکتے تھے اور انہیں کوئی وقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اردو زبان میں کبھی کبھی ان سے تذکیر و تانیث یا تلفظ یا محل استعمال کی کوئی نہ کوئی فروگزاشت بعد میں بھی ہو جاتی رہی مگر وہ ایسی معصومانہ ہوتی تھی کہ بھونڈی لگنے کی بجائے بھلی لگتی اور عوام اس سے الٹا محظوظ ہوتے تھے"

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تقریر اور مباحثے میں شریک ہونے سے جرات میں زیادتی اور خود اعتمادی کی نشوونما ہوتی ہے۔ وہ لوگ جنہیں سٹیج پر آکر خطاب کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یا ابتدائی مواقع پر ہی ناکامی اپنا مقدر سمجھ بیٹھے وہ بنیادی طور پر ایک ہی احساس کا شکار ہیں۔ درج ذیل جملے اسی طرح کے کسی شخص کی ترجمانی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں خط کا یہ ٹکڑا ایسے افراد کے عدم اعتماد کا غماز اور نفسیاتی پیچوں کا نمائندہ ہے۔

"جب مجھے تقریر کے لئے بلایا جاتا ہے تو میں اس قدر ڈر جاتا اور گھبراتا ہوں کہ اپنا ما فی الضمیر یکسر بھول جاتا ہوں——— مگر یہ کوئی لا علاج مرض یا پیچیدہ الجھن نہیں اور نہ ہی ایسے لوگوں کا معاملہ زیادہ مشکل ہے۔ وہ بھی، جو بعد میں اپنے دور کے نامور اور نمائندہ مقرر مشہور ہوئے ہیں، شروع شروع میں اسی قسم کے عام سادہ خوف کا شکار رہے تھے۔

لارڈ مکینفلڈ انگلستان کا نامور مدبر و خطیب گزرا ہے۔ پہلی مرتبہ پارلیمنٹ تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو سلیقے کی کوئی بات نہیں کرسکا تھا۔

مشہور واعظ رابرٹ ہال اپنی طالب علمی کے زمانے میں جب تقریر کے

لئے اٹھا تو خود اعتمادی کے فقدان کے باعث منہ ڈھانپتے ہوئے کہنے لگا "میں بد حواس ہوگیا ہوں"

میدان کارزار کے مشہور جنگجو سورما ولیم جیننگز بدیان نے تسلیم کیا تھا کہ پہلی مرتبہ تقریر کرتے وقت اس کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ مارک ٹوین جب ابتدا" لیکچر دینے کے لئے کھڑا ہوا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ میں روئی ٹھونس دی ہو اور اس کی نبضیں اتنی تیز ہوگئی تھیں جیسے دوڑ کے کسی انعامی مقابلے میں حصہ لے رہے ہوں۔

گرانٹ نے اپنے وقت کی عظیم ترین فوج کی قیادت کی اور وکس برگ فتح کیا لیکن جب لوگوں کے سامنے تقریر کرنے آیا تو وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جین جاریز (فرانسیسی) اپنے عہد کا کامیاب سیاسی خطیب پہلی تقریر کی جرات کرنے سے پیشتر دارالمندوبین میں ایک سال تک زبان کو تالہ لگائے بیٹھا رہا۔ "جب میں نے پہلی مرتبہ تقریر کی کوشش کی" لائڈ جارج نے تسلیم کیا ہے "تو میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں فقط بات بنانے کی خاطر نہیں کہہ رہا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ میری زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی اور لبوں سے ایک لفظ نکالنا مشکل ہوگیا تھا"

عظیم آئرش لیڈر چارلس سٹوورڈ پارنل' اپنے بھائی کی شہادت کے مطابق جب پہلی دفعہ سٹیج پر آیا تو بار بار زور زور سے مٹھیاں بھینچنے سے اس کے ناخن گوشت میں اتر گئے تھے اور اس کی ہتھیلی سے خون بہنے لگا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں اگر کسی نوجوان ممبر کی پہلی تقریر کامیاب ہو جائے تو اسے برا شگون سمجھا جاتا ہے۔

آپ مطلقاً حوصلہ نہ ہاریں۔ جب کوئی شخص پہلی بار (نو مشقی کا زمانہ) مجمع کے سامنے بغرض تقریر کھڑا ہوتا ہے تو وہ بہر کیف گھبراہٹ محسوس کرتا ہے' دل دھڑکنے لگتا ہے۔ دل و دماغ زبان کا ساتھ نہیں دیتے۔ بے چارگی و پریشانی میں رک رک جاتا ہے۔ بیشتر مقررین اپنے حالات میں ناامید ہو جاتے ہیں۔ بعض

لوگ خواہ کتنی مرتبہ لوگوں کے سامنے بول چکے ہوں لیکن تقریر کے ابتدائی چند لمحوں میں گھبرائے گھبرائے رہتے ہیں اور جب وہ جم جاتے ہیں تو بدحواسی اور گھبراہٹ دفعتاً غائب ہو جاتی ہے لہٰذا اچھا ہے کہ ہر مبتدی اس پہلو سے بخوبی آگاہ ہو۔

"جاودانی مسرت کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ لوگوں کے سامنے تقریر کرکے انہیں اپنے خیالات کی پیروی کی خاطر اکسایا جائے۔ اس کے باعث آپ کو اپنے اندر ایک عظیم قوت کا احساس ہونے لگے گا۔ یہ آپ کے غرور اور ذاتی صلاحیت کو متاثر کرے گا۔ یہ آپ کو دوسرے لوگوں کی سطح سے بلند کردے گا۔ اس میں ایک جادو اور ناقابل فراموش ولولہ ہے"
ایک مقرر نے تسلیم کیا۔

"تقریر کرنے سے دو منٹ پہلے، تقریر کے بجائے اگر کوئی مجھے کوڑے مار لے تو میں بخوشی قبول کرلوں گا لیکن تقریر ختم کرنے سے دو منٹ پہلے میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھے گولی مار دے اور تقریر ختم کرنے کو نہ کہے"

"شاعری کے لئے کوئی مضمون اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور برے شاعر ہوتے ہیں" شاعری کے متعلق یہ بات وکٹر ہیوگو نے کہی تھی۔ یہی بات میں تقریر کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ یہ کہنا بھی بالکل غلط ہے کہ فلاں موضوع پر کامیاب تقریر کی جاسکتی ہے اور فلاں پر نہیں۔ تقریر کا اہم یا غیر اہم ہونا دلچسپ یا غیر دلچسپ ہونا مقرر کے قد کاٹھ اور اس کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔

آپ یقیناً محسوس کرتے ہوں گے کہ اس دنیا میں گونگا پن کتنا بڑا المیہ اور ایک اذیت ناک محرومی ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنے خیالات و تجربات کا اظہار نہ کر سکنا بھی اسی سلسلے کا حصہ ہے۔ کوئی میاں نواز شریف اور غلام مصطفیٰ جتوئی کو ملکوتی خطابت سے عاری ہونا افلاس کی کونسی قسم ہے اور اگر یہ صلاحیت ہوتی تو آپ کتنے فخر کریں گے؟ ـــــ زیادہ مدت نہیں

گزری کہ ورلڈ کپ جیتنے کے پرمسرت موقع پر پاکستانی کرکٹ ٹیم کا انتہائی شہرت یافتہ کپتان ــــــ عمران خان ــــــ آئیں بائیں شائیں کے سوا کچھ بھی کہہ نہیں پایا تھا۔ اپنے خوشی کے جذبات و احساسات کا بیان بھی نہ کیا جا سکے اور پوری دنیا کے سامنے منہ لٹکا کر کھڑے ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے؟

میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے بولتے وقت اس ہمواری سے سوچ اور بول سکیں جیسے کہ اپنے کمرہ میں سوچتے اور بے تکلف دوستوں میں بولتے ہیں۔ دراصل سامعین کے سامنے آپ کی قوت فکر زیادہ تیز ہونی چاہیے "گفتگو اور تقریر کا فن" کے مولف کا کہنا ہے "ان کی موجودگی آپ کے لئے تحریک و ترقی کا باعث ہونی چاہیے۔ بہت سے مقرر آپ کو بتائیں گے کہ سامعین کی موجودگی میں ان کا ذہن زیادہ صفائی اور سرعت سے کام کرنے لگتا ہے اور وہ خود کو زیادہ پرجوش محسوس کرتے ہیں" اس قسم کے موقع پر ہنری وارڈ بیچر کے بقول "وہ خیالات اور حقائق جن کا انہیں علم ہی نہیں ہوتا، خود بخود قطار باندھے ان کے ذہن میں چلے آتے ہیں اور انہیں فقط ان خیالات و حقائق کو استعمال کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو بھی اسی قسم کا تجربہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ استقلال سے مشق کریں تو یہ کوئی ناممکن کام نہیں ہے"

۲

پھول خوشبو کے بغیر اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ اور اگر ایک بھی پتی کم ہو جائے تو پھول، پھول نہیں رہتا۔ [illegible] ترکیبی سے ہم آنکھیں نہیں چرا سکتے۔ بعینہ اس طرح اگر کسی خوبصورت ترین جسم [illegible] طائر روح پرواز کر

جائے تو اس میں پرستاروں کے لئے بھی کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ ہاں، اگر الفاظ بنجر ہوں اور ان میں خطیب کا دل نہ دھڑکتا ہو تو ایسے ہی ان کی بے اثری مسلمہ ہے کیونکہ تقریر میں لفظوں کے علاوہ کوئی اور چیز بھی محسوس ہونی چاہیے۔ یہی شے اسلوب بیان کہلاتی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ تقریر کا مواد اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اسلوب بیان۔ کسی کامیاب مقرر کا دعویٰ تھا۔ "ایک اچھا اسلوب تقریر کمتر مواد کو بھی بڑا دلچسپ بنا دیتا ہے"

کامیاب تقریر اسے کہتے ہیں جب سامعین کو یہ احساس ہونے لگے کہ مقرر اپنا پیغام اپنے دل و دماغ سے ان کے دل و دماغ تک پہنچا رہا ہے۔ اگر یہ جذبہ درمیان میں کارفرما نہ ہو تو لمبی چوڑی تقریریں صدابصحرا ثابت ہوتی ہیں اور ایسے مقرر سوچتے ہیں کہ وہ انسانوں کے بجائے پتھروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ اسی لئے مشاہیر خطابت ہنری فورڈ وغیرہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ کی تقریر میں آپ کا دھڑکتا ہوا دل نظر آنا چاہیے۔

ایک اچھے مقرر کا اسلوب بیان اس قدر فطری اور لہجہ قدرتی ہوتا ہے کہ سامعین فقط اس کے مواد پر توجہ کرتے ہیں۔ اسالیب کی دنیا میں چند اہم باتوں کو مدنگاہ رکھنا ناگزیر ہے۔ بعض درج ذیل ہیں۔

- اہم الفاظ پر زیادہ زور دیں
- لہجے کا موزوں زیروبم اپنائیں
- تقریر کے دوران میں انداز بدلتے رہیں
- اہم بات سے پہلے اور بعد میں مختصر وقفہ کریں

والڑپی سیچوز لکھتا ہے۔

"[illegible] چند الفاظ جلد جلد بول کر اہم الفاظ پر آواز ڈھیلی چھوڑ دیتا تھا اور ان پر زور دے کر بجلی جیسی تیزی سے جملہ ختم کر دیتا تھا ——— وہ ایک یا دو [illegible] پر اتنا ہی وقت صرف کرتا تھا جتنا بعد کے نصف درجن کم اہم الفاظ پر" [illegible] تقریر میں اکثر وقفے بھی رکھتا تھا۔ جب وہ کسی اہم موڑ پر پہنچتا تو

سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چند لمحے خاموش رہتا تھا۔ یہ خاموشی جلسہ گاہ میں موجود لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ ہر کوئی اگلی بات سننے کے لئے چوکنا اور محتاط ہو جاتا تھا۔

"آپ کی خاموشی آپ کی زبان بھی ثابت ہو سکتی ہے"

یہ کپلنگ کے الفاظ ہیں واقعی اگر خاموشی کو تقریر یا گفتگو میں برمحل استعمال کیا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسا طاقتور ہتھیار ہے جو نظر انداز نہیں کیا کرتے۔ پل بھر کے لئے یہ سوچنا چاہیے کہ کیا ہم تقریر کرتے وقت اہم الفاظ پر زور دیتے' لیکن ——— اگر اور اگرچہ کی اہمیت سمجھتے' خاص مرحلے پر مناسب وقفہ رکھتے اور جملوں کی ساخت کے مطابق زیر و بم پیدا کرتے ہیں؟

ربط و تسلسل۔

ربط و تسلسل خطابت کی روح' فن کی عظمت' کامیابی کی دلیل اور تحریکی مقاصد کی جان ہے۔ مقرر کا مدعا مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول کسے "اچھے مقرر کی مثال اس ماہی گیر جیسی ہے جو دریا میں جال کو خوب پھیلا کر بڑی جگہ کو گھیرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کے تمام گوشوں کو کھینچ کر ایک جگہ جمع کر لیتا ہے"۔

اہل فن کے نزدیک تقریر بھی ہماری طرح جسم اور روح رکھتی ہے۔ جسم الفاظ ہیں اور روح' معانی و مطالب۔ اس طرح زنجیر و تقریر کی ایک حالت ہے جس طرح زنجیر کے ایک حلقے کا اپنے دوسرے حلقے سے جدا ہونا گویا زنجیر سے جدا ہو جانا ہے اسی طرح تقریر کا کوئی حصہ اگر دوسرے حصہ سے مربوط نہ ہو تو اثر پذیری ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

بعض مقررین بلحاظ مواد و زبان اچھی تقریر کر سکتے اور مناسب و موزوں آہنگ بھی رکھتے ہیں مگر ربط و تسلسل کا نام تک نہیں ہوتا۔ جب مقرر چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف کلیتہ" متوجہ ہو جاتے ہیں تو پھر بے ربطی اور عدم تسلسل کا ہی جا بجا مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔

مشہور فلسفی لاک کی رائے ہے

"پیچیدہ خیالات کی تفہیم کے لئے استقرائی طریقہ کو کام میں لانا چاہیے اور اسی طرح اکتساب درجہ بدرجہ ہو یعنی تدریجی طور پر آسان سے مشکل کی جانب قدم بڑھائے جائیں"

ہربرٹ سپنسر نے کہا تھا۔

"جب کسی شخص کے علم میں کوئی ربط نہ ہو تو جوں جوں اس کے خیالات وسیع ہوتے جائیں گے ان میں بے ربطی پیدا ہوتی جائے گی" تقریر کو چوں چوں کا مربہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ پہلے شوربا دیں پھر آئس کریم اور پھر مچھلی۔ اور آخر میں آئس کریم' شوربے اور مچھلی کا ایک مرکب سا پیش کردیں۔ ایک نشست میں دو نکات سے زیادہ پر گفتگو کرنا پریشانی کا سبب ٹھہر سکتا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ تقریر میں وہی لوگ رنگ جماتے ہیں جنہوں نے ذہن میں پہلے سے ہی سلسلہ کلام میں ربط و تسلسل کی کڑیاں قائم کی ہوتی ہیں بعض کامیاب مقرر تو باقاعدہ الفاظ و اشعار کا بھی انتخاب کرلیتے ہیں۔

مواد۔

پانی اپنا راستہ خود بناتا ہے اور اسی طرح اگر آپ کے پاس بھی کہنے کے لئے کچھ ہے تو وہ از خود کوئی نہ کوئی منفرد اسلوب اختیار کرلے گا۔ مگر میکانکی اصول یہ ہے کہ ممکنہ قوت ایک ہی نکتہ پر صرف کی جائے۔

آپ کی آنکھیں کھلی ہیں تو مطالعہ کائنات سب سے بڑا علم ہے۔ ہمارے ارد گرد' تاحد نگاہ اسرار و رموز کی ایک وسیع دنیا ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ معلومات کے حصول اور نتائج کے اخذ کرنے کے لئے زیادہ جدوجہد کی ضرورت نہیں' بس تھوڑی سی توجہ درکار ہے۔

۱۔ غور و فکر کی پختہ عادت ڈالیے۔

۲۔ داخلی و خارجی طور پر مشاہدے کو شعار بنائیے

۳۔ بحث و مباحثہ میں بھرپور حصہ لیجئے

۴۔ کتب بینی اور وسیع مطالعہ اپنایئے

۵۔ قوت متخیلہ کو کام میں لایئے

قوت متخیلہ اسی باطنی قوت کا نام ہے جو دل و دماغ کی مدد سے اندر ہی اندر ادھیڑ بن میں محو رہتی ہے۔ فکراً تعمیر و تخریب کرتی اور ریاضت تجربہ کی آبیاری سے پھل پھول کر بالاخر اپنی بہار دکھلانے لگتی ہے۔ مشاہدے کی اہمیت کے بارے میں تمثیلاً کہا گیا ہے کہ مکان کی تعمیر سے قبل مکان کے نقشے کی تیاری ضروری ہوتی ہے اور اسی طرح نقشے کی تیاری سے قبل ذہنی خاکہ تیار کیا جاتا ہے' بعد ازاں سامان تعمیر کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ مشاہدہ ذہنی خاکہ ہے' غور و تدبر اور قوت متخیلہ' نقشہ اور سامان تعمیر مقرر کا مطالعہ ہوتا ہے۔ سنسکرت کے ایک عالم کا قول ہے "جس علم کو دہرایا نہ جائے وہ مردہ ہے" اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "علمی زر و جواہر جن خزانوں میں سربمہر ہیں ان کا نام کتب ہے" مطلب یہ کہ مطالعے کی متواتر عادت ڈالئے۔

الفاظ کی اہمیت و استعمال ۔

انگلستان کے مشہور نقاد "رسکن" کا کہنا ہے۔

"خوبصورت اور کامل لفظ یاد رکھنا بہت ہی قابل قدر اور بہترین عقلمندی ہے"

اڈورتامس نے کیا خوب کہا ہے۔

"الفاظ گو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں لیکن زمین و آسمان دونوں کی ان تمام اشیاء کو قابو میں رکھ سکتے ہیں جو بہت ہی وزنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں اور جو یا تو بہت جلد فنا ہو جاتی ہیں یا ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی ہیں۔ غرض کہ معمولی معمولی الفاظ ہی تو ہیں جن کی مدد سے دنیا آج ہمیں معراج ترقی پر پہنچتی نظر آتی ہے"

۔ علامہ ابن خلدون نے الفاظ کو پیالہ اور معانی کو پانی قرار دیا ہے۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالے میں بھر لو چاہے مٹی کے۔ لیکن سونے کے پیالے میں اس کی

قدر بڑھ جاتی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں۔

"معنی اور مطالب صرف الفاظ کے تابع ہیں اور ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مطالب کو بہترین طور پر ادا کرنا سیکھیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی جائے کہ معانی اور الفاظ میں ہم آہنگی رہے" بناء بریں یہ پہلو بھی ہمیشہ ذہن نشیں ہونے چاہیں۔

- تقریر میں ثقیل و مکروہ الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔
- تشبیہات و استعارات اور مترادفات کا ذخیرہ جمع کریں۔
- معانی و الفاظ کی مناسبت پر خاص توجہ مبذول کریں۔

تقریر کے اہم حصے!

ایک اچھی اور مکمل تقریر لازمی طور پر مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہوگی۔

ا۔ تمہید و آغاز

ب۔ روح کلام

ج۔ نتیجہ اور اپیل

درجہ اوّل۔ تمہید و آغاز کا مقصد تقریر اور عنوان تقریر سے ایک گہرا تعلق ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب مقرر سامعین پر پہلا تاثر قائم کرتا اور اسے مجمع کی نفسیات سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر سامعین کو اپنی شخصیت کے سحر اور پہلے ہی جملہ میں اپنی طرف مائل کر لیا جائے اور ہجوم کی توجہ مقرر کی سمت منعطف ہو جائے تو یہ کامیابی کا پہلا زینہ قرار دیا جائے گا کیونکہ یہ تاثر اخیر وقت تک قائم رہتا ہے۔ اسی لئے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر لین ہیرلڈ بگ نے

[illegible] میں سب سے اہم حصہ ابتدا آغاز ہوتا ہے کوئی ایسا ابتدائیہ جملہ ہو

لوگوں کی توجہ فوراً" اپنی طرف کھینچ لے"
ہملٹ کے نزدیک جو مقرر تقریر کا آغاز کسی مزاحیہ کہانی سے کرتے ہیں ان کے وعظ "بے سود اور بے اثر ہوتے ہیں"

ڈیل کارنیگی کا کہنا ہے۔
"ممکن ہو تو تقریر کا آغاز کسی مقامی بات' کسی دوسرے مقرر کے الفاظ کا حوالہ دے کر یا کسی تاریخی شخصیت کے قول سے کرنا چاہیے"

"جو لوگ تقریر شروع کرتے وقت کہتے ہیں "میں معذرت خواہ ہوں ——— میں کوئی مقرر نہیں ——— میں نے تقریر کی تیاری نہیں کی ——— میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں" تو درحقیقت وہ اپنی وقعت کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے کپلنگ اپنی ایک مشہور نظم میں کہتا ہے "آگے بڑھنے سے کوئی فائدہ؟"

یاد رکھئے' جب سامعین ایک بار آپ کی طرف سے توجہ ہٹالیں تو پھر اسے دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے تقریر کا آغاز ہمیشہ کسی ایسے دلچسپ فقرے سے کرنا چاہیے جو سامعین کو اپنی گرفت میں جکڑ لے۔ اگر آپ آغاز میں ہی سامعین کے "دل میں تجسس پیدا کردیں تو یہ کامیابی کی ایک واضح دلیل ہے"

شاید اسی بارے میں البرٹ ہوبرڈ نے کہا تھا۔
"کامیابی کا دارومدار کسی غیرمانوس اور انوکھے کام کی صحیح ابتدا ہے" جس طرح موضوع سے مضمون کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح تمہید سے تقریر کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ یاد رہے' تقریر کے آغاز سے پہلے بھی بعض امور کا لحاظ لازمی ہے۔ مثلاً" مجمع کے شایان شان الفاظ کا استعمال اور تخاطب میں سامعین اور اپنی عمر کا فرق' نیز اپنے اور سامعین کے علم و رشتہ کا فرق وغیرہ۔

درجہ ثانی۔

کامیاب ابتداء کے بعد آپ گفتگو کی مسافت طے کرتے ہوئے روح کلام کو چھونے کی جستجو کرتے ہیں۔ یہ تقریر کا درمیانی حصہ یعنی گفتگو کا مغز ہوتا ہے۔

روح کلام کا مرحلہ تقریر کا سب سے اہم' قابل توجہ' محنت طلب اور دلچسپ حصہ ہوتا ہے۔ اس کے مقصدی پہلوؤں میں سامعین کو اپنا ہم نوا و ہم خیال بنانا شامل ہے۔ جہاں تک ہوسکے اس حصے میں قرآن و احادیث کے حوالے' علمی و ادبی کتابوں کا نچوڑ' اہل دانش کے اقوال' نکتہ آفرینی' منتخب اشعار' سیاسی تجزیہ نگاروں کے بیانات' مفکروں کی آراء اور بذات خود مقرر کے جذباتی پہلو اپنے موقف کے حق میں منطقی ترتیب سے بیان کرنے چاہیں۔ کیونکہ یہ حصہ تقریر کا نچوڑ شمار ہوتا ہے۔

اسی وقفے میں اپنے مدعا کا اظہار اور حدیث دلبری کو فردوس گوش بنایا جاتا ہے۔ بلیغانہ خطاب مدت مدید تک نقرئی گھنٹیوں کی طرح کانوں میں رس گھولتے رہتے ہیں۔ اس دوران لوگوں کی نفسیات کےمطابق ان کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھئے۔ آتش نوائی سے انہیں اپنا ہم خیال بنائیے' ان کی ہمدردیاں حاصل کیجئے' ا جذبات کو بھڑکایئے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں چاہیے لے جایئے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ خطیب کے پاس کوئی ایسا پیغام ہو جسے وہ خود دل وجان سے قبول کرچکا ہو اور اب دیگر افراد کو اپنا ہم سفر بنانا اس کا اولین مقصد بن چکا ہے۔

درجہ ثالث :

میرے خیال میں تقریر کا یہ جزو خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اختتام جس قدر پر زور و پرجوش ہوگا اسی قدر تقریر موثر ثابت ہوتی ہے۔ دنیا کے بلند پایہ اور قد آور خطیب تقریروں کے اختتامی حصے کو سب سے پہلے تیار کرتے رہے ہیں۔ اگر مقرر اختتام کے قریب اپنے پیش کردہ مسائل و نکات کو مخاطبین کے سامنے دہرا دے تو گویا یہ سونے پر سہاگہ ہے۔ تقریر کا اختتام واقعی بڑا اہم مرحلہ ہے۔ مقرر کے آخری الفاظ سامعین کے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔

ڈیسٹر برائٹ اور گلیڈسٹون جیسے نامور مقرر بھی اپنی تقریر کے آخری جملے [illegible] کرتے تھے۔ یک دم یعنی غیر متوقع طور پر یا حیرت طرازانہ انداز میں

تقریر ختم کر دینا حسن بیان کی تمام شوخی اور بانکپن چھین لیتا ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر اول کرزن آنجہانی نے لنکن کی ایک تقریر کے اختتام کو "بنی نوع انسان کی عظمت و خزانہ ——— اور انسانی گفتار کا خاص سونا" کہا تھا۔

اسی تقریر سے متاثر ہو کر کارل سچر لکھتا ہے۔ "کسی امریکی صدر نے اس سے پہلے اس انداز میں لوگوں کے سامنے تقریر نہ کی تھی۔ امریکہ کو پہلے کبھی کوئی ایسا صدر نصیب نہیں ہوا جس کے دل کی گہرائیوں میں ایسے الفاظ پوشیدہ ہوں"

آئرلینڈ کے ایک آنجہانی سیاستدان کے خیال میں "اول جو کچھ آپ سامعین سے کہنا چاہتے ہیں اس کا تعارف کرانے کے بعد کہہ دیں' پھر بتائیں کہ آپ نے انہیں وہ سب کچھ بتا دیا ہے"

جارج کوہان مشورہ دیتا ہے "سامعین سے رخصت ہوتے وقت ہمیشہ انہیں ہنستا ہوا چھوڑ آئیں"

سر ہیری لارڈ موزوں اشعار سے تقریر ختم کرنے کے حق میں ہے۔ تقریر کو اس کے نقطہ عروج پر لا کر ختم کر دینا ایک ہردلعزیز اور سلجھا ہوا طریقہ ہے کیونکہ اسے قابو میں رکھنا اکثر اوقات مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ماہرین فن کے نزدیک کامیاب تقریر وہی کہلا سکتی ہے جس کا اختتام زور دار' معنی خیز اور اثر آفرین ہو۔

پروفیسر ہار نے اسی مفہوم کو اپنے الفاظ میں دہراتا ہے۔

"اگر تقریر کا اختتام موثر نہ ہو تو اچھی سے اچھی تقریر بھی اپنے اثر یعنی نتیجہ خیزی کے لحاظ سے ناکام ہو جاتی ہے"

تقریر کے اختتام کے لئے کوئی مستقل کلیہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو تقریر کی نوعیت پر منحصر ہے۔ ادبی' سیاسی' فکری' مذہبی' الوداعی' اجتماعی' تحریکی' انعامی اور ہنگامی تقریروں میں کافی فرق ہے۔

ایک بین الکلیاتی مباحثے میں کوئی ہونہار طالبہ تقریر کر رہی تھی جب وہ

پابندیٔ وقت کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی تو تنظیم جلسہ نے گھنٹی کے ذریعہ اسے احساس دلایا۔ مقررہ نے ایک خاص ادا سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دلکش انداز میں یہ کہہ کر دفعتاً" تقریر ختم کردی۔

"ساز نہ چھیڑ کہ لذت کا زیاں ہوتا ہے"

آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ فقط ایک برجستہ و موزوں مصرع سے اس نے یہ محفل لوٹ لی۔ اگر ایک طالب علم مقرر کو اسی طرح توجہ دلائی جائے تو وہ مہتمم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باعتبار مناسبت کوئی اور شعر بھی گنگنا سکتا ہے۔

۳

ایک ماہر فن چند معمولی مگر اہم باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے کہ وہ خوبیوں کی داد دینے کے لئے اتنی جلد مائل نہیں ہوتی جبکہ کسی خامی کی پاداش میں بعجلت بیداد پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں فن خطابت کی بالائی حدوں کو چھونے اور ہر دلعزیزی کے لئے اپنی داخلی و خارجی کمزوریوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ چند ایسی باتیں جن سے ہمارے خطاب کا اثر دو چند بلکہ دو آتشہ ہو سکتا ہے' کو ملحوظ خاطر رکھنا لازم ہے۔

خطاب مختصر ہو کہ طویل؟

تقریر کے اختصار یا طوالت کے لئے حد مقرر کرنا صحیح عمل نہ ہوگا۔ اس کا انحصار موضوع خطاب' سامعین کے ذوق' محل وقوع اور ماحول پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

"[illegible] طویل [illegible] اور خطبہ کو مختصر کرنا آدمی کے عقل کی علامت ہے" بسا [illegible] تقریر کی غیر [illegible] طوالت [illegible] کا [illegible] عراقی کے [illegible] میں [illegible] خطاب کے اثر [illegible] ہے۔

بعض جگہوں تقریر کا اختصار تشنگی کا سبب ٹھہرتا اور کہیں چند جملے ہی سامعین کے دل گرما کر رکھ دیتے ہیں۔

حاضر جوابی و ظرافت!

بعض اوقات دوران تقریر میں سوالات بھی اٹھائے جاسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں سامعین کو تسلی بخش جواب دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بصورت دیگر تقریر و شخصیت کے وقار کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ موقع کی مناسبت سے بالعموم یہ کوشش ہونی چاہیے کہ جواب ظرافت آمیز ہو لیکن یا وہ گوئی کا کوئی پہلو نہ نکل سکے۔ مزاح کے ذریعہ سننے والوں کی طبیعت میں تازگی مخالفین کے استدلال میں کمزوری اور تقریر میں اثر انگیزی و دلچسپی بڑھ جاتی ہے لیکن یہ خوبی حاضر جوابی کا ملکہ ہونے کی صورت میں ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ اگر ذہن میں تیزی اور دماغ میں نکتہ رسی نہ پائی جائے تو عموماً" شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔

مقرر کی شخصیت!

واعظ کے لئے اسٹیج کی طرف آتے ہوئے رک رک جانا' شرماتے شرماتے قدم اٹھانا' ابتداً" آواز کا پست ہونا' اثنائے خطاب میں ادھر ادھر دیکھنا' بار بار پانی پینا' انگلیوں کو مروڑنا' میز کا سہارا لینا' کھانسنا' چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہونا' غلط تلفظ ادا کرنا' خارج از بحث مسائل چھیڑنا' لمبے چوڑے فقرے رک رک کر ادا کرنا' نشیب و فراز کا خیال نہ رکھنا' غیر قدرتی اشارے اپنانا اور غیر پارلیمانی الفاظ بولنا' اثر پذیری کے لئے سم قاتل ہیں۔ مقرر کے لئے آداب میں شامل ہے کہ باوقار انداز میں آگے بڑھے' خود اعتمادی سے قدم اٹھائے' زیر لب مسکرائے اور ادائے دلربانہ کے ساتھ سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ملائے۔ ظاہری وضع قطع سے بے نیاز ہونا بھی مضر ہے۔ لباس چاہے سادہ ہو مگر صاف ستھرا ہونا ضروری ہے۔ نئی جگہ جہاں کے لوگ مقرر سے ناآشنا ہوں' ابتدائی لمحات نظر سے وہ خطیب کے ظاہرانہ خوبیوں اور خامیوں پر خاص نگاہ رکھتے ہیں۔

علم النفسیات۔

جہاں ایک مقرر کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی زبان کے قواعد ادب' شاعری' واقفیت عامہ' فنی امور اور مقامی روایات سے آگاہ ہو' اس کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ نفسیات کا مطالعہ رکھے۔ اسے بہر حال یہ علم ہونا چاہیے کہ سامعین کیا چاہتے ہیں اور ان کے دل کس طرح مٹھی میں لئے جاسکتے ہیں؟ عصر حاضر میں دوسرے علوم و فنون کی طرح فن خطابت کے سائنسی تجزیے اور مطالعے کی طرف مکمل دھیان دیا گیا ہے۔ چنانچہ تکنیکی انداز سمجھنے اور دلوں میں گھر کر جانے کے راز پانے کے لئے علم النفسیات سے سوجھ بوجھ ایک کامیاب مقرر کے لئے بہر صورت لابدی ہے۔

مواد کا انتخاب۔

بہترین خیالات کا چناؤ اشد ضروری ہے۔ کیونکہ جو کچھ پڑھا جاچکا وہ سب تو ایک تقریر کے اندر سما سکتا ہے اور نہ ہی ایسا خوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح نقشے کے بغیر کسی عمارت کی بنیاد اٹھانا خلاف دانش ہے بلکہ اسی طرح ایک باشعور خطیب تقریر کا خاکہ تیار کئے بغیر کبھی سٹیج تک نہیں پہنچتا۔

تحریری یادداشت۔

دوران خطاب میں ضبط تحریر میں آئے ہوئے نوٹس سے استفادہ کرنا مقرر اور سامعین کے تعلق کو پر تکلف اور مصنوعی بنا دیتا ہے۔ یہ بات باہمی رفاقت' بے تکلفی اور رشتہ موانست کے برخلاف ہے انداز خطابت اور لہجہ فطری ہونا چاہیے۔ یہ بالکل ظاہر نہ ہو کہ آپ نے تیاری کر رکھی ہے۔

حرکات و سکنات۔

سٹیج پر اداکاری کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ حرکات و سکنات اور اشارے

بالکل بیساختہ ہونے چاہیں۔ ہاتھ پاؤں کو دانستہ ہلانا یا جسم کو ادھر ادھر حرکت دینا مسخرا پن کی علامت بن جاتا ہے۔ ہم ایکشن کی مخالفت نہیں کرتے، مطلب فقط یہ ہے کہ تمام انداز قدرتی معلوم ہوں۔

کرنل گراہم نے اپنی تقریر کی کامیابی کی جو وجہ بیان کی تھی، یہ بغور پڑھنے کے قابل ہے۔

”متغیر چہرہ اور ایکشن ہی سامعین کے دلوں پر اثر کی بجلی گراتے ہیں“

سی ہارٹلے نے اسے یوں ظاہر کیا

”چہرے پر موثر آثار و کیفیات طاری کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ تمہاری زبان سے نکل رہا ہے اور جن الفاظ و واقعات سے سامعین کو متاثر کرنا چاہتے ہو، ان کو سمجھو اور محسوس کرو“

ایک کامیاب مقرر کی خوبی یہ ہے کہ پر جوش خطاب میں نہ صرف اس کی زبان بولتی ہے بلکہ اس کا ہر عضو زبان بن جاتا ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ حرکات فطری اور تصنع سے عاری ہوں، جو غیر فطری دکھاوے پر مبنی نظر آئیں، ان کا ذرا بھی اثر باقی نہیں رہتا۔

ہاتھوں کو جیبوں میں ڈالنا اور کولہوں پر رکھنا پسندیدہ خیال نہیں کیا جاتا۔ ہاتھوں کی حرکات اور انگلیوں کے اشارے سے بھی بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ دو متضاد خیالات و نظریات کو الگ الگ کر رہے ہوں تو ہاتھوں کی مدد سے بھی یہ سلسلہ ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

آواز کا اتار چڑھاؤ۔

ایک درد ناک آواز سے زیادہ کوئی چیز جذبات کو اپیل نہیں کرتی۔ آواز میں جادو ہے کیونکہ یہ پردۂ گوش تک پہنچتے ہی اپنا اثر دکھاتی، خیالات و جذبات کو مہمیز لگاتی اور دل و دماغ کو جگاتی ہے۔ اہل عرب [illegible] آہنگ کی مدح اور پست آواز کی ہجو کیا کرتے تھے۔ عرب کے ایک شاعر [illegible]

”یہ نہایت عجیب بات ہے کہ [illegible] بلا کہ تیری آواز پست

ہے اور تیرا دم چڑھنے لگا ہے"

ہم بھی ریاضت و احتیاط سے اپنی آواز میں موسیقیت پیدا کرسکتے ہیں۔ جہاں دلائل کی تشریح مطلوب ہو وہاں آہستگی لازم سمجھو اور جس مقام پر اظہار جوش کی تمنا ہے وہاں آواز کو تیز کرلیجئے۔ ہر فقرے کو آواز کے موزوں اتار چڑھاؤ سے ادا کرنا اور اسی مناسبت سے ادا کرنا جس مناسبت سے لکھنے یا بولنے والے نے لکھا یا بولا ہو۔ واس کے ایک قانون دان "بیری" کا اعتراف ملاحظہ کریں۔

"میں ایک بہت اچھا مقدمہ اس وجہ سے ہار گیا کہ میں نے بحث بلند آواز سے شروع کی اور اس کی وجہ سے میرا دماغ بہت جلد تھک گیا اور میرے قوئ دماغی بالکل معطل ہوگئے، میں باوجود کوشش کے اپنی آواز کو پست نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں مقدمہ ہار گیا"

اس بارے میں ہارٹلے کا یہ مشورہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

"روزانہ ناولز نئے پڑھو یا روزانہ تقریر کرو مگر شروع میں آواز کو اوسط درجہ پر استعمال کرو۔ رفتہ رفتہ اس کی بلندی کے درجے کو اونچا کرتے جاؤ یہاں تک کہ تمہاری آواز اس بلند درجہ پر پہنچ جائے جہاں سے اگر تم اپنی آواز کو اور اونچا لے جاؤ تو تکان بھی ہو اور آواز پر زور بھی پڑے، اس بلندی پر پہنچ کر ٹھہر جاؤ اور آواز کو بلند سے بلند لے جانے اور تھکانے کی غلطی نہ کرو۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ آواز کے درجے کو پست کرنا شروع کرو یہاں تک کہ تمہاری آواز اس جگہ پر آجائے جہاں سے تم نے اسے بلند کرنا شروع کیا تھا۔ روزانہ کی مشق صرف اس قدر ہونی چاہیے کہ آواز میں تکان کے آثار پیدا نہ ہوں کیونکہ آواز کو تھکانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو آواز کے استعمال کے سرے سے مشق ہی نہ کرنے کا ہوتا ہے"

ہارٹلے نے غذا کے متعلق بھی بعض مفید آراء دی ہیں۔

"وہ چیزیں نہ کھاؤ جن کے متعلق تجربہ تمہیں یہ بتائے کہ وہ تمہارے حلق [illegible] کرنے والی ہیں [illegible] آواز اور حلق کو صاف کرنے کے لئے ایسی

دوائیں بھی استعمال نہ کرو جو وقتی طور پر مفید مگر مستقل طور پر مضر ثابت ہوں"
اس سلسلے میں ایک ماہر فن کے خیالات کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

"ایک خوبصورت بلند آہنگ آواز قابل رشک چیز ہے۔ کوشش کرکے اور متواتر مشق سے آواز کی درشتی دور کی جاسکتی ہے۔ بولتے وقت ایسے تمام اعضاء کو پوری طرح استعمال کریں جن سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً" دانت' منہ' ہونٹ' گلا' ناک اور پھیپھڑے کسی بھی موقع پر "دھاڑنا" غیر اہم ہے"۔

خطابت اور زبان ۔

مولانا کوثر نیازی صاحب جو خود بھی ایک اچھے مقرر ہیں' نے اس پہلو پر حاصل سیر روشنی ڈالی ہے۔

"خطابت کے لئے چونکہ زبان کی صحت شرط اول ہے اس لئے خطیب جس زبان میں کلام کرنا چاہتا ہے اسے اس زبان پر بھی کامل عبور ہونا چاہیے۔ اس کا تمام جدید و قدیم ذخیرۂ ادب اس کی نگاہ میں ہو۔ میں نے بہت سے مشہور مقررین کو دیکھا ہے کہ وہ اشعار تک غلط پڑھتے ہیں اور اس طرح ان کی تمام علمیت اور فضیلت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور سخن شناس لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ شخص جو ادبی ذوق کی لطافت سے مالا مال نہیں اچھا خطیب نہیں ہوسکتا۔ جتنے بھی بڑے خطیب گزرے ہیں' ان سب میں یہ ذوق بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر بعض دوسری خوبیوں کے باعث اس کی کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی مقرر داد خطابت دینا چاہتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ دوران تقریر اشعار بھی استعمال کرے"

"ایک اچھے مقرر کے لئے مضحکہ خیز لباس' تکیہ کلام' غیر ضروری تکرار اور سوقیانہ انداز بیان سے اجتناب بہت ضروری ہے"

"اچھی تقریر کے لئے صحت تلفظ ایک اہم تقاضا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں نے سیرت کے موضوعات پر ڈھائی تین تین گھنٹے تقریر کی ہے اور اس اثناء میں کبھی کوئی لفظ پر تول کر میرے سامنے آگیا ہے کہ اسے استعمال کروں مگر مجھے

یہ تسلی نہیں ہوئی کہ اس کا حقیقی تلفظ کیا ہے۔ یہ زیر کے ساتھ ہے یا زبر اور پیش کے ساتھ ہے تو میں نے اس شک کی بناء پر اسے استعمال نہیں کیا اور اس کی جگہ اسی سے ملتا جلتا کوئی دوسرا لفظ استعمال کرلیا ہے۔ بعد میں ہمیشہ ایسے لفظوں کے لئے میں نے لغت کی ورق گردانی کی۔ اہل زبان سے پوچھا اور جب مکمل اطمینان ہوگیا' پھر کہیں جاکر اسے اپنے ذخیرۂ لفظی میں جمع کیا"

شمعِ راہ!

- جب آپ تھکے ہوئے ہوں تو تقریر نہ کریں نیز خطاب سے قبل ہلکی پھلکی غذا کھائیں۔
- لباس صاف ستھرا اور جاذب نگاہ ہونا چاہیے۔ اس سے آپ کی اپنی نظروں میں بھی عزت اور وقار بڑھ جاتا ہے اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔
- مسکرائیں' نفسیاتی زاویہ کے مطابق مسکرانے سے آپ سامعین کے دلوں میں اتر سکتے ہیں۔
- کسی میز یا کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر تقریر نہ کریں اور ہاں فالتو چیزیں سٹیج سے ہٹوا دیں
- کسی مزاحیہ کہانی سے تقریر کا آغاز ہرگز نہ کریں اور ابتداء میں کسی قسم کی معذرت کا اظہار بھی نہ کریں۔
- تجسس اور دلچسپی کو بہر صورت بحال رکھیں۔
- دوران تقریر میں سامعین کو جھنجوڑنے کے لئے ان سے مختلف سوال کرتے رہیں۔
- لوگوں کی داد و تنقید پر ضرورت سے زیادہ توجہ نہ دی جائے۔
- خطابت کے دوران مستقبل میں جھانکنا۔حکومت کرنے کے مترادف ہے۔
- اپنے مطالب کی توضیح کے لئے دیگر نظریات سے موازنہ کریں۔

- خیالات بلند' اثر انگیز' پاکیزہ اور منافع بخش ہوں۔
- ایک نشست میں صرف ایک یا دو موضوعات پر بحث کیجئے۔
- سامعین کی تعریف کریں اور ان کے لئے دل کھول کر تفریح کا سامان مہیا کریں۔
- سیاسی تقریروں میں دلچسپ مخالفانہ جملوں' معیاری تنقید' اعداد و شمار کے ثبوت اور عظمت کردار سے بڑھ کر کامیابی کی کوئی اور ضمانت نہیں ہو سکتی۔
- اپنے مقصد سے اخلاص اور عملی جدوجہد لازم ہے۔
- آپ کے خیالات محض عقل کے تابع نہ ہوں بلکہ ان میں سچے اور مخلصانہ جذبات کی جھلک بھی ہو۔



اقسام تقریر

- بلحاظ تیاری
- بلحاظ عنوانات

ا

اہل فن نے خطابت کی دو صورتیں بیان کی ہیں اور پھر ان کے بارے میں الگ الگ اظہار خیال فرمایا ۔ تقاریر کے یہ دو روپ مندرجہ ذیل ہیں۔

- فی البدیہہ
- تیار شدہ

فی البدیہہ تقریر سے مراد ایسی تقریر ہے جو عین موقع پر بغیر کسی سابقہ اطلاع یا تیاری کے کسی جلسے وغیرہ میں پیش کی جائے۔ بہرحال فی البدیہہ تقریریں صرف انہی مقرروں کی کامیاب ہو سکتی ہیں جو مطالعے کے رسیا' مشق کے پابند' واقفیت عامہ کے متلاشی' شعر و ادب کے پرستار اور حافظے کے تیز ہوں۔ لیکن اس قسم کی تقریر کو غیر معمولی اہمیت دینا قرین دانائی نہیں۔ ایسے موقعوں پر میں نے بڑے نامی مقررین کو لچر زبان استعمال کرتے دیکھا ہے' اس لئے کہ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہوا کرتا۔ غیر شائستہ حرکات اور اخلاق سے گرے ہوئے الفاظ و محاورات' بے تکی تنقید' الزامات اور گالیاں اسی کی زبان سے ادا ہوتی ہیں جس کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔

مشہور خطیب شریڈن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی تقریر کو اس قدر حفظ کرلیا کرتا تھا کہ عام طور پر کوئی شخص اس کی تقریر کو رٹی ہوئی ہرگز نہیں سمجھ سکتا تھا۔

جادو بیان کینگ کہا کرتا تھا ——— "دوستو! الہام کا زمانہ گزر گیا' میری جادو بیانی میری یادداشت پر منحصر ہے"

کہتے ہیں کہ لارڈ میکالے بھی اپنی تقریر کا ہر لفظ یاد کیا کرتا تھا ——— اور الیگزنڈر ہیلٹس (نامور وکیل) اپنی بحث کو لکھ کر حفظ کرلیا کرتا تھا ——— ڈاکٹر بلیر کی یہ نصیحت شمع راہ ہے۔

"پہلے اپنی تقریر کو لکھو' پھر اس پر نظر ثانی کرو' اسے مختصر کرنے کی کوشش کرو' اس کے بعد اس کو اتنی مرتبہ پڑھو کہ خاص خاص حصے اچھی طرح یاد ہو جائیں اور کل تقریر کے اہم نکتے اس طرح ذہن میں محفوظ ہو جائیں کہ حافظے سے ان کے محو ہونے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ اس کے بعد یا تو ایک خیالی مجمع کے سامنے تقریر کرو یا کسی صاحب نظر دوست یا صاحب فن کو اپنی تقریر سناؤ"

مشہور ہے کہ بوسوٹ کو جس روز لیکچر دینا ہوتا وہ اس سے ایک دن پیشتر دلائل کو نوٹ کر لیا کرتا اور دل ہی دل میں کئی بار دہراتا تھا ——— ویبگٹ چند پرجوش فقرے قبل از وقت تیار کرتا اور دوران خطاب ان کا استعمال کیا کرتا تھا۔ پروفیسر ہارنے کا مشورہ بھی نہایت مفید اور قابل قدر ہے

"اپنی ابتدائی تقریروں کے سلسلے میں تقریر کے طالب علم کو زیادہ سے زیادہ تیاری کرنی چاہیے اور اپنے دلائل کی ترتیب پہلے سے قائم کر لینی چاہیے۔ ساتھ ہی تقریر کے اہم اہم نکات بالخصوص افتتاحی و اختتامی حصے لکھ لینے چاہئیں"

قد آور خطیب اور صاحب طرز ادیب بائیس' یادداشت کی مدد سے تقریر کرنے والوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"تحریر گویا کہ سان کا پتھر ہے یا یوں سمجھو کہ وہ ایسی مشین ہے جس کے دباؤ سے خیالات میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اگر تمہارے پاس تیاری کا وقت ہے تو اپنی تقریر میں جو کچھ کہنا چاہتے ہو اس کی ترتیب کا نقشہ پہلے سے کاغذ پر ضرور قائم کر لو' اس طرح اپنے موضوع پر زیادہ اچھی طرح قابو حاصل کر لو گے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ زیادہ جامعیت کے ساتھ تقریر کر سکو گے اور موضوع سے ادھر ادھر بھٹکنے کا خطرہ بہت کم ہو جائے گا"

مشاہیر خطابت کے مندرجہ بالا اقوال کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یادداشت کی مدد سے کل تقریر پڑھ دی جانی چاہیے۔ ایک دفعہ مسٹر براڈسٹ سے کسی طالب علم نے سوال کیا کہ لکھا ہوا پڑھنا' رٹ کر تقریر کرنا یا یادداشت کی مدد سے تقریر کرنا' ان [illegible] سے کون سا بہتر اور [illegible] براڈسٹ نے جواباً کہا

"مجھ کو اپنی تقریر لکھنے کی عادت نہیں، لکھنے کی عادت بہت زبوں ہے اور حفظ کرنے کی محنت ناقابل برداشت، یہ کافی ہے کہ مضمون زیر تقریر پر غور کیا جائے اور مختصر یادداشت لکھ لی جائے"

تقریر کی تیاری کے حوالے سے برنارڈشا مکمل آزادی کے قائل ہیں۔

"میں وہی کرتا ہوں جو مجھے آسان نظر آتا ہے۔ ہر شخص کو بھی چاہیے کہ وہ اسی کام کو کرے جو اس کے لئے آسان ہو۔ لیکن اکثر لوگ ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جو مشکل اور ناممکن ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ناکام رہتے ہیں"

الغرض و بسٹر نے برملا کہا تھا۔

"نامکمل تیاری سے حاضرین کے سامنے تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے آدھا لباس پہن رکھا ہو"

"مکمل تیاری کیسے کہتے ہیں؟" کے عنوان سے ڈیل کارنیگی نے ایک مستقل باب باندھا ہے ان کے یہ خیالات حد درجہ توجہ طلب اور قابل مطالعہ ہیں۔

"کیا تقریر کی تیاری اسے کہتے ہیں کہ چند بے عیب جملے لکھ لیے یا یاد کر لیے جائیں؟ ہرگز نہیں کیا تقریر کی تیاری یہ ہے کہ چند ایسے خیالات مربوط کر لیے جائیں جن میں آپ کی ذات بہت کم دکھائی دے؟ بالکل نہیں، تقریر کی تیاری کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے خیالات اور اعتقادات میں باہم ربط ہو۔ یہ خیالات اور اعتقادات آپ کے ذاتی ہوں ان کا وظن آپ کی روز مرہ زندگی سے ہو۔ آپ کے خوابوں کی بھی ان میں جھلک آئے۔ آپ کی ساری زندگی، تجربات اور محسوسات کا مجموعہ ہے۔ یہ چیزیں آپ کے لاشعور میں اس طرح پڑی ہیں جیسے ساحل بحر پر کنکروں کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں۔ تیاری کا مطلب ہے سوچنا، غور کرنا، پرانی یادداشتوں کو کھودنا، ایسی چیزوں کا انتخاب کرنا جن سے آپ زیادہ متاثر ہوں، ان کی نوک پلک درست کر کے انہیں ایک مضمون سا [illegible] بنا لینا۔ یہ کوئی مشکل پروگرام نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کے لئے تھوڑی سی توجہ

اور پر مقصد سوچ کی ضرورت ہے۔"

ایک صاحب نے وطن عزیز میں فن تقریر کے چند اہم ستونوں سے تاثرات لئے۔ ماسوائے چودھری رفیق احمد باجواہ ایڈووکیٹ (سابق جنرل سیکرٹری پاکستان قومی اتحاد) کے تمام ماہرین نے تیاری کی اہمیت پر خاص زور دیا جب کہ باجواہ صاحب نے "تقریر میں نفس مضمون کو کیا حیثیت حاصل ہے؟" کے جواب میں کہا "کچھ بھی نہیں مضمون کو نفس ناطق مہیا ہی مقرر کرتا ہے" اور یہ کہ میں تقریر تیار نہیں کرتا کیونکہ تیار شدہ تقریر تاثیر کھو بیٹھتی ہے۔

یہ تسلیم کئے بغیر بہر حال چارہ نہیں کہ حرف بحرف حفظ شدہ تقاریر جگ ہنسائی کا موجب بھی بن سکتی ہیں۔ ویسے بھی اس نوع کے خطاب میں طرز بیان' تلفظ اور رفتار کا بطور خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ نیز کوئی نو مشق جب ایسی تقریر کرے تو یوں لگتا ہے جیسے ایک بچہ رٹی رٹائی نظم پڑھ رہا ہو۔ ایسی تقریریں عوام پر گراں گزرتی ہیں جس کا نتیجہ عوام کی بے توجہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نو آموز کی ہمت شکنی کا باعث بن جاتا ہے۔ لہٰذا مقررین پر لازم ہے کہ وہ اپنے سامعین کو کسی صورت یہ محسوس نہ ہونے دیں کہ ان کی تقریر حفظ شدہ ہے علاوہ ازیں اگر دوران تقریر کوئی حصہ (حافظے) سے اتر جائے تو ایسی صورت میں بدحواس ہونے کے بجائے زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ دوران تقریر کسی وجہ سے رکنا پڑے تو درمیانی وقفے کو کسی مناسب جملے سے پر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً" میں آپ سے عرض کر رہا تھا۔ اب میں آپ کی توجہ اپنی تقریر کے جزو دوم کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں۔

القصہ مختصر کوئی ایک کلیہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص کو اپنی استعداد [illegible] ذہنی مناسبت اور قوت یادداشت کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی ایک موزوں طریقہ [illegible] چاہیے۔ ہم میدان خطابت میں تیاری کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ماہرین [illegible] سب سے [illegible] قرار نہ [illegible] ہیں۔ [illegible] مشکل ہے۔ تاہم تیار [illegible]

کے جملہ پہلوؤں کو اچھی طرح زیر غور لانے' حوالہ جات دہرانے' آغاز و انجام کو ذہن نشین کرنے' موضوع سے اہم نکات واضح کرنے' ان نکات سے خیالات نو پیدا کرنے' مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ناقدانہ جائزہ لینے' حالات و واقعات کو مناسب ترتیب دینے' معیاری مواد کو جمع کرنے اور قوی دلائل کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کے لئے مناسب وقت موجود ہوتا ہے۔ نامور مقرر بغیر تیاری کے تقریر کو حماقت و جہالت قرار دیتے ہیں۔

اساتذہ فن کے نزدیک تیار شدہ تقریر کا مفہوم یہ ہے کہ مقرر کو عنوان تقریر' مقام تقریر' عرصہ تقریر' نوعیت تقریر' مقصد تقریر' پس منظر و پیش منظر تقریب' میر مجلس' تعداد سامعین و حاضرین اور ان کی علمی استعداد و فنی صلاحیت وغیرہ سے کسی نہ کسی حد تک بہر حال آگاہ ہونا چاہیے۔ تقریر کی تیاری سے گریز کرنا کسی طور پر مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ ماہرین فن نے اس کی سفارش کی ہے۔ یہ طریق کار کسی نامور خطیب کے وقار اور شخصیت کے بھی منافی نہیں بلکہ اس کی عزت و عظمت دو چند کرنے کا ذریعہ ہے۔ دنیا کے تمام کامیاب مقررین اپنی تقریریں بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کرتے تھے۔ تقریر کے لئے تیار نہ ہونا گویا ایک قسم کی مہلک غلطی کا ارتکاب ہے۔ بہر حال ایک کامیاب مقرر بننے کی جدوجہد میں یہ چار چیزیں بڑی اہم ہیں۔

۱۔ ثابت قدمی سے آغاز
۲۔ موضوع سے متعلق مکمل واقفیت
۳۔ جرات اور خود اعتمادی
۴۔ مشق' مشق اور مشق

ڈیل کارنیگی کا کہنا ہے ایک اچھے مقرر کو تقریر کے اختتام پر "مجھا" اس کے چار عکس نظر آتے ہیں۔ پہلا عکس وہ تقریر ہے جو اس نے تیار کی تھی۔ دوسرا عکس وہ تقریر ہے جو اس نے لوگوں کے سامنے پیش کی تھی۔ تیسرا عکس اس تقریر کے متعلق تبصرے ہیں۔ چوتھا عکس وہ رد عمل ہے جو گھر واپس آتے وقت اس کے

ذہن میں ابھرتا ہے کہ اے کاش اس نے اس طرح تقریر کی ہوتی"

۲

فن اور مقاصد کے لحاظ سے تقریر کی اقسام بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً" سیاسی پروپیگنڈہ' مذہبی تبلیغ' احتجاجی پروگرام' شعر و ادب کی تشہیر' تعزیتی جلسے' قومی تقریبات' مباحثے' الوداعی خطاب' ضیافتی مواقع' نشری تقریر' تربیتی نشست' افتتاحی سلسلے' پریس کانفرنس' تقریب رونمائی' سپاسنامہ' قراردادیں اور امدادی کیمپ۔

خواہ کسی موقع کی تقریر ہو سب سے اہم ذمہ داری اسٹیج سیکرٹری کو نبھانا ہوتی ہے اور کوئی بھی پروگرام اسی صورت میں توجہ کا مرکز بن سکتا ہے جب کہ سٹیج کا نشریہ سامعین کے پردۂ سماعت سے ٹکرا کر خوشگواری کا تاثر جما سکے۔ اگر اسٹیج سیکرٹری کامیاب ٹھہرا تو تقریب بطریق احسن پایہء تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ایک ناتجربہ کار اور کم علم شخص کسی بھی پروگرام کا بیڑہ غرق کر دیتا ہے۔

ہم اسٹیج سیکرٹری کو کسی بھی جلسے یا تقریب میں ریڑھ کی ہڈی کہہ سکتے ہیں۔ یہ فرد تازہ ترین معلومات کا پیکر' جوش اور ہوش کا امتزاج' حاضر جواب' دلکش شخصیت کا حامل' علم النفسیات سے آگاہ اور اداکارانہ صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیے اس پر لازم ہے کہ باقاعدہ کاروائی سے قبل تقریب کے بارے میں مختصراً تعارفی کلمات کہے۔ حس مزاح تیز ہونی چاہیے اور روتے ہوؤں کو ہنسانے اور ہنسنے والوں کو رلانے کا فن جانتا ہو۔ زیادہ دیر تک مقررین اور سامعین کے درمیان حائل رہنا بھی ناپسندیدہ عمل ہے۔ یونہی لمبے واقعات اور شخصی تجربات سننے سے مجمع اکتانے لگتا ہے۔ اسے شعوری طور پر اپنی علمیت و قابلیت کا سکہ [illegible] نہیں [illegible]۔ پروگرام کی شان و شوکت بڑھانے کے لئے تمام ممکنہ [illegible] بروئے عمل ہے۔ کمال حسن و خوبی معزز مقررین کو سنجیدہ تعارفی مرحلے [illegible] نشست گاہ پر بلائے اور [illegible]۔ اسٹیج سیکرٹری بھی

متکلمانہ قابلیت امر ناگزیر ہے کہ وہ حسب موقع سامعین کو چپ کرانے اور تالیاں بجانے پر آمادہ کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ ناظم نشر گاہ اسی صورت میں کامیاب کہلا سکتا ہے اگر وہ خود داری' غیر جانبداری اور نفاست کا مرقع ہو۔ اسے بہر حال کسی پاکٹ سائز نوٹ بک یا ایک سادہ کاغذ پر اشارات قلمبند کر لینے چاہئیں۔ تلاوت ' نعت ' ترانہ' نظم اور تقریر سے پہلے موزوں اشعار یا اقوال زریں سے سامعین کو متاثر کرنے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ ایک مستحسن قدم ہے۔ اناؤنسرز اپنے فن میں دستگاہ کے لئے تجربہ کار لوگوں کو سنیں۔ کھیلوں میں کمنٹری اور ریڈیو' ٹیلی ویژن کو ملاحظہ کرنے میں بھی ہزار فائدہ ہے۔

سیاسی و انتخابی تقریروں میں عموماً" اپنے مخالف جماعتوں اور امیدواروں پر تابڑ توڑ حملے کرنا معراج خطابت سمجھا جاتا ہے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سیاسی منشور اور جماعت و شخصیت کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے۔ ابتذال سے گریز اور ظرافت کی چاشنی لازم ہے۔ اگر بات تعمیری تنقید اور اخلاقی دائروں سے بڑھ جائے تو عوام اسے افترا سمجھتے ہیں۔ ذاتیات پر اتر آنا کم ظرفی اور اخلاق باختگی کا ثبوت ہے۔ مگر انداز بیان دلکش' عوامی اور عام فہم استدلال سے آراستہ ہو تو زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔

مذہبی واعظ کی لاتعداد شاخیں ہیں۔ ان کا مقصد روحانی ترقی اور باطنی طہارت ہوا کرتا ہے۔ سیرۃ النبیؐ کا جلسہ ہو یا عاشورۂ محرم کا۔ محفل ذکر ہو یا کوئی مناظرہ' کسی بزرگ ہستی کا یوم ولادت و وصال' مذہبی تہوار اور عرس وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ یہ مواقع عام تقاریر کے نہیں ہوتے۔ ان میں الفاظ سبک و شیریں' دل نشیں و دنی اور انداز خطابت پر اثر و پر درد ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے اس کے لئے موضوع سے متعلق گہرے غور و تدبر اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل میں خلوص ہو تو زبان میں [illegible] محافل میں اظہار گفتگو ہر اپنے پہلے تقریر کے کا [illegible] موضوعات ہو سکتے ہیں اس پر بات [illegible] کے لئے علم و فضل کی دولت [illegible]

احتجاجی تقریبات کا مقصد محض اشتعال دلانا اور بھڑکانا ہوتا ہے۔ اپنے مطالبات پیش کئے جاتے اور بزور طاقت منوانے کا آوازہ بلند کیا جاتا ہے۔ لوگوں کو توڑ پھوڑ، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت اور کسی طرح بھی قانون شکنی پر راغب کرنا غیر ذمہ دارانہ فعل اور جرم ہے۔ جذبات کے ہاتھوں کھلونا بن جانا حماقت اور روح خطابت کے منافی ہے۔ جوش کو ہوش کے تابع رکھنا اور معقول طریق سے معاملہ نپٹانا ہی اصل جوہر ہے۔

تعزیتی، ضیافتی، الوداعی، ترغیبی اور افتتاحی تقریبات میں موقع کی رعایت سے کلام کرتے ہیں سپاسنامہ، قرارداد، پریس کانفرنس، امدادی کیمپ اور رسم نقاب کشائی کے مواقع ایک علیحدہ تکنیک کا تقاضا کرتے ہیں۔

ادبی تقریر، فن خطابت کا ایک اہم حصہ ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اختلاف رائے کا لازمی نتیجہ مباحثے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مناظرہ بھی مباحثے کی ایک شاخ ہے۔ بادی النظر مباحثوں کی دو اقسام ہیں۔

۱ ترغیبی

۲ انعامی

عام مباحثے جو عوام کی معلومات میں اضافے کے لئے ہوں انعامی لیکن جوش کے لئے منعقد ہوں تو ترغیبی کہلاتے ہیں۔ عنوان کی تائید میں بولنے والا، محرک کہلاتا ہے۔ سب سے اول جو مقرر موضوع کے حق میں خیالات ظاہر کرے گا اسے ہی مباحثے کے آخر میں مخالفین کے دلائل کا توڑ پیش کرنا ہوتا ہے۔ ایک تو قرار داد بحث کی موافقت یا تائید میں جواب لوٹاتا جبکہ دوسرا مخالفین کی دلیلوں کا رد ڈھونڈتا ہے۔ مباحثوں کے لئے مواد، مطالعہ کی نسبت کہیں زیادہ غور و فکر سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثالیں روز مرہ ہوں۔ اختتام پر سارا خلاصہ بیان کر کے اپنے دعویٰ کا مکرر اعلان کرنا نہایت اہم ہے۔

اپنے مخالف کے قابل گرفت نکات کو کاغذ کے پرزے پر یا حافظے میں محفوظ رکھیں تاکہ آپ اعتراضات کا رد پیش کر سکیں۔ ذخیرۂ معلومات، اشعار کا برملا

استعمال، آواز کا طنطنہ، طنز و مزاح کی پھوار، تکرار کا لفظی جادو، حسن بیان کا کرشمہ، حرکات و سکنات کی کشش، خود اعتمادی کا تاثر اور شخصی مقناطیسیت بڑا وزن رکھتی ہیں۔ مباحثوں میں نفس مضمون، طرز ادائیگی، حسن تلفظ، لب و لہجہ، زبان دانی اور قوت اظہار وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر آپ میدان خطابت میں کمال چاہتے ہیں تو انفرادیت، تمثیلات، تجربہ، ظرافت، استدلال، متانت، اسلوب، تکنیک، خود اعتمادی اور سلاست و اشارات میں مقام پیدا کیجئے۔

نثری اور عام تقاریر میں چند پہلو ما بہ الا متیاز ہیں۔ ان میں تلفظ، رفتار، طرز بیان اور حسن سماعت نمایاں ہیں۔ ہر جملے کے بعد چند سیکنڈ کا وقفہ مفید ہے۔ ایک سامعین کو خیالات و نظریات قبول کرنے میں آسانی، دوسرا خود خطیب کو نئے جملے کے شروع کرنے، ربط کا خیال رکھنے اور مناسب لب و لہجہ اختیار کرنے میں سہولت رہتی ہے۔

تعزیتی قسم کی تقریروں میں عام طور پر پانچ نکات کا خیال رکھا جاتا ہے۔

۱۔ تمہید

۲۔ خدمات کا اعتراف

۳۔ اظہار تعزیت

۴۔ پسماندگان کو تسلی

۵۔ دعا ــــــــ وغیرہ

قصہ مختصر ہر قسم کی تقریر کے دوران اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ ہر سمت اور ہر سطح کے سامعین ہمارے مخاطب ہیں۔ تقریر وہی اچھی ہے جو ہر طبقہ، ہر عمر اور ہر مرتبہ کے لئے یکساں اثر پذیر ہو۔



شعلہ و شبنم

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آج سے چودہ سو سال پہلے کائنات گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں مستور تھی۔ ہر طرف جبر و تشدد کی ژالہ باریاں مصروف تباہی تھیں۔ محیط زیست' کفر و الحاد کی صاعقہ کے تصرف میں' اور سینہء فرش' وحشت و بربریت کی صرصر کی لپیٹ میں تھا۔ درندگی و بہیمی کی مسموم فضا میں حق پرستی و پرہیز گاری ناپید ہو چکی تھی۔ صنف نازک کی عصمت کا کوئی محافظ نہ تھا۔ تا حد نظر کشتگان ستم امراء کی حرماں نصیبی کا ماتم ہو رہا تھا۔ ہر طرف آلام و مصائب کے بگولے محو رقص تھے۔ صبح و شام' غرباء و فقراء کے سروں پر ظلم و تعدی کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ سوزش داغہائے پنہاں سے کوئی آشنا نہ تھا۔ نوائے سوختہ در گلو کا کوئی راز دار نہ تھا۔ فراعنہ کی بالادستی کو مدت ہائے دراز گزر چکی تھی۔ جہاں تک نظر پڑتی کشت و خون' درندگی و حیوانیت اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔ انسانی عقائد ضعف و اضمحلال کا شکار ہو چکے تھے۔ چار سو ہوس ہائے نفسانی کی حکومت تھی۔ گویا کفر و ضلالت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا طوفان تھا جس کے تند و تیز تھپیڑوں میں انسانیت کی شکستہ ناؤ ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس بلائے عظیم میں گرفتہ' مدت ہائے دراز سے کسی نجات دہندہ کے منتظر تھے۔ ستم رسیدہ لوگوں کی نگاہیں دور کہیں دور افق میں کھو گئی تھیں۔

آخر خالق کائنات کو سسکتی ہوئی انسانیت پر ترس آیا۔ رب کعبہ نے رشد و ہدایت کے اس آفتاب عالمتاب کو افق فاران پر طلوع فرمایا۔ وہ آفتاب صداقت جو ختم المرسلین ہے' جو رحمتہ اللعالمین ہے' شافع المذنبین ہے' نور المحسن ہے جو اول و آخرین ہے اور اسلام جس کا دین ہے۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں' وہی فرقاں' وہی یٰسین وہی طٰہ

رسول عربیؐ کیا آئے' کائنات میں انقلاب آگیا۔ یاس و قنوطیت سے پژمردہ

چہرے پر امیدوں کی بہار آئی۔ حلقۂ ظلمت کدہ، شمع رسالت کی ضیا باریوں سے مستنیر ہوا۔ قتل و غارت اور خوف و ہراس کی آندھیاں تھم گئیں۔ صنم ہائے خود تراشیدہ ریزہ ریزہ ہو گئے۔

عرب و عجم کے ایوان ہائے عیش و طرب منہدم ہونے لگے۔ وادیٔ خزاں میں گل ہائے رنگارنگ کھلے۔ صدق و صفا اور عدل و انصاف نے جنم لیا۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی کا امتیاز اٹھ گیا۔ قدیم روایات کی آہنی زنجیریں موئے آتش دیدہ کی طرح کٹ گئیں اور تیرہ خاکدان کا ذرہ ذرہ رشک انجم بنا۔ دانائے رسالت کی ضیاء پاشیوں سے گمراہی و ضلالت کی سیاہی دھل گئی۔ رسول ہاشمیؐ نے جہان قلب و نظر کو شرک و کفر کے خس و خاشاک سے مبرا و منزہ کر کے توحید و رسالت کا گہوارہ بنا دیا۔ اور بادیۂ ضلالت میں بھٹکنے والوں کو منہاج حق پر گامزن کر دیا۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے!
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

رسالت پناہؐ کے قدوم میمنت لزوم نے پتھروں کو باوقار بنا دیا۔ آپ کی تبسم زائیوں کے آگے گوہر گرانمایہ کی آب و تاب بھی بے وقعت ٹھہری۔ ان کی گرد راہ دنیا کے حسینوں کو سرمے کا کام دے گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ریگستان عرب کے بدو آپ کی قیادت میں صفحہ ہستی پر چھا گئے۔

بحر رسالتؐ میں غواصی کر کے عثمان غنیؓ ذوالنورین بنتے ہیں تو کہیں عمرؓ کی وفا شعاریاں انہیں فاروق اعظمؓ بنا دیتی ہیں۔ درس رسالتؐ میں کوئی صدیق اکبرؓ بنتا ہے تو کسی کو حیدر کرارؓ بنایا جاتا ہے۔ اویس قرنیؓ اپنے دندان توڑ کر مولائے کائنات سے ارادت کیشی کا ثبوت دیتے ہیں تو کرسیاں ان کے طواف کے لئے مضطرب ہو جاتی ہیں اور اگر محمد عربیؐ کے عشق میں بلال حبشیؓ حوران فردوس کو ٹھکرا دیتے ہیں تو ان کی خاک کف پا چشم حور کے لیے سرمہ بن جاتی ہے۔

ابوجہل اور ابولہب اگر رسول ہاشمیؐ سے متعلق کیسا کن عزائم کا اظہار کرتے ہیں تو فطرت انہیں ہلاکت کے [illegible] ہے اور انہیں [illegible]

آپ کی حیات طیبہ کا گوشہ گوشہ، فکر و عمل کا لمحہ لمحہ اور کتاب زیست کی ایک ایک سطر آفتاب و ماہتاب سے تابندہ تر ہے۔ آپ کی زندگی کے روز و شب اور قول و فعل ہمارے لیے نمونہ، اور اسوۂ حسنہ ہمارے لیے باعث نجات ہے۔

آپ کی ذات خوبی و کمال کا مجموعہ اور شخصیت جامع صفات کا مرقع ہے۔ اسی لیے تو خالق کائنات نے فرمایا:

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ"

خیر الامم کی سیرت و کردار ایک مکمل کتاب ہے۔ ہر شخص اس کا مطالعہ کرکے اپنے قلب و نظر کو روشن کرسکتا ہے۔ تاجور ہو یا کوئی سخن ور، امیر ہو یا فقیر، بندہ ہو یا آقا، خطیب ہو یا طبیب، کوئی ماہی گیر ہو یا عالمگیر، ریوڑ بان ہو کہ شتربان، حتیٰ کہ حاکم و محکوم، محتاج و غنی ہر ایک کے لئے آپ کی سیرت مشعل راہ ہے۔ امراء آپ کی سیرت سے سبق حاصل کرنا چاہیں تو رسول اکرم کو خطہ ہائے عرب کے خزانوں کا والی اور مکہ کے تاجر کی حیثیت سے دیکھیں۔ غرباء آپ کو شعب ابی طالب اور ہجرت کے موقع پر دیکھیں۔ بادشاہ اور حکمران بھی سلطان عرب کے کردار سے فیض یاب ہوسکتے ہیں۔ فاتحین اور سپہ سالار غزوات بدر و حنین کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں کوئی اور ایسا انسان کامل نہیں ہے۔ جس کی زندگی اتنی ہمہ صفت اور ہمہ گیر ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے سلاطین، دانشور، اطباء، علماء، فلسفہ دان اور ماہر نفسیات آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے نظر آتے ہیں۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ کی چشم مہر جھک جائے تو حیا، اٹھے تو دعا، ترچھی ہو تو ادا، اور اگر پھر جائے تو قضا بن جاتی ہے۔ تاجدار مدینہ کی نگاہ ناز سے اعلیٰ و ادنیٰ، قلب و نظر، ذکر و فکر اور عقل و عشق یکساں فیض یاب ہوسکتے ہیں۔

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب

جب ہمارے دلوں میں جامیؒ کا سوز و گداز تھا تو دنیا ہمارے پاؤں کے نیچے تھی۔ اگر اب ہم رحمت دو عالمؐ سے روگردانی کے مرتکب ہو چکے ہیں تو دنیا ہمارے سر چڑھی ہے۔ جب دلوں میں تاجدار کونینؐ کی محبت موجزن تھی تو سمندر پار کشتیوں کو نذر آتش کرنا ایک بحکمت کھیل تھا اور اگر آج ہم ملامت گزیدہ ہو چکے ہیں تو اغیار ہماری زلیخاؤں کے برہنہ اجسام کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ روسی درندوں کا شکار بننے والی ہماری افغان بہنیں کسی طارق اور محمود غزنوی کو پکار رہی ہیں۔ لیکن ان دریدہ پیرہنوں کی ناگفتہ بہ حالت پر کسی کا دل پارہ پارہ اور جگر پاش پاش نہیں ہوتا۔

برادران اسلام!

اگر ہم اپنے مقدر کی سیاہیاں دھونا چاہتے ہیں اور شکست و ذلت کو نصرت و عزت میں بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ حریم باطل سے اپنے تمام لافانی رشتے توڑ کر رسول عربیؐ کے در اقدس پر جھک جائیں۔

تاریخ، سالار بدر و حنین کی عظمتوں کی قسم کھا کر اپنی حقیقت پسندانہ زبان میں مسلسل یہ آلاپ رہی ہے کہ دنیا میں بلندیاں ہمیشہ ان کا مقدر ٹھہرتی ہیں جو شہادت کی موت اور عزت کی زندگی کی تلاش میں گھر سے نکلتے ہیں اور موت سے محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم فرمان نبویؐ کے مطابق جہاد پر کمربستہ ہو جائیں اور باطل قوتوں سے اس وقت تک برسرپیکار رہیں جب تک زمین پر قرآن کی حکومت قائم نہیں ہو جاتی۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

حضور اکرم، تاجدار عرب و عجم، سلطان معظم، فخر موجودات، سرور کائنات امام النبیین، رحمتہ اللعالمین، شفیع المذنبین، انیس المساکین، راحت العاشقین، مراد المشتاقین، حضور پر نور، شافع یوم النشور، احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیتہ والثناء کی ولادت باسعادت سے پہلے کفر و الحاد کی دنیا میں شرافت کی زندگی دم توڑ رہی تھی۔ اخلاقی محاسن جمود و تعطل کی قبروں میں دفن ہو چکے تھے۔ صفحہ ہستی کی فضائے بسیط پر چکا چوند بجلیاں کوند رہی تھیں۔ جہالت اور تعصب کی گھنگھور گھٹائیں کارگاہ زیست پر محیط ہو چکی تھیں۔ غور و تدبر کی بساط پر اوہام کا تسلط تھا۔ مادہ پرستی کے باعث مزاج خرد و شعور میں کئی تغیر و تبدل رونما ہو چکے تھے۔ عقیدۂ توحید کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اشرف المخلوقات ہبل و عزیٰ اور لات و منات کے آگے سر تسلیم خم کر چکا تھا۔ بے علمی کی دھند کثیف اور گمراہی کے اندھیرے گھمبیر ہو گئے تھے۔ تہذیب و تمدن کی کتاب کے اوراق تکر تکر بکھرے ہوئے تھے۔ انسانی شرف و وقار کا گریباں چاک چاک تھا۔ اولاد آدم مختلف النوع مسائل اور گوناگوں مصائب سے دوچار تھی۔ بربریت اور استبدادی بازگشت سے کلیجہ زمین جگہ جگہ سے شق تھا اور اخلاقی قدریں جاں بلب ہو چکی تھی۔

تا حد نظر چار وانگ عالم میں دہشت زدگی اور سہناکی کے بگولے رقصاں تھے یتامیٰ کے نالہ و شیون لوح و قلم کو جنبش میں لا رہے تھے اور زندہ درگور کی جانے والی معصوم بچیوں کی دلدوز چیخیں عرش عظیم سے ٹکرا رہی تھیں۔ مظلوم و محکوم انسانوں کے سیلاب [illegible] سے [illegible] ہو چکے تھے مگر وحوش و بہائم سے بدتر ظالم و [illegible] میں کوئی فرق نہ آیا تھا [illegible] پوری کائنات جور و جبر کی تاریکیوں [illegible] میں [illegible] و عار [illegible] کے شعلے بھڑک اٹھے [illegible] حیوان و [illegible] کا مظاہرہ کرکے

آسمان بھی دیدۂ تر تھا۔ آخر رحمت یزداں کا بحر ناپیدا کنار جوش میں آیا۔ بندہ نوازیوں کی لہریں تشنہ ضیاء کو انوار الٰہی کی نوید سنانے لگیں۔ صدیوں کے بعد حالات نے ایک مسعود کروٹ بدلی اور ۱۲ ربیع الاول کا وہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا جس کے مخمور دامن میں بے پایاں راحتیں اور ہزارہا مسرتیں پنہاں تھیں۔ پردۂ اخفاء سے جونہی وہ سہانی صبح نمودار ہوئی ملکہ شب کی تاریکیاں رفتہ رفتہ کافور ہونے لگیں۔ جہاں مہیب خزاں کا سناٹا اور باد سموم کا تصرف تھا وہاں رقص بہاراں کے جشن میں نکہت بیز ہوائیں اور راحت آمیز فضائیں اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔

دعائے خلیل اللہ اور تمنائے ذبیح اللہ کی شرف قبولیت کا لمحہء سعید آن پہنچا۔ حضور پر نور، شافع محشر، ساقی کوثر، صلب عبداللہ اور پہلوئے آمنہ سے پیدا ہوئے۔ حوروں نے اھلاً و سہلاً کے شادیانے بجائے۔ فرشتوں نے مرحبا یا سیدی کے ترانے گائے۔ حور و غلمان وجد میں آگئے اور عالم رنگ و بو کے ذرے ذرے سے مسرت ٹپکنے لگی۔

تھی اول اول گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا میں لا مکاں ہوں

اللہ اللہ اس در یتیم کی ولادت با سعادت جس کے شوق پابوسی کی خاطر جبینِ حرم میں سجدے تڑپ رہے تھے۔ سیارگان فلک چشم براہ اور مکینان ارضی کے دیدہ و دل فرش راہ تھے جن کے انتظار میں نجوم فلک نے لا متناہی راتیں جاگ جاگ کر گذاری تھیں اور جن کی خاطر ستاروں کو تابانی ملی، دریاؤں کو روانی ملی اور صحرا کو [illegible] ملی تھی۔

[illegible] نے حمید الاولین کی آمد پر [illegible] کو بلندی، ذلت کو عزت [illegible] کو [illegible] اور زوال کو کمال [illegible] عطا کیا۔ وہ کون آیا؟ [illegible] کا والی آیا۔ بیواؤں کا والی آیا۔ بے سہاروں کا سہارا، لاچاروں و ناچار کا

چارا' مجبور و مقہور کا غم خوار اور بے بس و بیکس کا غم گسار' ساکنان عرش و فرش کا آقا اور کائنات کا مولا آیا۔ کواکب کی جلوہ باریاں اور قوس قزح کی رعنائیاں آپ کی حسن و زیبائی کے حضور سجدہ ریز ہو گئیں۔ مہر درخشاں کی تابناکیاں اور ماہ تاباں کی ضیا پاشیاں ' رشک یوسفؑ کے رخ زیبا کا طواف کر کے گنگنانے لگیں

بلغ العلی بکمالہ کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ وآلہ

دوستان عزیز' فلسفہ تخلیق کون و مکاں میں قرآن و حدیث بھی ترنم ریز ہیں۔ حبیب کبریا' مولائے انبیاء سالار بدر و حنین' والی کونین' پور عبدؓاللہ اور بطن آمنہؓ سے پہلے کہاں تھے اور کب تھے؟ بحر رسالت میں غوطہ زن شمع رسالتؐ کے کسی پروانے نے کیا خوب گہرہائے نطق پیش کیے ہیں۔

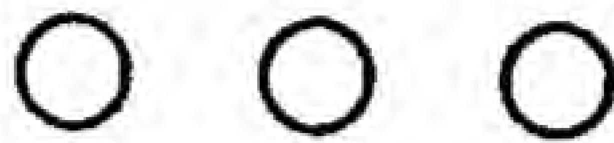
حضور کب تھے؟ جب کب نہ تھا' جب جب کا وجود نہ تھا۔ جب تب بھی نہ تھا' اس وقت تھے! جب آفتاب کی نور افشانیاں تھیں نہ کلیوں کی تبسم آرائیاں۔ ماہتاب کی ضیا باریاں تھیں نہ قوس قزح کی رعنائیاں۔ چرند و پرند کی پکار تھی نہ کروٹ لیل و نہار۔ نہ نیلگوں آسمانی شامیانہ تھا نہ کوئی ساقی و پیمانہ۔ نہ مکین و مکاں تھے نہ زمین و آسمان تھے۔ شگفتہ غنچوں کی کیاریاں تھیں نہ مہکتے گلوں کی گلکاریاں تھیں۔ دریاؤں میں روانی تھی نہ قلزم میں جولانی تھی۔ آبشاروں میں ترنم تھا نہ فضاؤں میں تبسم تھا۔ چلتی ہوائیں تھیں نہ معطر فضائیں تھیں۔ نہ جمادات تھے نہ نباتات۔ نہ انسانات تھے نہ جنات۔ کلیوں میں چٹک تھی نہ خاروں میں کھٹک۔ ستاروں میں چمک تھی نہ بہاروں میں مہک۔ صفی اللہ تھا نہ خلیل اللہ۔ کلیم اللہ تھا نہ روح اللہ۔ جبرئیل و میکائیل تھے نہ عزرائیل نہ اسرافیل۔ موت تھی نہ حیات تھی۔ ایک اللہ اور دوسری محمدؐ کی ذات تھی۔ وہ خلق کرنے والا تھا یہ خلق ہونے والا تھا۔ وہ صانع تھا یہ اس کی صنعت تھا۔ وہ قوی تھا یہ اس کی قوت تھا۔ وہ قادر تھا یہ اس کی قدرت تھا۔ وہ رب العالمین تھا یہ رحمتہ اللعالمین تھا۔ وہ لا الہ الا اللہ تھا یہ محمد رسول اللہ تھا۔

یا صاحب الجمال یا سید البشر

من وجهک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثنا کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر



سیرت النبیؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

آپ جانتے ہیں کہ حضور پر نور، شافع یوم النشور، نبی آخر الزماں، فخر دو جہاں، حضرت محمد مصطفیٰؐ، احمد مجتبیٰؐ کی سیرت ایک ایسا زندۂ جاوید موضوع ہے جو کبھی احاطہ تحریر میں آسکتا ہے اور نہ ہی دائرۂ گماں میں سما سکتا ہے۔ بولنا چاہیں تو فکر و نطق دم بخود اور اظہار بیان کی تمام تر پہنائیاں عاجز محسوس ہوتی ہیں۔ قصہ مختصر، اس جامع و اکمل، ارفع و اعلیٰ، وسیع و مقدس اور لا محدود موضوع کو کسی صورت بھی صحیح معنوں میں جامہ الفاظ نہیں پہنایا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود ان چودہ صدیوں میں جتنا کچھ نبی کریم رؤف الرحیمؐ کی حیات طیبہ پر لکھا گیا، تاریخ آدم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز، کھانے پینے اور سونے کے طریقے، چلنے پھرنے کی ادا، گفتگو کا قرینہ اور خطابت کا سلیقہ حتیٰ کہ نطق نبوت کا ایک ایک حرف تاریخ و احادیث کے صفحات کی زینت بنا ہوا ہے۔ لیکن اس موضوع کا حق ادا ہوا ہے اور نہ ہی کبھی ہوسکتا ہے۔ بطور پیغمبر اور انسان کامل کے تو وہ ہمارے لیے باعث نمونہ ہیں اور بلاشبہ ان کا ہر نقش قدم ہماری جبینوں کے لیے پیغام حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر آپ کے رتبہ و کمال کی طرف نظر دوڑانا، سنگ و خشت کی دنیا میں گم گشتہ انسانی ذہن و شعور کا خاصہ نہیں۔ یہاں تاب فکر ہے اور نہ ہی طاقت گویائی!

نسبت خود بسگت کردم و منفعلم
زآنکہ نسبت کوئے تو، شد بے ادبی

تاریخ کی کتاب کھولیے! تمام اوراق کنگھال ڈالیے! پوری کائنات کے ہیرو، مذہبی پیشوا، سماجی مصلح اور سیاسی راہنما، محسن انسانیتؐ کے حضور "قول کامل" "قول کامل" کا ورد کرتے سنائی دیں گے۔ یہ [illegible] غیر مسلموں نے بھی تسلیم کی ہے کہ آپ بلا مبالغہ تمام مذہبوں [illegible] کے بانیوں سے [illegible] ہیں۔

زنان مصر نے حسن یوسف کا نظارہ کیا تو [illegible] میں اپنے ہاتھوں کو

انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں' خدا کی قسم اگر میرے رسولؐ کا جلوہ نصیب ہوتا تو وہی چھری ان کے جگر پر ہوتی۔ آپ کے فیوض و برکات' اللہ اللہ! ان کے عشق و محبت میں جو بھی تسلیم و رضا کے خنجر سے ذبح ہو جائیں یقیناً ان تک پہنچنے سے پہلے موت خود مرجاتی ہے۔ ایک بار جو اس در پر آگیا اسے کسی اور در کی حاجت نہ رہی۔ جو حضورؐ کے قدموں میں آبیٹھے وہ بڑے بڑے شہنشاہوں کے سر چڑھے۔ جس نے آپ کا تلوا دیکھا وہ اغیار کی نظروں سے بے نیاز ہوگیا۔

آقائے مدنیؐ کی سیرت پوری دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آپ کی زندگی کا گوشہ گوشہ کتابِ زیست کا ایک ایک ورق ان زریں واقعات سے بھرا پڑا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ ساتھ معاشی' معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے بھی ایک قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

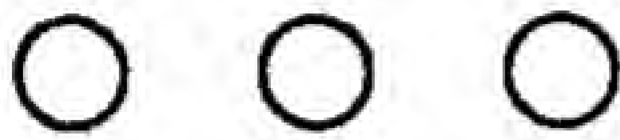
یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد ہر مذہب کے مورخوں کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ آپ کی پوری زندگی مثالی تھی۔ ایک ایک لمحہ یادگار اور ہر نقش تابندہ و درخشندہ تھا' ہے اور رہے گا۔ اگر درِ یتیمؐ کے کمالات کا مشاہدہ کرنا ہو تو ذرا غور کریں کہ آپ نے تیئیس سال کے مختصر عرصے میں جب ذرائع آمد و رفت اور وسائل مواصلات بھی بالکل مفقود تھے' ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دیا کہ صنم خانوں اور گنبد ہائے طلسمات سے بھی اللہ اکبر کی صدائے حق سنائی دینے لگی۔

آج میں سیرت النبیؐ کا تذکرہ موجودہ دنیائے اسلام کی زبوں حالی کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب تین سو تیرہ نفوس کے ایک مختصر گروہ نے غزوۂ بدر کے موقع پر کثیر تعداد کفار کو تہ تیغ کیا پھر ایک موقع پر حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں ساٹھ مسلمانوں نے ساٹھ ہزار رومی فوج سے بھی ٹکر لی اور پوری دنیا پر واضح کر دیا کہ اگر جذبہ صادق ہو تو کسی صورت بھی شکست و ریخت کا سامنا نہیں ہو سکتا۔ مگر آج جانے کیوں اس کے بالکل برعکس دکھائی دے رہا ہے کہ اکثریت اقلیت سے اہل حق اہل باطل سے اور مسلمان غیر مسلموں سے

بری طرح مار کھا رہے ہیں۔

غالباً" اس کا سبب یہ ہے کہ ہم قرآن کی بجائے ناول، عشق رسولؐ کی جگہ عشق دنیا، روحانیت کے بر خلاف مادیت، جہاد کے عوض جمود اور مدینہ النبیؐ سے اپنا رشتہ توڑ کر ماسکو اور واشنگٹن سے وابستہ ہو چکے ہیں۔

کعبہ پہلو میں ہے اور تو سودائی بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا



اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

شاہ است حسینؑ پادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ

سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

"ظہور آدم سے لے کر آج تک انقلابات نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ دن بھی آئے' راتیں بھی آئیں' خوشی بھی آئی اور غم بھی' خزاں بھی اور بہار بھی' گل بھی اور خار بھی' مسرت بھی اور مصرت بھی۔ نہ جانے کتنے طوفان اٹھے؟ کتنی کشتیاں منجدھار کا شکار ہوئیں اور کتنی ہمکنار ساحل' کتنے ساتھی بچھڑے اور کتنے ہم آغوش ہوئے۔ نہ جانے منزل پر پہنچنے والے کتنے تھے اور راہ گم کردہ کتنے؟ نیرنگی فطرت نے کیا کچھ کیا' کیا کیا ہوا اور کیا کیا نہ ہوا؟" مگر آج تک اس گردش شام و سحر کے بیچ جتنے طوفان اٹھے۔ جتنے بھی گھر اجڑے' کسی بھی حادثے پر اس شان سے اہتمام آہ و فغاں نہ ہوا' کہ آج بھی محرم کا سوز اور تب و تاب فضا کو سوگوار بنا دیتا ہے اور جہان اضطراب دلوں میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ محرم کے پہلے عشرہ میں سسکیاں کی دلدوز چیخیں گوش فلک کو سنائی دیتی ہیں اور ان کی صدائے باز گشت سے گنبد جہاں گونج اٹھتا ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ' ابتدا ہے اسمٰعیل

حق و باطل' شیطانی و رحمانی اور طاغوتی و لاہوتی قوتیں' ابتدائے آفرینش ہی سے آپس میں برسر پیکار رہی ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے نمرود کے خود ساختہ [illegible] کو تار تار کیا اور کبھی حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے فرعون کو غرقاب کیا۔ [illegible] بھی [illegible] کا مجسمہ بن چکی تھی۔ آئیں اسلام کی

جگہ طوائف الملوکی اور آمریت خیمہ زن تھی۔ جوش جہاد کی جگہ کمزوری اور ناتوانی لے چکی تھی۔ ظلم و استبداد کے سامنے خوشامدانہ خاموشی' باطل قوتوں کے آگے مصلحت اور ارباب اختیار کے حضور میں قومی غیرت اور ملی حمیت سجدہ ریز تھی۔ اس وقت "خونخوار بھیڑیا صفت یزید" کے سامنے کلمہ حق کہنے والے وہی تھے جن کی رگوں میں ہاشمی خون دوڑ رہا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس وقت وہ حسین سپہ سالار اسلام تھے جو نواسہء مصطفیٰ ہے۔ جو جگر گوشہ شیر خدا ہے۔ جو نور عین زہرا ہے۔ جو برادر حسن مجتبیٰ ہے۔ جو راکب دوش حبیب کبریا ہے۔ جو برادر عباس باوفا ہے۔ جو پیکر رشد و ہدیٰ ہے۔ جو مجسمہ فقر و استغناء ہے۔ جو کشتہء خنجر تسلیم و رضا ہے۔ جو شہید کربلا ہے اور جس کا خون اسلام کی بقا ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

امام عالی مقام نے اپنے چند مخلص جانثاروں کی معیت میں باطل قوتوں کو خس و خاشاک بنا دیا اور کبر و نخوت سے اکڑی گردنیں خم ہو گئیں۔ جب حسین نے بارگاہ ایزدی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تو کربلا کی مٹی پکار اٹھی۔

گلہ جفائے وفانما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

میری چشم تصور وہ کرب ناک منظر دیکھ رہی ہے کہ [illegible] ہے۔ گلشن رسالت کی کلیاں مرجھا رہی ہیں۔ [illegible] کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ ہاشمی بچوں میں سے [illegible] بے آوازی [illegible] امام عالی مقام [illegible]

جاری ہے۔ اے شبیرؓ! تلواروں کے سائے میں نماز ادا کرنا تیرا ہی کام تھا۔ تو نے وہ سجدہ کیا کہ ازل تا امروز ساکنان عرش و فرش کے لیے باعث رشک بن گیا' تو حاصل نماز ہے اور نماز کا ناز بھی ہے۔

قافلہء حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!

ذرا چشم تصور سے دیکھئے اس عظیم کارواں کی شام غریباں' خیموں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اہل بیت کے لاشے گھوڑوں کے سموں سے کچلے جا رہے ہیں۔ کسی کا ہاتھ لاشے سے جدا ہے اور کسی کا سر تن سے جدا۔ یہ لاش اس جوان کی ہے جو حیدر کرارؓ کے دل کا چین اور سیدہ بتولؓ کا نور عین ہے۔ ریگزار کربلا کے ذرے ذرے نے اس جا نگسل منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چرخ کج رفتار نے آنسو بہائے۔ بے رحم بادل کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چشم کوہ سے نالے پھوٹے۔ ہوائیں اشک بہانے لگیں' فضائیں بلبلانے لگیں۔ دریاؤں کی روانی تھم گئی۔ پھولوں سے خوشبو اڑ گئی۔ ستاروں میں روشنی نہ رہی' قوس و قزح سے رنگینی چھن گئی۔ چاند نے سیاہ قبا پہنی۔ طائران گلشن نے اہتمام آہ و زاری کیا۔ عندلیبان چمن نے انتظام عزاداری کیا۔

جنات انگشت بدنداں' انسان حیران و پشیماں' خورشید نوحہ کناں' حجر و شجر بسمل' بہاریں چاک گریباں۔ فرشتے رنجیدہ رنجیدہ اور حوریں سنجیدہ سنجیدہ' گویا نظم فطرت میں زلزلہ آگیا۔ آج بھی کائنات رنگ و بو کا ذرہ ذرہ زبان حال میں رطب اللسان ہے۔

اے کربلا کی خاک! تو اس احساں کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشہ بتولؓ
[illegible] لہو سے تمہاری پیاس بجھ گئی
[illegible] رگ رسولؐ

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عمرؓ بارگاہ رسالت مآبؐ میں مرید نہیں مراد بن کر حاضر ہوئے تھے۔ ادھر محبوبؐ خدا کے پیارے اور نازک ہونٹوں سے یہ دعا نکلی "اے اللہ عمرؓ کے ذریعے اپنے دین کو قوت و استحکام عطا فرما" ادھر رب جل جلالہ، نے سند قبولیت عطا فرمائی اور عمرؓ بجانب نبی آخر الزماںؐ روانہ ہوئے لیکن وہ قبول اسلام کے ارادے سے نہیں بلکہ شمع رسالتؐ کو بجھانے کی نیت لے کر گھر سے نکلے مگر قدرت ابن الخطاب کی اس جسارت پر مسکرا رہی تھی۔ کیوں نہیں، تلوار کی نوک سے قتل رسولؐ کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بجائے وہ خود رسول عربیؐ کی تیغ نگاہ سے شکار ہونے والا تھا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

خلیفہ ثانی کا عہد حکومت ہر لحاظ سے مثالی ہے۔ پروفیسر "تور آندرے" سیرت نبویؐ پر مبنی اپنی کتاب میں اعتراف حقیقت کے طور پر لکھتا ہے۔

"حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت وفادار، قابل فخر دوست، سچے رفیق کار اور مخلص خادم تھے" مورخ مذکور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ "حضرت عمرؓ زبردست فتوحات اور خلیفہ ہونے کے باوجود اپنے لیے بیت المال سے صرف دو درہم روزانہ لیا کرتے تھے اور جو لباس وہ پہنا کرتے تھے اس میں پیوند لگے ہوتے۔

آقائے مدنیؐ نے ایک دفعہ فرمایا تھا "اے عمرؓ! اگر شیطان تمہیں راہ میں دیکھ پائے تو خدا کی قسم وہ بھی تمہاری ہیبت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا" سر ولیم میور خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے "آپ ہاتھ میں تازیانہ لے کر مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں پھرا کرتے اور مجرموں کو موقع پر ہی سزا دیتے بلاشبہ عمرؓ کا تازیانہ دوسروں کی تلوار سے زیادہ رعب دار اور خوفناک تھا"

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی

حضرت عمرؓ کی حیات مقدس کا گوشہ گوشہ صداقتوں اور سچائیوں سے معمور ہے۔ جب کبھی عشق رسالتؐ کا مرحلہ پیش آیا تو انہوں نے فی الفور تلوار کو بے نیام کیا اور گردن زنی کرتے ہوئے فرمایا "کہ جس کو میرے آقا کا فیصلہ نامنظور ہو اس کے متعلق میرا یہی فیصلہ ہے" انصاف کے موقع پر بغیر کسی حیل و حجت کے اپنے نور نظر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ لوگوں کا خدا سے اعتماد اٹھتے اور ان کو اس قسم کی باتیں کرتے دیکھا کہ جس جنگ میں خالدؓ بن ولید شامل ہوں اس میں ہمیں شکست نہیں ہو سکتی تو انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے انہیں معزول کردیا اور ایک شاعر سے اپنی تعریف سن کر مال غنیمت میں سے انعام دینے کے الزام کی تحقیق بھی فرمائی۔ مساوات کا عملی ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے بیت المقدس کے سفر میں اپنی باری کے بعد اونٹ پر غلام کو سوار کردیا اور خود اس کی مہار پکڑ کر آگے آگے چلنے لگے۔ گزر اوقات کے لیے وظیفے کا تذکرہ چھڑا تو صرف دو درہم پر کفایت کی۔ یہی نہیں بلکہ بستر مرگ پر یہ حساب بھی چکا دیا۔

نگہبانی و خبر گیری کا جذبہ انہیں مدینے کی گلیوں میں لیے پھرتا تھا تو کبھی وہ گرد و نواح میں دور تک نکل جاتے۔ کرامات کا بیان مقصود ہو تو "یا ساریہ الجبل" کا تذکرہ ملتا ہے اور اگر فتح و نصرت کا جائزہ لینا مطمع خیال ٹھہرے تو کرۂ ارض کا نصف جغرافیہ ان کی تاریخ سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ امور سلطنت کے سلسلے میں حاکموں کو ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کرتے رہے ہیں۔ دوسری طرف شجاعت دکھائی تو یہ عالم ہے کہ طیبہ سے باہر نکل دشمن پر دستے کو سنبھالے رکھے، تلوار پر گرفت مضبوط کیے پیچھے سے فرماتے ہیں "...۔ [illegible]

[illegible]

ہاتھ میں تلوار ہو اور دل میں ہو خوف خدا
یثربی تہذیب کتنی دلنشیں اور سادہ ہے

میرے دل و جان فاروق اعظمؓ کے قدموں کی خاک پر قربان' جنہوں نے غلاموں کی خرید و فروخت کے کاروبار کو حکماً" بند کیا اور فرمایا "جسے اس کی ماں نے آزاد جنا تھا تم نے اسے غلام کیسے بنا لیا" ایک موقع پر فرمایا " اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مرگیا تو عمرؓ روز محشر اس کا جواب دہ ہوگا"

ہزار بار حضرت عمرؓ کی عظمت و رفعت کو سلام! جن کے تصور سے با جبروت شہنشاہوں پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی مگر خود مسجد نبویؐ میں اس انداز سے بیٹھتے کہ عدم امتیاز کے باعث پہچاننا دشوار ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ کی زندگی دنیائے اسلام کے سربراہوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آج ہر طرف رشوت کا دور دورہ اور قتل و ڈاکہ زنی کا شہرہ ہے' اس لیے کہ موجودہ عہد کے حکمرانوں نے رسم فاروقی فراموش کر رکھی ہے۔ پریزیڈنٹ ہاؤس میں محافظوں کے پہرے میں آرام کرنے' عام لوگوں کو ملنے جلنے میں اپنی توہین خیال کرنے' بلند و بالا محلات اور ائر کنڈیشنڈ کوٹھیوں میں داد عیش دینے والے ارباب حکومت عوام کے دکھ سکھ سے آشنا اور منصف مزاج کس طرح ثابت ہو سکتے ہیں؟

وہ کیا جانیں پیکاں کی جراحت کیسی ہوتی ہے
نہیں ناپی جنہوں نے میرے زخم دل کی گہرائی

شریفوں کی عزت نفس کا مذاق اور بدمعاشوں کی قدر و عزت کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو ہمارے پیشہ ور حاکموں کو چاہیے کہ کبھی کسی عام شہری کے روپ میں تھانوں کا چکر لگائیں۔ جہاں ہر وقت رشوت دلالی کا کاروبار ہوتا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ ایسے میں پولیس اہل کار عدم واقفیت کی بناء پر معزز حاکم کی بھی اپنے روایتی انداز میں خاطر تواضع کرنا چاہیں اور سرکاری مہمان بنانے پر مصر ہوں۔ حضرت عمرؓ کے عہد حکومت کا یہی درس ہے کہ پبلک سے بلاواسطہ ہر ممکن رابطہ

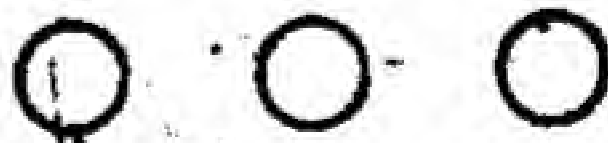
رکھو! غریبوں کو امیروں، مزدور کو سرمایہ داروں، مزارعہ کو جاگیرداروں اور ماتحتوں کو افسروں سے ہر وقت بچاتے اور فرعونی جراثیموں کی سختی سے بیخ کنی کرتے رہو!

میں نے تاریخ کے مطالعہ کے بعد دیانتدارانہ رائے قائم کی ہے کہ مستقل مزاجی، شجاعت، انصاف پسندی اور بطور منتظم کے حضرت عمرؓ کا سنہری دور اپنا جواب نہیں رکھتا اور ان کا قد کاٹھ نہایت بلند ہے۔ میرا دل و دماغ ان سے اس قدر متاثر ہے کہ میں کسی اور طرز حکومت کو خاطر میں نہیں لاسکتا۔

کاش! سلاطین قوم کے دلوں میں فاروق اعظمؓ کا درد و سوز بھر جائے۔ میں اس موقع پر ایک نامور غیر مسلم مورخ پروفیسر ہٹی کی تاریخ اسلام کا ایک حوالہ گوش گزار کیا چاہتا ہوں کہ شاید سماعت کے پردوں سے ٹکرا کر ہمارے دلوں کو اضطراب آشنا کرسکے۔ خراج عقیدت پیش کرنے کے انداز میں لکھتے لکھتے اس کا قلم جانے کیوں رک گیا۔ نیز سر ولیم میور بھی اس رائے سے اتفاق کرتا ہے "اگر مسلمانوں کی تاریخ میں حضرت عمرؓ سا ایک اور حکمران ہوتا یا انہیں دس بارہ برس کا مزید موقع مل جاتا تو بالیقین پوری دنیا پر صرف ایک دین یعنی اسلام باقی رہ جاتا"۔

علامہ صاحب کیا خوب فرماتے ہیں:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی!
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے



تاجدار بریلی ------ مولانا احمد رضا خان ؒ

تاریخ اسلام کے صفحات ایسی شخصیتوں کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں' جن کی خدا داد بصیرت سے ایک دنیا مستفیض و مستفید ہوتی آئی ہے' ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ انہی میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جنہیں اپنے بھی جانتے ہیں اور بیگانے بھی۔ جن کا تذکرہ گستاخوں کے خرمن باطل پر بجلی بن کر گرتا ہے اور اہل محبت کے دلوں کو باد صبا کی سی طمانیت و طراوت بخشتا ہے۔ جس قدر ان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان کی شخصیت تابناک اور قد کاٹھ بہت بلند نظر آتا ہے اور حیرت بڑھ جاتی ہے کہ یہ آفتاب علم و صداقت' خزینہ عشق و معرفت' ایک طویل مدت تک اہل علم کی نگاہوں سے کیونکر پوشیدہ رہا؟ وہ کیا اسباب تھے؟ کہ لا علمی کا طلسم ایک عرصے تک قائم رہا اور حقائق مخالفانہ و منافقانہ پروپیگنڈہ کے نقاب میں پنہاں رہے۔

سرسری ذکر تھا بے مہریٔ دنیا کا مگر
شرم سے کیوں ترے ماتھے پر پسینہ آیا

اس بے حسی و کم فہمی پر جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھیے! کہ اگر انگریزوں کے وظیفہ خوار کاسہ بردار' غلام صادق' انتشار پسند اور اہل ایمان کے دلوں سے عشق رسول ﷺ کی چنگاری بجھانے کی کوشش کرنے والے لوگوں کو تو شہید' غازی' مرد مجاہد' بطل حریت اور حکیم الامت کے القاب مل جائیں لیکن وہ بندۂ حق جس نے نصف صدی تک غلامی کی تاریک راتوں میں اجالے کیے۔ صبح و شام گلشن اسلام کو اپنے خون سے سینچا۔ جن کا زور قلم فرنگیوں کی مدح سرائی کے بجائے اسلام کے کام آیا۔ جنہوں نے ہر وقت انگریز اور انگریزوں کے چاہنے والوں سے کھلا اظہار نفرت کیا۔ قوم حجاز کو بلال حبشی کا مقام عشق یاد دلایا۔ جن کی حسن [illegible] اسلام [illegible] اور [illegible] پر مگر آج بھی ماتم کرتا ہے اور جنہوں نے ہر نازک [illegible] بلند کرکے حقیقی اسلام

کے درخشاں چہرے سے نام نہاد مصلحین ملت کی مصلحت کوشیوں اور تمام غلط افکار کے پردے پل بھر میں نوچ پھینکے تھے ان کو بد عتی' انگریز نواز اور نئے دین کا بانی کہا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ غیر تو غیر ان سے اپنے بھی خفا نظر آتے ہیں۔ شاید ان کا جرم یہ ہے کہ کوئی جرم نہیں اور گناہ یہ ہے کہ ان کی سفید قبا پر ملت فروشی کا کوئی داغ نظر نہیں آتا۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

میرا اشارۂ سخن! افتخار سلف' وقار خلف' عاشق خیر الانامؐ فدا کار اولیائے عظام' تاجدار اہل سنت' مجدد وقت حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کی ذات باصفات کی طرف ہے وہ احمد رضا جنہوں نے ایک کم فہم مفتی کے منہ پر زناٹے دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ برصغیر پاک و ہند "دارالحرب نہیں دارالسلام ہے" اور یوں ہندوستان کے سادہ لوح مسلمانوں کو موت کے منہ میں ذلت و غربت کی موت مرنے سے بچا لیا۔ وہ احمد رضا جنہوں نے اس وقت دو قومی نظریئے کا پرچار کیا جب قائداعظم اور اقبال مرحوم بھی متحدہ قومیت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ احمد رضا پاکستان کے لیے جن کی خدمات کسی طرح بھی بابائے قوم اور شاعر مشرق سے کم نہیں ہیں۔ وہ احمد رضا' ایسے عالم کہ وہ کون سا علم ہے جو انہیں نہ آتا تھا۔ وہ فن ہی کیا ہے؟ جس سے وہ واقف نہ ہوں۔ وہ احمد رضا کہ ان کے "فتاویٰ رضویہ" کی چند جلدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "میں نے دور آخر میں ان سا فقیہہ نہیں دیکھا۔ مولانا جو رائے ایک بار قائم کر لیتے ہیں اسے [illegible] کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنا موقف بہت [illegible] و بچار کے بعد اختیار [illegible] اگر [illegible] کی وجہ سے ان کی طبیعت میں شدت نہ ہوتی تو [illegible] اپنے دور کے امام ابو حنیفہ ہوتے۔" وہ احمد رضا [illegible] علم و فضل کے ایک وسیع [illegible] کے [illegible] مکمل [illegible] تو ایک

طرف، تا ہنوز ساحل تک بھی رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔ وہ احمد رضا جو زود نویسی، برجستہ تحریر اور تصنیفی استعداد کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔ وہ احمد رضا جو بلاشبہ جید عالم، تبحر حکیم، عبقری فقیہہ، صاحب نظر، مفسر قرآن، عظیم محدث اور ایک سحربیان خطیب تھے۔ وہ احمد رضا جن کی وسعت علمی، فن تحریر اور محاسن کنز الایمان کا یہ عالم ہے کہ اگر علم و خطابت کے بڑے بڑے آئمہ کو مشاہدے کا وقت ملتا تو خدا کی قسم وہ شرف تلمذ کی آرزو کرتے۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے، انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیرت کے نقوش جس قدر دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جائیں گے عظمت و فضیلت کا احساس بڑھتا چلا جائے گا۔ اتنے مختصر وقت میں ان کے تمام کمالات و فضائل کا احاطہ کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے برابر ہے اور یہ وہ دریا نہیں جو کوزے میں سما سکے۔ اس لیے فی الحال ہم ان کی زندگی کے ایک نمایاں گوشے کا جائزہ لیتے ہیں۔ جو ان کی پوری زندگی پر غالب دکھائی دیتا ہے۔

تمام غیر متعصب نظریاتی مخالف بھی یہ تسلیم کرچکے ہیں اور کر رہے ہیں کہ فاضل بریلویؒ کے جذبۂ عشق رسالتؐ اور وجد آفریں نعت گوئی کی بنا پر وہ بلا مبالغہ "حسان الہند" کہلانے کے مستحق ہیں۔ عشق رسالتؐ ان کا سب سے قیمتی اور لا فانی اثاثہ ہے۔ انہوں نے در مصطفیٰؐ چھوڑ کر کسی دنیاوی شہنشاہ کے دروازے کی طرف آنکھ اٹھانا بھی کبھی گوارا نہ کیا۔ انہیں بھروسہ تھا تو اپنے آقا و مولیٰؐ کی کرم گستریوں پر۔ انہیں اعتماد تھا تو اپنے ہادی و مرشد کی بندہ پروریوں پر۔ ان کی نگاہیں اٹھتی تھیں تو تجلیات مصطفیٰؐ کی طرف رہتیں کیسے کو، ان کا دل دھڑکتا تھا تو صرف رحمت اللعالمین کی رحمت نوازیوں پر۔ عشق مصطفیٰؐ کا جو معیار وہ قائم فرما گئے، وہ متاخرین کے لیے مینارۂ نور ہے اور جو شعر وہ اپنے کلام میں بھر گئے" خدا جانے کب تک دلوں کو گرماتا اور وجدان کو [illegible]

ہزار جنت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینہ سے آج رضواں
ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں " جو تصانیف میں نے کی ہیں ان سے میرا مقصد مصنف بننا نہیں ہے بلکہ اگر میں یہ تصانیف نہ کرتا تو مجھے جل جانے کا خطرہ تھا" یہ بات اس عاشق رسولؐ پر ہر لحاظ سے صادق آتی ہے۔ علم کا جو سمندر ان کے دماغ اور سینہ میں موجزن تھا اگر وہ صفحات قرطاس پر منتقل نہ کیا جاتا' ان کے قلم سے ہزار کے لگ بھگ چھوٹے بڑے رسالے مترتب نہ ہوتے اور خصوصاً "حدائق بخشش" کے اوراق پر وہ اپنے دل کے زخم ظاہر نہ فرماتے تو خدا کی قسم وہ عشق رسولؐ کی حدت میں جل گئے ہوتے یا شدت جنون کے سبب جنگلوں میں مارے مارے پھرتے۔ مولانا احمد رضا خان بریلویؒ اپنے دل کا کیا خوب نقشہ کھینچتے ہیں۔

پیش نظر وہ نو بہار' سجدے کو دل ہے بیقرار
روکیے' سر کو روکیے' ہاں یہی امتحان ہے

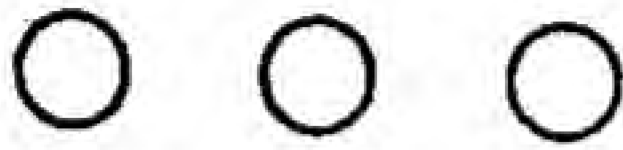
ان کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی' الفاظ عشق و محبت کے آئینہ دار' تخیل قرآن وحدیث کی تفسیر اور مفاہیم' پابندی شرع کے عکاس دکھائی دیتے ہیں۔ جب جوش جنوں حدود شریعت سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو وہ اپنے جذبات کو روکتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے شوق دل یہ سجدہ گر ان کو روا نہیں
اچھا وہ سجدہ کیجئے' سر کو خبر نہ ہو

آپ کے افکار و کردار اور ظاہر و باطن میں اس قدر گہری ہم آہنگی ہے کہ گورکھپور یونیورسٹی کے محقق و مورخ پروفیسر ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں " مولانا بریلوی کی شخصیت و شاعری میں فاصلہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی شخصیت آپ کی شاعری ہے اور آپ کی شاعری آپ کی شخصیت ہے" اعلیٰ حضرت جب مسجد نبویؐ کی رشک فردوس فضا میں پہنچے۔ ہر دم دلکش و دلکشا گنبد خضرا کا نورانی ماحول

آنکھوں کو بصیرت عطا کر رہا تھا تو یہ ہندی غلام اپنے آقا کی بارگاہ میں مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر عرض مدعا کرتا ہے۔ سوز و گداز ایسا کہ رومی و جامی بھی بلائیں لیتے دکھائی دیں اور دلوں میں آتش عشق بھڑک اٹھے۔

کیوں کوئی پوچھے تیری بات رضا
تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں



ٹیپو سلطان شہید علیہ الرحمۃ

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

برصغیر میں مغلیہ شان و سطوت' ساکنان ہند کا عرصہ حریت اور قوم حجاز کی قدر و منزلت' عالمگیر کے جسد خاکی کے ساتھ ہی دفن ہو چکی تھی۔ جب مغربی قومیں تسخیر کائنات پر کمربستہ تھیں' کشور کشائی اور ہوس ملک گیری میں وہ برصغیر کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ادھر زمام اقتدار واجد علی شاہ جیسے عیش پرستوں کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب اور جوش و خروش کی جگہ عیش و طرب کو مل گئی۔ جب کشت و خوں اور چیخ و پکار کی لرزہ خیز بازگشت سے درو دیوار دہلی پر زلزلے طاری تھے۔ اس وقت شاہ رنگیلا شاہی محل میں داد عیش دے رہا تھا۔ وہ بزم رقص و سرود سجائے' پائل کی جھنکار میں مسحور اور دختر انگور کے نشہ میں چور "ہنوز دلی دور است ہنوز دلی دور است" کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ انتشار و افتراق کے باعث اس خطہ ارض میں آزادی کی شمعیں رفتہ رفتہ فرنگی پھونکوں سے گل ہوتی جارہی تھیں۔ جعفر جیسے غدار وطن کی ضمیر فروشی نے اس سنگلاخ فصیل میں شگاف کردیا جس کا تحفظ کرتے ہوئے نواب سراج الدولہ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی نذر کرچکا تھا۔ اس وقت سلطان ٹیپو کے روپ میں ایک ایسا مرد جری بھی موجود تھا جس نے برطانوی سامراجی طوفان روکنے کی تابڑ توڑ کوششیں کیں۔ فرنگی چیرہ دستیوں کے آگے کبھی سر خم نہ کیا اور روز و شب حفظ نشیمن کے لیے کوشاں رہا۔

ناکامی و جاوید بصد شوق گوارا
گردن در باطل پہ جھکائی نہیں جاتی

[illegible] فطرت کو عرصہ رہتا ہے تب کہیں ایسی نابغہ روزگار شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جو کردار میں عمل کی جوہری اور [illegible] جلال پہلوی کے جوہر

ہوتے ہیں۔ اس وقت ٹیپو سلطان ہی وہ بطل حریت تھا جس نے جدید آلات حرب و ضرب سے لیس، جنگی چالوں کے ماہر، سات فرنگی جرنیلوں کے دامن عسکریت کو پے در پے ذلت ناک شکستوں سے داغدار کیا۔ مگر سید عبدالغفار کے علاوہ باقی سب امرائے دربار اور فوجی سردار اپنا دین و ایمان چند ٹکوں کے عوض اقوام مغرب کے ہاتھوں فروخت کر چکے تھے۔ میر صادق، میر غلام علی لنگڑا، میر قمرالدین اور میر معین الدین ایسے کمینہ فطرت غداران دین و وطن کے باعث بالاخر شیر میسور کو شکست و ریخت سے دوچار ہونا پڑا۔ یونانی مفکر ارسطو کے بقول "کلہاڑا اس وقت تک درخت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جس وقت تک اسی کا دستہ لوہے کے ساتھ شامل نہ ہو"

شیر میسور کے جس کچھار پر منصوبہء شب خون مرتب کرتے وقت فرنگی جرنیل رشحات فکر میں شرابور لحہ لحہ مرتے تھے۔ وفا نما ارباب جفا نے اسے اپنے ہاتھوں سے مٹا دیا۔ وہ فصیل جس میں سنگ گراں بھی روزن دیوار نہ بنا سکے۔ اہل نشیمن نے اس ناقابل تسخیر قلعے کے دروازے کھول کر اغیار کو خوش آمدید کہا۔ اور برطانوی سامراجی آندھیاں جسے برسوں بجھا نہ سکی تھیں وہ شمع حریت اہل خانہ کی پھونکوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہوگئی۔ وہ خیابان اسلام جس کو اغیار کی بجلیاں جلا نہ سکی تھیں پرکاہ نشیمن میں خوابیدہ چنگاریوں سے جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اہل چمن کی جفا کیشیوں سے اس مرد مومن اور بارہ ہزار جانثاران آزادی کے لہو کا تیل رائیگاں ہوگیا۔ اس کوکب آزادی کے ڈوبتے ہی طویل ظلمت شب مسلط ہوگئی۔ وہ ظلمت شب جس کی دائمی تاریکیوں میں سالہا سال روز و شب کروٹیں بدلتے رہیں، گردش لیل و نہار مدتوں انگڑائیاں لیتی رہی تب کہیں امید و عزم کے افق پر ایک درخشندہ آفتاب نظر آتا ہے اور تاریکی وطن میں اجالا کرنے کے لیے جو چراغ جلائے جاتے ہیں وہ تیل و روغن سے نہیں بلکہ لہو سے روشن ہوتے ہیں۔ [illegible] ورا [illegible] تک جل جل کر پگھلتا اور پگھل پگھل کر [illegible]

تاریخ کے اوراق پر دو گروہوں کے تذکرے موجود ہیں۔ ایک ننگ انسانیت اور دوسرا افتخار دین و ملت۔ ابدی ذلت' اول الذکر گروہ کا مقدر بن جاتی ہے اور ان کے لوح کردار پر لکھا ہوتا ہے۔

جعفر از بنگال صادق از دکن!
ننگ ملت' ننگ دیں' ننگ وطن

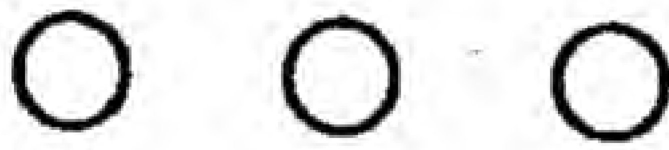
موخر الذکر گروہوں میں سلطان ٹیپو جیسے فرزند توحید شمار ہوتے ہیں جو کبھی سفاکانہ چالوں کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ قوم انہیں عالی ظرف سپوت' فخر دیں اور سیف اسلام کے نام سے یاد کرتی ہے تو دنیا اسے عظیم محب وطن' قومی ہیرو' جنگ آزادی کا سپہ سالار اور شیر میسور کے خطابات سے خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ سلطان ٹیپو نے ہر چیز کو اسلام پر قربان کردیا تو وہ تاریخ کے صفحات پر آج بھی زندۂ جاوید ہے۔ اس کی تربت پر ہر روز سینکڑوں حفاظ کرام تلاوت قرآن میں منہمک رہتے ہیں اور جنہوں نے اسلام کو ہر چیز پر قربان کردیا ان کی شکستہ قبروں پر حسرت ٹپک رہی ہے۔ ان کی خاک لحد کے جگر میں خار مغیلاں سوراخ کر رہے ہیں اور ان کی ویران مرقد پر کوئی فاتحہ خواں نظر نہیں آتا۔

سرفروشی سلطان شہید کا شعار' جانبازی اس کا مسلک اور خطرات میں کود پڑنا اس کی فطرت تھی۔ وہ مرد مومن شیر کی ایک دن کی زندگی کو گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر جانتا۔ آزادی کے ایک لمحہ کو وہ صدیوں پر ترجیح دیتا۔ سلطان ٹیپو نے اپنے اس فلسفہ کو رشتہ عمل سے سرفراز کیا کہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی پنشن پر زندہ رہنے والے راجوں اور مہاراجوں کی ذلت کی زندگی پر موت کو فوقیت دوں گا۔ آپ نے حالات سے صلح کرکے نپولین بونا پارٹ کی روایت کو زندہ نہیں کیا بلکہ شہادت کو اطاعت پر ترجیح دی اور بہادروں کی طرح موت کو گلے لگالیا۔

سلطان فتح علی شہید کے دل میں آزادی کی جو تڑپ تھی اس نے بعد از مرگ بھی انہیں چین سے رہنے نہیں دیا۔ جب سید مہدی علی بلندی کی معیت میں آسمانوں پر گرم سفر تھا تو سلطان شہید ان سے اپنی قوم اور وطن کے بارے میں پوچھتے ہیں ای.

لیے شاعر مشرق سلطان ٹیپو کے لوح مزار پر "شمشیر گم شد" لکھا دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔

آں کہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب واو بیدار بود
رفت سلطان ایں سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز!
زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیری بہ از صد سال میش



قائداعظمؒ

وہ دور کس قدر اذیت ناک تھا جب ہم فرنگی قزاقوں کے رحم و کرم پر تھے۔ ہمارے وقار و تمکنت کے وہ گہرے نقوش جو تاریخ کے سینے پر جا بجا ثبت تھے رفتہ رفتہ انقلاب دوراں کی بے وفائیوں اور زمانے کی دست برد سے مٹ رہے تھے۔ درسگاہوں کی جگہ گوردوارے اور مسجدوں کی جگہ مندر بنانے کے منصوبے آشکارا تھے۔ اس معاندانہ روش پر جو بھی صدائے احتجاج بلند کرتا اس کی زبان آتشیں گولیوں سے خاموش کردی جاتی۔ اس وقت بعض نام نہاد مسلم رہنما بھی اپنی وفاداریاں مغربی لٹیروں سے وابستہ کرچکے تھے۔ اس وقت بانیان مذاہب کی توہین کوئی جرم نہ تھی۔ کہیں رنگیلا رسول جیسے رسوائے زمانہ رسالے شائع کرکے مولائے کائنات، فخر موجودات، امام الانبیاء، شہ بطحا ﷺ کو ہدف تنقید بنایا جا رہا تھا تو کہیں نتھو رام کی تاریخ اسلام جیسی کتابوں میں بزرگان اسلام کو نشانہ طنز و تضحیک بنایا جاتا۔

قصور میں سالار بدر و حنین کی شان با برکات میں نا زیبا الفاظ استعمال کیے گئے تو ادھر سوامی شردھانند کی شدھی اور سنگھٹن جیسی قابل لعن و نفرین تحریکیں بھی ستم رسیدہ مسلمانوں کو برانگیختہ کر رہی تھیں۔ مگر جب کوئی غیرت مند جوشیلا جگر گوشہ اسلام، شاتم رسول کا پیٹ چاک کرکے وفا کیشی کا اعلان کرتا تو اس محافظ ناموس رسالت ﷺ کو تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا۔ غلامی کا وہ زمانہ جب مغربی بجلیاں ہمارے شکستہ آشیانے کو جلانے کے لیے مضطرب تھیں۔ آزادی پسند نیم جاں تحریکوں کے سانس گنے جا چکے تھے۔ دفعتاً سرزمین کراچی سے ایک مرد آہن نمودار ہوا۔ جس نے بکھرے ہوئے انبوہ کو لشکر جرار کی سطوت عطا کی، ہندوؤں کی عیاری اور فرنگیوں کی مکاری کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ بجلیوں کو اپنی بلا کی فکر دامنگیر ہوئی اور غلامی کی فولادی زنجیریں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

غلامی میں کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

وہ مرد آہن گداز قائداعظمؒ تھا جس نے سجدہ گاہوں کی توقیر و حرمت کو برقرار رکھا۔ خاموش و ساکت مہربلب مسلمانان ہند کو اذن نوا بخشا۔ آپ نے سسکتی تنظیموں کے تن بسمل میں روح آزادی پھونک دی۔ اس بطل حریت اور سالار ملت نے درد کو دوا، بادل کو ردا، صرصر کو صبا، اور ظلمت کو ضیاء کا پیرہن عطا کیا۔ بابائے قوم نے تصور کو تصویر، خواب کو تعبیر، تدبیر کو تقدیر، شکست خوردہ کو نصیر اور بندگان اسیر کو عالم گیر بنا دیا۔

محمد علی جناح نے خوابیدہ قوم کو بیدار، حصول آزادی کے لیے بے قرار، خزاں رسیدہ چمنستان کو رشک بہار اور زندگی کو عظمت کی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ ان کا نام سنتے ہی ہمارے سر نیاز، جوش ارادت سے اس لیے جھک جاتے ہیں کہ دور غلامی میں آپ نے ملکہ شب کو سپیدۂ سحر، مردۂ دل کو موج بحر، محروم بینائی کو نور نظر اور ارباب شعور کو معراج فکر عطا کیا۔ رسول عربیؐ کے نام لیواؤں کے لیے ایک آزاد مملکت خداداد حاصل کی۔ ان کے احسانات قید حروف میں اسیر نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ آپ نے گلشن خزاں رسیدہ کو بہار جاودانہ، چراغ سحری کو کوکب زمانہ، دربدر بھٹکنے والوں کو مالک آشیانہ اور ناقابل اعتبار فسانے کو ترانہ بنا دیا۔

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرات رندانہ!

آج کوئی چشم تصور سے دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے اور گوش تصور سے سننا چاہے تو سن سکتا ہے کہ محسن ملت کی روح تڑپ تڑپ کر ہم سے پوچھ رہی ہے "میری متاع گراں مایہ! تم نے کشمیر کا کیا کیا؟ میرا ملک ٹکڑے ٹکڑے کیوں کر ہوا؟ میری قوم! خون جگر سے سینچے ہوئے میرے گلشن کو تو نے ویران کیوں کردیا؟" بانی پاکستان کا نام تو ہم اب تک لے رہے ہیں۔ مگر ان کی روح مقاصد کو یہاں اس طرح کچلا گیا ہے کہ دل تڑپتا اور آنکھ خون کے آنسو روتی ہے۔

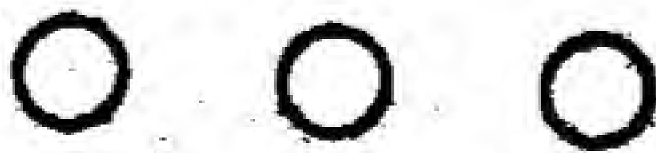
کیا یہ جرم عظیم نہیں ہے کہ آزادی وطن کے دشمن عناصر آج بانی پاکستان کے تقدس کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے ہمارے ہی ملک میں بابائے ملت کے وقار کو مجروح و مذبوح کرنے کی خاطر کج روی اور حرف گیری کی سازش کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ مگر ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

روح پاکستان کے یہ حریف آزادی وطن کے درخشندہ آفتاب پر الزام تراشی کرکے اپنی بے بصری و تنگ نظری کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ورنہ قائداعظمؒ کی عظمت تو اک امر مسلمہ ہے۔

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

"تاریخ کے ایک سو مشاہیر" کے مصنف مائیکل ہارٹ نے کیا خوب لکھا ہے کہ "تاریخ کی نظر میں بڑا شخص وہ ہوتا ہے جس نے اوراق تاریخ پر ایک نقش دوام چھوڑا ہو۔ جتنا گہرا یہ نقش ہوگا اسی قدر نقش چھوڑنے والے کا قد کاٹھ ہوگا" اس لحاظ سے برصغیر کے جملہ سیاستدانوں میں قائداعظم ایک تجیم و تحیم' و جیہہ و شکیل اور نہایت قد آور شخصیت ہیں۔

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لیے
نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے



حضرت علامہ محمد اقبال

یہ قانون فطرت ہے کہ جب کوئی قوم عظمت رفتہ کو بھول جایا کرتی ہے' ورثہ اسلاف کے زیاں کا احساس روپوش ہو جاتا ہے تو یاس و ناامیدی کے بحر بے پایاں میں اس قوم کا سفینہ ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ تب مشیت ایزدی کی طرف سے ایک نمائندہ جلوہ فرما ہوتا ہے جو قوم کی ڈوبتی ناؤ کو ہمکنار ساحل کرتا ہے۔

نغمہ کجا من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہء بے زمام را

برسوں پہلے جب ملت اسلامیہ جاں بلب ہو چکی تھی اور چراغ سحری کی مانند دم توڑ رہی تھی۔ قریب تھا ان کے اذہان مفلوج اور حواس مختل ہو جاتے' یاسیت کا شکار ہو کر غلامی کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھتے کہ دفعتاً" قدرت کی طرف سے اقبال' بلال مشرق کے روپ میں نمودار ہوا۔ سوز جگر سے لبریز جس کی اذان نے خوابیدہ قوم کو بیدار کر دیا۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختہء شام و سحر تازہ کریں

اقبال محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ اقبال جس کے دل میں سارے جہاں کا درد موجزن تھا۔ جس کی آنکھوں میں سیلاب خون متلاطم تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ثریا کے باسی قعر مذلت میں گر چکے ہیں تو دل اس کا پارہ پارہ اور جگر پاش پاش ہو گیا۔ اقبال کی بانگ درا نے کاروان تن آسان کو مضطرب کر دیا۔ پھر تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اور شمع حیات خون جگر کی آمیزش سے ٹمٹما اٹھی۔ آپ کی ضرب کلیم سے جوانوں کا خون کھول اٹھا۔ ضعیفوں کے نحیف و ناتواں دست و پا میں سکت آ گئی۔ ملت اسلامیہ کی تقدیر بدل گئی اور منزل' راہ گم کردہ کارواں کو صدائیں دینے لگی۔ بال جبریل میں انہوں نے جب رباب قوم کے تشنہ مضراب

تاروں کو چھیڑا تو وہ سرمدی نغمے ہویدا ہوئے جس کی مستی سے روح عمل جھوم جھوم اٹھی اور تخیل کو وہ پر پرواز بخشا کہ عقاب رشک کرنے لگے۔ قلب مومن میں وہ سطوت نظر آئی کہ شیر کا کچھار احساس محرومی سے دب گیا۔ اور وہ قوم جو زندگی سے لرزہ براندام تھی قضا کا استقبال کرنے لگی۔

اقبال سے کون آشنا نہیں ہے! وہ اقبال جس نے خودی کو روح کلام بنایا ہے اور کہیں امت مرحوم کو آزادی کا پیغام سنایا ہے۔ اقبال امیری نہیں فقیری چاہتا تھا۔ وہ وزیری نہیں بلکہ ذوق شبیری چاہتا تھا۔ اس لیے وہ خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناتا ہے اور کبھی داتا ہجویریؒ کے مزار پر جاتا ہے۔ اس طائر لاہوتی نے صورت عندلیب گلشن طیبہ میں گیت گائے اور کبھی کوہ اضم پر آنسو بہائے۔

شاعر مشرق مسلمانان عالم کو عظمت رفتہ کی حوصلہ افزاء اور ایمان پرور داستانیں سنا سنا کر نئی منزلوں کی تلاش کا سبق دیتے رہے۔ آہ! اے اقبال آج پاکستان کی خزاں رسیدہ تصویر جس کے بنفشی رنگ غداریوں کی حدت اور ہوس زر کی شدت سے ماند پڑ گئے ہیں۔ پھر کسی مصور بوقلموں کی منتظر ہے کہ کوئی آئے اور موقلم سے تزئین و آرائش بخشے۔ اب اہل درد کی آنکھیں پھر کسی حکیم الامت کی متلاشی ہیں۔

کاش! "دیدۂ بینائے قوم" اقبال کے اس فلسفہ کی حقیقت سمجھ سکتے کہ "جذبات و احساسات کا حقیقت اشیاء پر اس قدر گہرا اثر پڑتا ہے کہ پتھر نے بھی جب خود پر شیشہ ہونے کا گمان کیا تو وہ سچ مچ شیشہ ہو گیا اور ٹوٹنا پھوٹنا اس کا مقدر بن گیا"

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بے زار ہو اپنی کرن سے

اقبال مرد مجاہد بھی ہے اور زندہ رود بھی۔ وہ ہلال مشرق ہے اور کلیم ایشیاء بھی۔ شاعر بھی ہے اور قلندر بھی۔ وہ ترجمان حقیقت ہے' حکیم الامت ہے' پیامبر خودی بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ طالب دیدار رسول مقبول بھی ہے۔ جب اقبال

کا سانسوں سے رشتہ ٹوٹ رہا تھا تو اس کے ہونٹ یوں محو سرود تھے۔

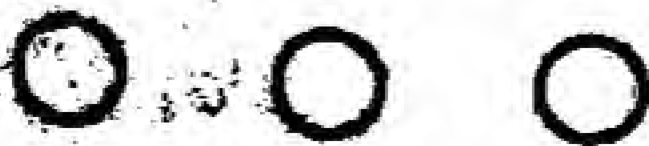
سرود رفتہ باز آید نہ آید!
نسیم از حجاز آید نہ آید!
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نہ آید!

جب روح اقبال چشم زدن میں دربار رسالتؐ میں حاضر ہوئی اور شراب دید سے مشرف ہوئی تو اس شکوہ طراز مرد فقیر کے تبسم آشنا لب فقر خودی کی شہادت دے رہے تھے۔

نشان مرد مومن باتو گویم!
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

"اب اقبالؒ بادشاہی مسجد کے بائیں کونے میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ لیکن وہ ابھی مرا نہیں زندہ ہے اور دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کی رگوں میں رواں دواں ہے۔ ہر روز اورنگزیب کی تعمیر کردہ مسجد کے عظیم الشان مینار اقبال کی مرقد پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اس تاریخی مسجد کے صحن کی پر شکوہ وسعت مسجد کے زینے سے ہولے ہولے اتر کر اس خاک پر قربان ہوا چاہتی ہے جس کی آغوش میں ہمارا اقبال ابدی نیند سو رہا ہے" مال و زر کے تعاقب میں دوڑنے والے ارباب علم و دانش' قلندر لاہوری کی آرام گاہ کا نظارہ کیوں نہیں کرتے۔ جہاں صبح و مسا عقیدت مندان اقبال اپنے پیر لاہوتی کے حضور میں گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب سکندر حیات کی ویراں تربت' قسمت پریشاں پر نوحہ کناں ہے لیکن کوئی فاتحہ خواں نہیں۔ اسی لیے آپ نے فرمایا۔

زیارت گہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی



مظلوم اقبالؒ کی فریاد

بیگم عطیہ فیضی جو بھوپال کے نواب خاندان سے متعلق اور علم و ادب کی دلدادہ تھیں' نے اپنی یادوں کے دریچے وا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگست ۱۹۰۷ء کو ایک پکنک کا اہتمام ہوا جو تعلیم و تفریح کا امتزاج تھی۔ اقبال ان دنوں جرمن کے ایک خوبصورت شہر ہائیڈل برگ میں مقیم تھے۔ مختلف مقامات سے طلباء کو ساتھ لیتے ہوئے جب خواتین پروفیسر اقبال کی رہائش گاہ پر پہنچیں تو یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گئیں کہ اقبال ارد گرد کے ماحول سے بالکل بے خبر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ انہوں نے دو ایک آوازیں دیں مگر جواب ندارد! محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے آثار ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر آپ کو جھنجھوڑا اور اقبال اقبال کہہ کر زور زور سے چلانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ان میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بڑبڑائے کہ مجھے کیوں ڈسٹرب کیا جا رہا ہے۔

میرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا!
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اگر عمیق نظروں سے تجزیہ کیا جائے تو یہی بے خودی ان کے فلسفہ خودی کی بنا ہے۔ عشق رسولؐ میں فنا ہو جانا' ان کے نزدیک پیغام زندگی ہے۔ بعض معترضین کہتے ہیں کہ اقبال مرحوم باریش نہ تھے۔ ان کے فرزند ارجمند لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جاوید اقبال نے بھی لکھا ہے کہ وہ روزہ کبھی کبھار ہی رکھا کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بجا سہی مگر کیا راز ہے؟ کہ وہ شکوہ طراز بڑے بڑے مشائخ کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ علماء نے ان کے اشعار منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر گنگنائے اور آتش نطق سے خرمن دل کو آگ لگا دی۔ میاں شیر محمد صاحب شرقپوریؒ نے بوقت نماز انہیں کو صف اول میں کھڑا کیا۔ یہ صرف اور صرف عشق رسولؐ کا کمال ہے۔

اللہ اللہ ! وہ مرد ہندی جو برصغیر میں رہتے ہوئے بھی ہمیشہ مدینے ہی میں رہا۔ جن کی نگاہیں ہمہ وقت طیبہ کی تجلیوں کے لیے مضطرب اور دائمہ گماں کے ساتھ جبین فکر بھی رسول عربیؐ کے قدوم میمنت لزوم میں سجدہ ریز رہی۔ پچھلے دنوں کی بات ہے کہ میں سوز دروں کے داغ لیے حکیم الامت کے مقبرے پر حاضر ہوا۔ آنکھیں بند کیں کہ جلوۂ مرشد دیکھ سکوں لیکن اسی لمحے میں گھبرا کر کانپ اٹھا۔ میرے غیر مرئی کانوں نے سنا کہ اقبال مرحوم کہہ رہے ہیں۔

میں نے کاغذ پر سجائے ہیں جو تابوت نہ کھول
لفظ جی اٹھے تو ' تو خوف سے مر جائے گا

اور یہ کہ اے میری قوم کی چلتی پھرتی لاشو! خدا کے لیے مجھے نہ ستاؤ۔ زندگی بھر تو ملت بیضا کی بے حسی' بے بسی اور بیکسی پر تڑپتا رہا ہوں اور بعد از زندگی یہ روگ مجھے قبر میں بھی چین سے سونے نہیں دیتا۔ ہر وقت دل کے گہرے زخموں میں پیپ پلتی رہتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے اقبال کو یاد رکھا لیکن روح اقبال کو بھول گئے۔ میری ہڈیوں کو نمائش گاہ بنانے کے لیے سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی سلیں تو سجا دی گئیں لیکن تم سرحدوں پر مضبوط قلعے تعمیر نہ کرسکے۔ میری قبر کے سرہانے شمعیں تو جلائی جاتی ہیں مگر اندھیری رات میں میرے غریب شاہینوں کو اب تلک پڑھنے کے لیے روشنی مہیا نہیں کی جاسکی۔ روشنی تو کیا تم نے ان سے حقوق زندگی ہی چھین رکھے ہیں۔ جب کبھی بھی اونچے محلوں اور دیدہ زیب کوٹھیوں میں جشن چراغاں ہوتا ہے تو نہ جانے ایک چراغ کی لو سے فاقہ مستوں کی کتنی جھونپڑیاں جل جاتی ہیں۔

مناؤ جشن چراغاں لیکن اس احتیاط کے ساتھ
کسی چراغ کی لو سے کسی کا گھر نہ جلے

مزید برآں یہ کہ پہلے تو تم نے میرے دوست قائداعظمؒ کا ایک بازو کاٹ کر انہیں معذور کردیا۔ اب سندھو دیش اور پختونستان کی صورت ان کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہو۔ میری ان لہو لہو آنکھوں نے ڈھاکہ شہر کی بارود میں

گراؤنڈ میں تاریخ اسلام کا جنازہ اٹھتے بھی دیکھا ہے جب ستر ہزار مجاہدوں کے کمانڈر انچیف نے اپنی اور پوری قوم کی شکست و ذلت پر نہایت خوشی کے ساتھ دستخط ثبت کر دیئے تھے۔

غم تو یہ ہے کہ اس روز سلطان ٹیپو اور محمود غزنوی کا جانشین' بھارتی افواج کے سربراہ اور اس کی بیگم کا استقبال کرنے کے لیے ایئرپورٹ پر دستہ بستہ کھڑا تھا۔ ہائے وہ تلخ و نازک لمحہ جب پاک فوج کے جنرل نے اپنا پستول اور تمغے اپنے ہی ہاتھوں سے حریف کو تھمائے۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس ساری کاروائی کی فلم بندی کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ کاش! اس وقت آسمان ہی ٹوٹ پڑتا ہر سال سرکاری سطح پر باقاعدہ "یوم اقبال" بھی منایا جاتا ہے۔ ہاں! تمہیں مجھ سے بڑی محبت ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ تم نے ایں دم اقبال کو سمجھا ہے اور نہ ہی روح اقبال کو میرا عقیدہ ہے کہ

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکر دم کہ راہ بے خطر است!

مگر تمہارا دستور حیات اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس ملی بے حسی اور قرآن نا شناسی پر میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ میرا درس "جو قوم توحید پر متفق نہ ہو سکی وہ نبوت پر متحد ہو گئی" تھا ایسے دوست خدا کسی دشمن کے نصیب بھی نہ کرے۔ جنہوں نے ابھی تک نظام مصطفیٰ سمجھا ہے اور نہ ہی مقام مصطفیٰ"

اہل دل جانتے ہیں کہ ترجمان حقیقت کا مزار' نبی آخر الزمانؐ کے نقش پاکی شوخیوں کا پتا دیتا ہے۔ جگر گدازی کے اس ماحول میں' میں زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہ سکا۔ آنکھوں میں اشک تھے اور دل بھی ڈوبا جا رہا تھا مگر باہر قدم رکھتے ہی اندر کا بے حس و جمید پاکستانی مسلمان جاگ اٹھا اور یہ کہہ کر دل مضطرب کو تسلی دے لی کہ ہم اقبال کے بڑے قدر دان ہیں کیونکہ اقبال مرحومؒ کی آخری آرام گاہ پر مدعیئ لاہوری کے شاہینوں اور دیگر زائرین کا بڑا ہجوم تھا۔

اقبالؒ کا فلسفہ خودی!

تاریخ تصوف میں یہ قول بہت پسندیدہ ہے "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" یعنی جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ خود کو پہچاننے کا نام خودی ہے۔ مگر بعض ارباب علم و دانش خودی کو کبر و نخوت اور غرور و تمکنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جبکہ اقبال کا فلسفہ خودی عرفان ذات' خود اعتمادی' عظمت و رفعت' سطوت و شوکت' جاہ و جلال' خوبی و کمال اور انسانیت کا مظہر اور علمبردار ہے' فرماتے ہیں۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

جو لوگ آشنائے راز خودی ہوتے ہیں ان کا شعار کاسہ لیسی اور دریوزہ گری نہیں ہوتا۔ دست سوال دراز کرنا ان کی فطرت خوددار کے نزدیک مرگ مفاجات کا پیش خیمہ ہے۔ وہ لوگ سر کو کٹا دیتے ہیں لیکن انہیں سر جھکانا نہیں آتا۔

پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

جن لوگوں کی تربیت درسگاہ خودی میں ہوا کرتی ہے ان کے پاؤں کی ٹھوکروں سے "صحرا و دریا دو نیم' پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی" ایوان قیصر و کسریٰ لرزہ براندام' کائنات کی وسعتیں ان کے نقش قدم پر سجدہ ریز' ان کے ولولے تند و تیز موجوں کے لیے پیغام زندگی' ان کی ضرب کلیمی سے سینہ دشت میں شگاف' قلوم خوں آشام ان کے دبدبے سے پایاب اور ان کی صدائے رحیل کاروں سے چٹانوں کے جگر چاک چاک ہو جایا کرتے ہیں۔ اے مسلمان خودی تیرے دم سے ہے اور تو خودی کے دم سے سزاوار بقا ہے اسی لیے سوزن خودی نے کہا ہے

خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

کیا وجہ ہے؟ چنانچہ اس کی ضربوں سے ریگ رواں ہیں اور اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں بھی مانند آب ہے۔ اس لیے کہ خودی حاصل زیست' جوہر حیات اور متاع مومن ہے۔ خودی ہے تو عزت و عظمت ہے' نہیں تو خواری و ذلت۔ خودی سے ہی آزادی و بلند بالی ہے وگرنہ غلامی و پستی۔ خودی زندگی و کمال ہے' نہیں تو شرمندگی و زوال۔ خودی کے شرارے خرمن دل میں پنہاں ہوں تو مومن' قصر دارا و سکندر کو پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتا اور اگر خودی ناپید ہے تو مومن امریکہ و روس اور فرانس و جاپان کے دروازوں سے زندگی کی بھیک اور بقا کی ضمانت مانگتا ہے اور وہ عظمت رفتہ کو بھول جاتا ہے۔

مرد مسلماں کیا تجھے یاد نہیں
کہ تو راز کن فکاں ہے

"ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کا نعرہ لگا کر ساحل سمندر پر جلائی جانے والی کشتیوں کا اداس دھواں خودی کا پرچار کرنے والی قوم کو اب بھی دور رفتہ کا وہ انداز خودداری یاد دلا رہا ہے اور جبل الطارق پر مجاہدوں کے نشان قدم سے یہ ندا اٹھ رہی ہے۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اقبال کا فلسفہ خودی من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی بالکل صحیح تصویر اور جامع و اکمل تفسیر ہے۔ عالمگیری مسجد کے پر شکوہ میناروں کے سائے میں مزار اقبال کا ذرہ ذرہ آج بھی رطب اللسان ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن



"زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن"

ولایت' پادشاہی' علم اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں' فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

عہد نبوی میں سلاطین عرب و عجم تک دین حق کا پیغام بخوبی پہنچایا جاچکا تھا۔ خلفائے راشدین کے عرصہ خلافت میں بھی لاکھوں افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بعد ازاں صفحہ ہستی کے گوشے گوشے کو خورشید صداقت کی کرنوں سے روشن کرنے اور ظلمت دہر میں کرۂ ارض کے کونے کونے میں چراغ ہدایت سے اجالا بکھیرنے والے بزرگان دین ہی تو تھے۔ جادوگران ہند کے گنبد طلسم میں اذان حق اور کفرزار کے بتکدوں میں ندائے توحید بلند کرنے والے یہی مردان دانا و بینا تھے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

تصوف ایک ایسا مسلم روحانی نظریہ ہے جس میں حلول' ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کی دور از کار تاویلیں لایعنی ہیں۔ شریعت' طریقت' حقیقت اور معرفت تو بزم تصوف کے روشن چراغ اور علم' عمل اور اخلاص کا عملی اظہار ہیں۔ خاصان خدا' چشم زدن میں لوگوں کو شراب توحید کے نشے میں مست کردیتے اور دل و نظر کے بت خانوں کو صورت آئینہ صاف کرکے اسے رسول عربیؐ کا گہوارہ اور ذات بے ہمتا کا مسکن بنا دیتے ہیں۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر!
ایام کا مرکب نہیں' راکب ہے قلندر!

ایک حدیث قدسی کے مطابق حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں زمین و آسمان میں کہیں نہیں سماتا مگر مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں۔ اہل نظر کا کام بھی

دلوں میں خسروان و طغیان کی جگہ نیکی کا جذبہ اور آقا و مولاؐ کی محبت و ارادت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح نفوس قدسیہ بڑی خاموشی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کی دنیا بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ روشن ضمیروں کی کرامات کا یہ اثر ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی متابعت کا رنگ چڑھا اور عشق و محبت کی آگ جلا کر حضرت پیر دستگیر شہباز لامکانی محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانیؒ کے اس قول کے مطابق تکمیل ایمان کر دیتے ہیں "مسلم کو مومن، مومن کو عارف، عارف کو محب اور محب کو محبوب کے ارفع و اعلیٰ منصب تک یوں پہنچا دیتے ہیں کہ بقول اقبال:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

روحانی سلسلوں کے بزرگ صاحب ذکر کو صاحب فکر اور صاحب خرد کو صاحب نظر بنا دیتے ہیں۔ شیوخ عظام کا اعجاز نگاہ خاور سے باختر تک، ذرۂ خاک سے درخشندہ اختر تک محیط ہوتا ہے۔ یہ صوفیاء کرام کا ہی کمال تھا کہ وادی ظلمت کے طول و عرض میں جادوگران ہند کے جنتر منتر کا اثر ٹوٹ گیا۔ انہی کی کرامت کا اثر ہے کہ آج بھی ہندوستان میں ندائے توحید کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں داتا ہجویریؒ، خواجہ اجمیریؒ، بابا فرید الدین شکر گنجؒ اور علی احمد صابر کلیریؒ کا فیضان نظر تھا کہ کفر و شرک کی تاریک وادیوں میں اذان حق گونج اٹھی اور صنم خانے بھی صداقت اسلام پر گواہ ہو گئے۔ اسی لئے تو شاعر مشرق نے اعتراف حقیقت فرمایا تھا۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

عہد حاضر کے قحط الرجال میں جو مومن شاذ و نادر ہی ہوں گے۔ یہ محض دکاندار ہیں جو تعویذوں کو بیچتے، دعاؤں کا دھندہ کرتے اور اپنے آباء کے خون میں نقشوں کو ترکرتے رہتے ہیں۔ شاید کہ خانقاہی میخانے بند ہو چکے ہیں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ پیرحرم سلطان پیر کا شور مچا مچا، ولی کرامات کا اثر دکھا دکھا اور ظاہر

وضع قطع سجا سجا کر شب و روز سادہ لوح عوام کی لوٹ کھسوٹ میں محو ہیں۔ اب تو جانشین حضرات جمعیت مشائخ ایسی تنظیمیں بنا کر حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہر قسم کی مراعات پاتے ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ لمبے نام و القاب لکھواتے اور اپنے دین و ایمان کی دولت کو اہل اقتدار کی جوتیوں میں چھوڑ آتے ہیں۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا ہوں مگر آج تک مجھے کسی کے آئینہ دل میں پیر مہر علی شاہ' سید حیدر شاہ صاحب' خواجہ عبدالعزیز چاچڑوی' اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا بریلوی' سید امیر شاہ صاحب' خواجہ چوراہی' شہنشاہ تونسہ' تاجدار سیال شریف اور میاں شیر محمد شرقپوری کا کوئی بھی عکس دکھائی نہیں دیا۔

"قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

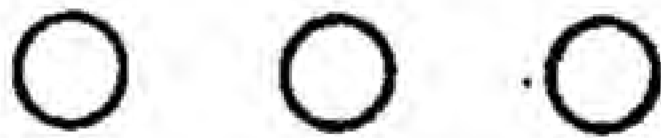
اب کے پیرزادوں کے دل صنم آشنا کو مجاہدہ سے شناسائی نہیں اور ان کی چشم بے بصر کی مشاہدے تک بھی رسائی نہیں۔ یہ صاحب نظر ہیں اور نہ ہی صاحب فکر۔ انہیں فتویٰ کا کچھ علم ہے اور نہ تقویٰ کی کوئی خبر۔ ان کے دام ارادت میں گرفتہ تو کوڑی کوڑی کو ترستے مگر یہ روحانی ساہوکار اپنے تئیں بینکوں' کاروں' بنگلوں اور پلاٹوں کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ انہیں ان سے کوئی نسبت نہیں جو قطرے کو دریا' ذرے کو صحرا' راہ گم کردہ کو رہنما اور ڈوبنے والوں کو ناخدا بنا دیا کرتے تھے۔ وہ خدا کے بندے تھے یہ دنیا کے بندے ہیں۔ وہ مر کر زندہ ہیں اور یہ جی کر بھی مردہ۔

خرقہ خلافت کو درویشی کا سرٹیفکیٹ سمجھنے والو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مقام ولایت کیا ہے؟ فقر مریدوں کا لہو چوسنے' لمبی عبائیں' زرق برق قبائیں زیب تن کرنے اور حیلے بہانوں سے مخلوق خدا کو لوٹنے کا نام نہیں بلکہ خود کو لٹا دینے کا نام ہے۔ مرد کامل وہ تھے جو آدمی کو انسان' انسان کو مسلمان' مسلمان کو صاحب ایمان اور صاحب ایمان کو راز دار کون و مکاں بنا دیا کرتے تھے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے' تو نہیں جہاں کے لئے

قطب الاقلندر حضرت بابا مقصود حسن علیہ الرحمتہ کا یہ فرمان اندھی عقیدت اور گمراہی و ضلالت کے پرخچے اڑا دیتا ہے کہ جب تک کوئی روشن ضمیر مرد خبیر بقید حیات رہتا ہے' قرابت دار اس کے نام کی تجارت کرتے اور جب وہ واصل بحق ہو جاتا ہے تو یہ اس کی قبر کو نمائش گاہ بنا دیتے ہیں۔ طالع آزما اور ہوس پرست "خواجگان" جو محض قبروں کی تجارت سے نکو نام ہیں یہ جلب زر کے لئے پتھروں کے صنم بیچنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا تھا۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
نذرانہ نہیں! سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن!
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!



شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ!

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

ہماری عظمت رفتہ کی داستان' تاریخ عالم کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس سے ہمیں فراموش شدہ حقیقت کا ایقان ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ اقوام عالم کی امام تھی اور دنیا اس کی امامت کو تسلیم کرتی تھی۔ کبھی ہم امامت عالم کے امین تھے مگر جب ہم نے عقیدۂ توحید کو فراموش کردیا تو خدائے وحدۂ لا شریک نے بھی ہمیں فراموش کردیا۔ اور کرۂ ارض کا چپہ چپہ ہماری ہلاکت و بربادی پر نوحہ خواں ہے۔

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے' آبادیاں بن ہو گئیں
خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امید نور ایمن ہو گئیں!

مادی قوتوں کو آج فکر فردا دامن گیر ہے اور وہ تسخیر کائنات پر کمربستہ کئی صدیاں مستقبل کی جانب محو پرواز ہیں۔ مگر ہم ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ کی مانند آخری سانس لے رہے۔ ہیں مشکل یہ ہے جمود و تعطل کی ان فضاؤں میں رک جائیں تو السناک اور رخت سفر باندھ کر اگر ہم ان کے نقش قدم پر اڑان کریں تو خطرناک ہے کیونکہ تقلید مغرب کو اپنا شعار بنا کر ہم عرش کے رہیں گے نہ فرش کے۔ عجب تو یہ ہے کہ اے مسلماں!

کعبہ پہلو میں ہے اور تو سودائی بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا تیرا

میں اس پردۂ اخفاء کی گرہ کشائی کر کے نشتر فکر سے جگر ماضی چاک کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہماری ترقی و تمدن کا راز مستقبل کی نقش گری میں مضمر نہیں۔

ہمارے عروج و کمال کا طویل و عمیق فلسفہ تو گزشتہ شب و روز کے دامن میں پنہاں ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ عظمت رفتہ کی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد کریں اور چہرۂ ماضی کی نقاب کشائی کرکے گزشتہ صدیوں کی وسعتوں میں زخم محرومی کا درماں تلاش کریں۔

پھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں
یہ زخمی آپ کرلیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

فنون شہسواری اور امشب زندہ داری کے درس اول کے لیے مکتبہ ء میسور کے آس پاس قیام و خیام کا انتظام کریں۔ علم جغرافیہ' ریاضی و طب اور دنیائے فلسفہ و تحقیق کے لیے سعدی و شیرازی' بو علی سینا اور رازی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ عالمگیر کا سوز دروں اور ذوق عبادت' شاہی مسجد کے فلک بوس میناروں پر کندہ ہے تو ناصر الدین کے رزق حلال کا کسب بھی دریچہ ء تاریخ سے جھانک رہا ہے۔ اندلسی عربوں کی تہذیب اور صولت و شوکت نے یورپ کے لاف و گزاف کو بالکل ماند کردیا۔ محلوں کی شان و شوکت اور مساجد کی زیب و زینت نے دیگر اقوام کے فن تعمیر اور مندر و کلیسا کو بھی خیرہ کیا تھا۔ علم و ادب کے گوہرہائے گراں مایہ عباسیوں کے خزینوں میں نظر آتے ہیں تو صحراؤں میں اڑتی ہوئی دھول بھی طارق بن زیاد' محمد بن قاسم اور موسیٰؒ بن نصیر کے رعب و دبدبے کی داستان کہہ رہی ہے۔

صلیبیوں سے برسرپیکار ایوبیؒ نے جہاد کے ایمان پرور نمونے پیش کیے۔ ساٹھ فرزندان توحید نے خالدؓ بن ولید کی قیادت میں ساٹھ ہزار مد مقابل گروہ کی صفیں الٹ دیں۔

کیا تم کو یاد نہیں کہ فلسفہ تاریخ ابن خلدون نے مرتب کیا۔ نجوم فلک کے بھید مسلمانوں نے معلوم کیے۔ سائنس کے کلیے اور ایجاد کا آغاز بھی اسلامی مدرسوں سے ہوا۔ کیا تم نہیں جانتے ہو اغیار کی ملی بھگت سازشوں اور سفاکانہ ہتھیاروں نے جیسے سائنس دانوں کے بام تک پہنچا دیے ہیں۔

ہم الٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب
ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں!

راہ خدا میں قربانی کا سبق، سبط رسول مقبولؐ نے دیا۔ شجاعت و جوانمردی میں حیدر کرار کا کوئی مقابلہ نہ کرسکا۔ سخاوت عثمانی کی مثال پیش کرنے سے تاریخ بھی عاجز ہے۔ انتظام سلطنت میں خلیفہ ثانی کا کوئی ثانی نہیں اور امیر المومنین، خلیفتہ المسلمین، امام المتقین، فدائے رسول امین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مستقل مزاجی کے بے نظیر نمونے تاریخ عالم میں نایاب ہیں۔

اے مرد مسلماں! تیرے اعجاز انگشت سے قلعہ امیر پیوند خاک ہوا ابوالحسن خرقانیؒ کے جبوں کی یاد دلا کر محمود غزنویؒ کی مضطرب روح ہمیں آج بھی دعاؤں کے سلیقے سکھا رہی ہے۔

حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

آج ہم سوشلزم کے اصول زندگی اپنانا چاہتے ہیں اور کیمونزم میں مساوات معیشت و سیاست کا دستور تلاش کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں یاد نہیں؟ ہمارے آباء کے کارنامے اس قدر حوصلہ انگیز، امید افزاء اور حیرت انگیز ہیں کہ کسی شاعر کا تخیل اور ادیب کا فسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر تاریخ کی ناقابل تردید روایات گواہ نہ ہوتیں تو شاید سائنسی دور کا انسان بھی اس عروج و کمال کو یکسر جھٹلا دیتا۔ اگر آپ چاہیں تو تاریخ کے اوراق رو رو کر تمہیں وہ داستان سنا دیں گے جس کی ترتیب اوراق خزاں دیدہ کی مانند منتشر ہو چکی ہے۔ آج وہ کتب شکوہ گویا ہے۔

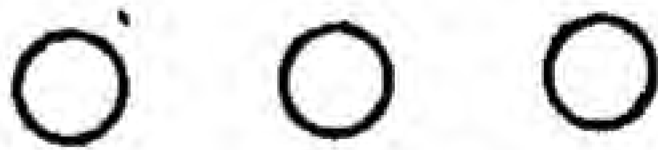
اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

مساوات و برابری کے جو نقش دوام تاریخ اسلام میں نظر آتے ہیں بھلا وہ چین و روس میں کہاں! میں دیکھتا ہوں کہ کہیں جہانگیر عدالت کے کٹہرے میں خاموش کھڑا اپنی زندگی و موت کا فیصلہ سننے کا منتظر ہے تو کہیں شیر شاہ سوری کا

لخت جگر قاضی کے حکم پر اس کی آنکھوں کے سامنے مضروب پڑا ہے۔ ایک بدو کے دعویٰ پر حضرت علی المرتضیٰؓ احاطہ فیصل کے ارد گرد نظر آتے ہیں کہیں خلیفہ ثانی کے لخت جگر کے تن بے روح پر کوڑے برستے دکھائی دیتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کا سفر فاروقی بھی مساوات و برابری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ صدیق اکبرؓ یتیم بچوں کا دودھ دوہتے دکھائی دیتے اور کبھی بے سہارا بوڑھیا کے گھر میں جھاڑو دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تالیف قلوب کے وہ نمونے چھوڑے کہ حاکم و محکوم اور خادم و مخدوم ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے۔ امتیاز کا دارومدار فقط تقویٰ اور پرہیزگاری پر قائم کیا۔ مگر آج ہم نے دریوزہ گری اور کاسہ لیسی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ جدید نظام معیشت و سیاست کے شوق و جستجو میں اسلامی آئین مساوات اور دستور زندگی کو فراموش کر بیٹھے ہیں، شاید ہمیں خبر نہیں کہ دنیا نے آئین اسلام کی خوشہ چینی کرکے ہی نئے نئے اصول ریاست و سیاست وضع کیے ہیں۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را



کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

وہ سجدہ ' روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

چشم فلک نے صدیوں پہلے دیبل کے مندر سے کفر و شرک ' ظلم و تعدی' اور وحشت و بربریت کا پرچم سرنگوں ہوتے دیکھا تو کبھی محمود غزنویؒ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے سومنات پر زلزلے بپا ہوتے دیکھے۔ قطب الدین ایبک سے عالمگیر تک اسلامی جبروت و سطوت کے وہ نمونے دیکھے جن کے سامنے فغفوری کروفر بھی کوئی وقعت نہ رکھتا تھا۔ پھر بنگال کو ویران' دہلی کو بے چراغ' دکن کو اجڑتے اور شیر میسور کی تلوار کو ٹوٹتے بھی دیکھا۔

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری

تاریخ کی سطور پر طویل سفر کے بعد حالات نے ایسی انگڑائی لی کہ انیسویں صدی کے آغاز میں ہم پوری طرح غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے جاچکے تھے۔ برصغیر کے چمنستان سعادت پر تقریباً" سو سال مہیب خزاں کا سناٹا اور فرنگی لٹیروں کا تسلط قائم رہا۔ اس عرصہ اسیری میں ہم سے اخلاقی قدریں اور آزادی کے ولولے چھن گئے۔ ذوق صفدری' وقار عقابی' دستور زندگی اور شعور آزادی بھی سلب کرلیا گیا۔ جس کے بعد ہم مدتوں غلامی کے تاریک غاروں' ذلت و رسوائی کے بوسیدہ مزاروں' ذلت و نکبت کے تپتے ریگزاروں اور زندانوں کی دیو قامت دیواروں میں لرزاں و ترساں رہے۔ قصہ کوتاہ مسلمانوں پر فرنگی مظالم کی طویل داستان کا ماتم چند جملوں میں ممکن نہیں۔

نہ ہی ستارے کی گردش' نہ بازیء افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ

آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی تحریک کا آغاز تو بقول قائداعظمؒ اس دن سے ہوچکا تھا جب برصغیر میں پہلے غیر مسلم نے کلمہ پڑھا لیکن اس کاروان حریت کو مدت ہائے دراز کے پر خطر سفر کے بعد منزل دکھائی دی۔ ایک عظیم انقلابی تحریک اور انتھک جدوجہد کے باعث آخر طویل ظلمت شب کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آفتاب پاکستان طلوع ہوا جو خون میں تر بتر تھا۔

پاکستان حسینوں کی اداؤں سے بنا ہے نہ رقص تبسم کا کرشمہ ہے۔ یہ حنا آلود ہاتھوں کی مہک سے نہ مشاطگی کے انداز ساحرانہ سے معرض وجود میں آیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نقش گری ولوی گلشن میں نہ شب زفاف کی رنگ رلیوں اور نہ ہی حجلہ عروسی کی رعنائیوں میں ہوئی بلکہ لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں اس کی نذر ہوئیں۔ مذبوح و نبسل کلیاں اس سرزمین پر تڑپتی رہیں۔ جوانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ دختران اسلام کے سہاگ اجڑے۔ غیرت مند باپ اور بھائیوں کے سامنے ان کی عصمت کو تار تار کیا گیا اور بے گور و کفن لاشیں مدتوں جمنا و گنگا کے آب رواں پر تیرتی رہیں۔

یہ وہی وطن ہے جسے گمنام شہیدوں کے سیلاب خونیں نے رنگین بخشی اور جن کے خون جگر نے اس سوختہ شجر اسلام کو آشنائے بہار کیا۔ یہ تاریخ کے ان گم گشتہ اوراق کی داستان ہے جو بزرگوں' بیٹوں اور بیٹیوں کے خون سے رقم کی گئی۔

جب قوموں کے ذہن مردہ ہو جائیں تو احساس کی دولت چھن جایا کرتی ہے اور جب احساس باقی نہ رہے تو قوم کی ذہنی پستی اور کور ذوقی اسے اغیار کی دہلیز پر جھکا دیتی ہے اور جب قومیں خانہ اغیار کا طواف کرنے لگتی ہیں تو آباء و اجداد کی میراث گم ہو جایا کرتی ہے اور نتیجہ "مشرقی بازو (مشرقی پاکستان) کٹ جاتا ہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا!

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا!

آزادی ہند کی غیر مترقبہ نعمت کو مینار پاکستان سے ایک خاص نسبت ہے۔ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے نثار مسعود نے "آواز دوست" میں لکھا ہے "اس

برصغیر میں عالمگیری مسجد کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا' وہ مینار قرار داد پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں' تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان تین گم شدہ صدیوں پر ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں' جہاد کی جگہ جمود' حق کی جگہ حکایت کو مل جائے ملک کی بجائے مفاد' ملت کی بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں"

جس میں نہ ہو انقلاب' موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ برصغیر کے سینہ داغ داغ پر نشیب و فراز کے سینکڑوں نشان ثبت ہیں۔ چرخ کج رفتار کے سائے میں قومیں ہمدوش ثریا ہوتی ہیں تو کبھی قعر مذلت کی اتھاہ گہرائیاں بھی ان کا مقسوم ٹھہرتی ہیں' مگر اس گردش لیل و نہار میں قوم حجاز کی داستان اس قدر درد ناک ہے کہ میں جب کبھی امت مرحوم کے عروج و زوال کا مطالعہ کرتا ہوں تو گرد و غبار کے کفن میں لپٹی ہوئی تاریخ کی بوسیدہ کتب سے سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔

یہ نالے وہ ہیں کہ پتھر کے پار ہوتے ہیں
عجب ہے دل میں تیرے کچھ اثر نہیں ہوتا



کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟

(چند تقریروں کی باہم ترتیب کا ایک نمونہ)

میدان جدل کی دنیا کا یہ دستور پرانا ہے
سر بھی گرا ساتھ اس کے جس کے ہاتھ سے تلوار گری

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جن لوگوں کی شمشیریں زنگ آلود ہو گئیں اور جن کی انگلیاں طاؤس و رباب کے تاروں پر رقص کرنے لگیں وہ لوگ دولت و عزت' متاع غیرت اور شہرت سے محروم ہو گئے۔ جن لوگوں نے کاکل و رخسار کی سحر انگیزیوں' حسن و رعنائی کی عطر بیزیوں اور سفلی جبلتوں کی ہوس انگیزیوں پر سپاہیانہ جوہر نچھاور کر دیئے۔ شب زفاف اور حجلہ عروسی کے اشتیاق میں جنہوں نے میدان کارزار کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ ہمیشہ جغرافیے کی حدود و وسعت سے نکل کر تاریخ کے اوراق میں سمٹ کر رہ گئے۔ الکبیر کی آبشاریں' بغداد کی تباہی اور قرطبہ و غرناطہ کے کھنڈرات اس پر گواہ ہیں کہ جو قوم اسلاف کی عظیم روایات سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے' جس وقت سپاہیانہ سخت کوشی کی بجائے تن آسانی اور جنگی سرگرمیوں کی جگہ شطرنج کے مہروں کو مل جاتی ہے الغرض جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں' جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے۔ ملک کی بجائے مفاد' ملت کی بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو زندگی کی اقدار چھن ہی جایا کرتی ہیں۔ محمد شاہ رنگیلا جیسے عیاش لوگوں کا سریر آرائے تخت ہو جانا ہی دہلی کے جاہ اور غلامی مقدر ہو جانے کی دلیل ہے۔

تجھ سے ہی قد سے نہ اونچے کہیں نکل جائیں
جو پاتال میں تھے کبھی' اب ابھر کر آئے!!

میں نے جب نشتر فکر سے ماضی کا جگر چاک کیا تو اوراق پارینہ نے رو رو کر

اپنی حسرت بھری داستان کہہ دی یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ برصغیر کے سینہ داغ داغ پر نشیب و فراز کے سینکڑوں نشان ثبت ہیں۔ چرخ کج رفتار کے سائے میں قومیں ہمدوش ثریا ہوتی ہیں اور کبھی قعر مذلت کی اتھاہ گہرائیاں بھی ان کا مقسوم ٹھہرتی ہیں۔ مگر اس گردش لیل و نہار میں قوم حجاز کی داستان اس قدر دردناک ہے کہ میں جب کبھی بھی امت مرحوم کے عروج و زوال کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں تو گرد و غبار کے کفن میں اٹی ہوئی تاریخ کی بوسیدہ کتاب سے سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔

اس دوراہے پر ہمیں آزادی کی غیر مترقبہ نعمت کے تحفظ کی قسم کھانی چاہیے۔ ہماری آزادی عرصہ ہائے دراز کی جدوجہد اور مبنی برخلوص سجدے کا ثمر ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے آباء کے اس سجدے کی قدر نہ کی تو کسے خبر کہ ہمیں یا آئندہ نسل کو سجدہ سہو ادا کرنا پڑے۔

ہر شخص کی جبیں پہ ہے پژ مردگی کا عکس
چہروں پہ زندگی کی تمازت کب آئے گی
اپنی بیتابیوں کا سبب بھی نہیں ہمیں معلوم
اپنے کیے پہ ہم کو ندامت کب آئے گی!

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پاکستان حسینوں کی اداؤں سے بنا نہ یہ رقص تبسم کا کرشمہ ہے۔ یہ حنا آلود ہاتھوں کی مہک سے نہ مشاطگی کے انداز ساحرانہ سے معرض وجود میں آیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نقش گری وادی گلشن میں نہ ہی شب زفاف کی رنگ رلیوں میں اور نہ ہی حجلہ و عروسی کی رعنائیوں میں ہوئی بلکہ لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں اس کی نذر ہوئیں' جوانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ دختران اسلام کے سہاگ اجڑے' غیرت مند باپ اور بھائیوں کے سامنے ان کی عصمت کو تار تار کیا گیا اور بے گور و کفن لاشیں جمنا و گنگا کے آب رواں پر تیرتی رہیں۔

ہاں ہاں یہ وہی پاک وطن ہے جسے تمام شہیدوں کے سیلاب خونیں نے

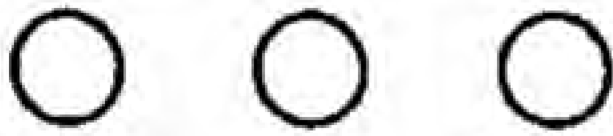
رنگینی بخشی۔ یہ تاریخ کے ان گم گشتہ اوراق کی داستان ہے جو بزرگوں' بیٹوں اور بیٹیوں کے خون سے رقم کی گئی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آج ہر جگہ اور ہر وقت اسلام کی بجائے "اسلام آباد" کی بات ہو رہی ہے۔ لعل و یاقوت اور زمرد کی قیمتی مالا پر سیاستدان ہمہ وقت اقتدار اقتدار اور اقتدار کا ورد جپتے سنائی دیتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جس قوم کے ہیرو یاسر عرفات کی بجائے "کرکٹ کے ہیرو" ہوں تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ قریب ہی کرکٹ کا ایک عاشق نامراد بیٹھا تھا' فوراً" چیخ اٹھا' کیوں جناب کیا ہوا؟ جواب دیا گیا کہ وکٹ بیا اور رنز شمار کشمیر کیوں کر آزاد کرا سکیں گے۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو کر بولا۔ تم مقبوضہ کشمیر کی بات کرتے ہو اگر آزاد کشمیر بھی جاتا ہے تو چلا جائے ہمیں اس کا کوئی غم نہیں ہو گا۔ لیکن کرکٹ ہمارا دھرم اور قوم و وطن کا سب سے بڑا اثاثہ ہے لہٰذا اس پر تنقید برداشت نہیں ہو سکتی۔

اپنے زخموں کی میں کس طرح نمائش کرلوں
اس کی عادت ہے وہ سورج کو بھی جھٹلائے گا

جو لوگ اس قدر آزاد خیال اور بے حس ہوں ان کے سامنے سقوط ڈھاکہ کا ماتم کرنا بے معنی ہی تو ہے۔ سوچتا ہوں کہ عمرانی و محسنی امت جو رینا رائے کی کلمہ گو ہے سندھو دیش اور پختونستان کے خطرات و سازش کو کیا بروقت محسوس کرسکے گی؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں "قطع نظر اس کے رشوت ستانی' دھوکا دہی' ذخیرہ اندوزی اور جا بجا لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ انفرادی مفاد کو اجتماعی منفعت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام کی چکی میں بیچارے مزارعہ مدتوں سے پس رہے ہیں۔ ہوس زر کا یہ عالم ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ ظلم تو یہ ہے کہ کسی کو تن ڈھانپنے کے لئے اپنے روح کو بھی ننگا کرنا پڑتا ہے۔ ستم بالائے ستم ہم نے افعال قبیحہ کے نام تک بدل رکھے ہیں۔ حیلہ روباہی کو سیاست' رشوت کو صلہ خدمت' مکر و فریب کو کاروباری مصلحت' بے حیائی کو طرز معاشرت اور اخلاقی بے راہ روی کو ثقافت کا نام دے رکھا ہے۔ باوجود

اس کے ہم معزز، مہذب اور محب وطن شہری ٹھہرے۔ وہ کونسی برائی ہے جو ہم میں نہیں۔ ہم اپنے ضمیر کی عدالت میں شاید کوئی فیصلہ نہ کر پائیں۔ اس لیے مصور پاکستان کے حضور چلتے ہیں۔ جہاں بدقسمتی سے شاہی مسجد کے پرشکوہ میناروں کے سائے تلے مدتوں سے بازار حسن میں جنس نسواں کی نمائش ہو رہی ہے۔ اور روز و شب اورنگ زیب کی جاں بلب بیٹی کی حرمت کا کفن تار تار کیا جاتا ہے۔ مسجد میں باقاعدگی سے اذان گونجتی ہے تو اکثر اوقات نزدیکی محلے سے پازیب کی چھن چھن بھی سنائی دیتی ہے۔ عصمت دریدہ کی چیخ اور گھنگرو کی نقرئی گھنٹی خانہ خدا کے کاخ و در سے ٹکرانے کے بعد مجسمہ سوال بن کر اقبال کے حضور میں پیش ہوتی ہیں جہاں اقبال، مسلم بیٹی کے زخمی روح کو سینے سے لگا لیتے ہیں اور پھر اہل گوش کو اقبال مرحوم کی زہرہ گداز ہچکیاں صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔

اب آگ پھیلتی جاتی ہے حسرت غم کی
جہاں میں آشیانہ کوئی جل گیا ہوگا



باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کرچکا ہے تو امتحاں ہمارا

(ایک رخ)

جب کوئی قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے تو جغرافیہ بھی اس قوم کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ ایک جامع' مکمل ' مدلل مبنی بر حقیقت اور روز روشن کی طرح واضح نظریہ ہے جس کی تردید کی جاسکتی ہے اور نہ ہی انکار ممکن ہے۔ آج اگر ہم من حیث القوم پر خطر دوراہے پر کھڑے ہیں اور جا بجا طوفانوں میں گھرے ہوئے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارا پہلی بار امتحان ہو رہا ہے یا کہ ان مصیبتوں ' پریشانیوں' طوفانوں اور تباہیوں سے ہمارا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔

عشق و مستی نے کیا ضبط نفس مجھ پر حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موج نسیم!

تاریخ اور جغرافیے کے فلسفے کی حقیقت جانچنے کے لیے میں نے کتابوں کے اوراق کو کھنگالا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ جب بھی امت مسلمہ اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کو فراموش کرکے گریہ صراحی اور پائل کی چھن چھن پر اپنے دین و دنیا کی کائنات نچھاور کرنے لگی تو ان کے مقدر کا ستارہ آسماں کے اس افق سے ٹوٹا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اغیار کے پاؤں پڑ گیا۔

میں نے جگر کے زخموں' دل کے داغوں اور آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ تاریخ میں بغداد کی تباہی کا حال بھی دیکھا ہے جب تاتاری مورو ملخ کی طرح اٹھے اور ہر طرف عالم اسلام پر چھا گئے۔ ایران اور ترکستان کو زیر و زبر کر ڈالا۔ تاریخ و تمدن کے بڑے بڑے مراکز کو انہوں نے پل بھر میں تاراج و بے چراغ بنا دیا۔ وہ شہر جن کی چھاتیوں سے ہو جمائیہ کے حسین و جمیل محل لپٹے ہوئے تھے۔ قبرستانوں میں تبدیل ہوگئے۔ انسانی سروں اور لاشوں کے کئی مینار

بنائے گئے، جن پر کھڑے ہو کر انہوں نے ہلاکت و بربادی اور چنگیزیت کا وہ منظر پیش کیا کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ تاریخوں میں اس طرح کا ہیبت ناک کوئی واقعہ دنیا میں نہیں ملتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسلمان بالکل مایوس و ناامید ہوچکے تھے۔ جس کا اندازہ ان کے اس مقولہ اور کہاوت سے لگایا جاسکتا ہے کہ "ہر بات مان لینا لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکے میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو ہرگز باور نہ کرنا"

لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنے پڑے "کہ بالآخر اسلام اپنی گزشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے اٹھا اور انہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کرلیا" یعنی تاتاریوں نے انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا جن کو انہوں نے پیروں تلے روندا تھا۔

جس کو سمجھے ہوئے بیٹھا تھا میں قاتل اپنا
وہی اک شخص میرے غم کا سہارا نکلا

آمدم بروئے موضوع، اسلام دنیا میں دبنے کو نہیں آیا۔ قدرت نے دین فطرت میں لچک پیدا کی ہے۔ جس قدر اس کو دبایا جائے یہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اگر آج تاحد نگاہ بگولے ہی بگولے دکھائی دیتے ہیں۔ افغان بہنوں، کشمیری دوستوں، فلسطینی بھائیوں اور بھارت میں مسلم کش فسادات کا شکار ہونے والے مظلوم مسلمانوں کی چیخیں، ہچکیاں اور سسکیاں ہمہ وقت ہمارے پردۂ سماعت سے ٹکراتی رہتی ہیں تو گھبراہٹ کے عالم میں دیواروں سے سر ٹکرانے کی ضرورت نہیں۔ افغانستان کے راستے روس کی طرف سے پاک وطن کی سرحد پر مسلسل ہوائی فائرنگ اور دیگر خلاف ورزیوں سے دل برداشتہ ہو جانے سے کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا۔

میری نگاہ سے دیکھئے اور اطمینان قلب رکھیے! مشیت ایزدی ہمارے شامل حال تھی، ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گی۔ اس لیے وہ وقت دور نہیں جب ایک

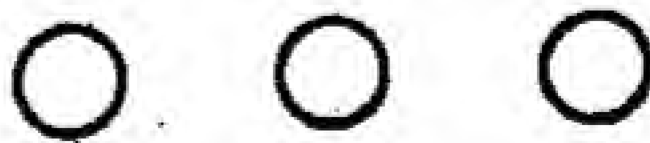
روس تو کیا پوری دنیا کے کیمونسٹ ممالک! کارل مارکس اور لینن کے نظام معیشت و معاشرت کہ جن کا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں۔ بیٹے کو باپ کی خبر ہے اور نہ بھائی کو بہن کا علم۔ ماں اپنی اولاد سے لاپروا ہے اور اولاد والدین سے الرجک! ایسے غیر فطری و غیر انسانی اطوار سے ستائے ہوئے لوگ جلد یا بدیر بالاخر قبول اسلام پر مجبور ہو ہی جائیں گے۔

مقدمہ ابن خلدون کا یہ فلسفہ تاریخ آدم کا بالکل صحیح عکاس ہے کہ چار نسلوں جس کا تخمینہ سو برس کے قریب کیا جاسکتا ہے' میں ہر معاشرے کی تہذیب اور رسم و رواج' ہر ریاست کے نظام حکومت' ہر خاندان کے وقار اور انقلاب کا پرچار کرنے والوں کے زاویہ نگاہ و انداز فکر میں بہر حال بڑی واضح اور نمایاں تبدیلیاں رونما ہوا کرتی ہیں۔ اس دوراہے پر میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خلوص دل کے ساتھ کسی جدید مگر دلکش و دلنشیں طرز تبلیغ کے ساتھ اپنی اسلامی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اپیل کروں گا۔ اگر ہم نے یہ طریقہ اپنالیا تو بفضلہ تعالیٰ وہ دن دور نہیں جب اہل روس میدان عرفات میں قبول اسلام کا اعلان کریں گے۔

دوستان عزیز! میرے اس خیال کو دیوانے کا خواب' نقش بر آب یا صدابصحرا نہ سمجھیں۔ بس ایک مرد مجاہد کی ضرورت ہے وہ مرد مجاہد جس کے بارے میں بلال مشرق نے کہا تھا۔

چیتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبرئیل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

(یہ تقریر آج سے دس برس پہلے لکھی گئی تھی' اسی تناظر میں سمجھا جائے)



قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش!
جس نے نہ ڈھونڈی سلطان کی درگاہ

(دوسرا رخ)

ابھی کچھ دیر پہلے میرے ایک دوست درد بھری چیخیں سنا رہے تھے۔ ان کی باتوں میں گہرائی تھی اور گیرائی بھی۔ کہیں وہ جذبات کی رو میں بہہ گئے اور کبھی انہوں نے سنجیدگی کا دامن تھام لیا۔ میں ان کے تصور کو دیوانے کا خواب یا صدا بہ صحرا تو نہیں سمجھتا لیکن ایک اصولی اختلاف ضرور ہے۔ انہوں نے چنگیزی قبیلے کے قبول اسلام کی طرف اشارہ تو کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ تاتاریوں کو کلمہ اسلام پڑھانے والے کون تھے؟ اور ان کے دلوں کو کس نے فتح کیا؟ اب ان مبلغین جیسا خلوص، وہ درد، وہ تڑپ، وہ عشق رسولؐ وہ خوف خدا اور وہ نظر کہاں سے لائیں۔

بڑے خطرے میں ہے حسن گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آگئی دیوار زنداں، ہم نہ کہتے تھے

در حقیقت بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، خدا پر اعتماد نہیں کھویا تھا۔ عشق رسولؐ نہیں کھویا تھا۔ عقیدہ و ایمان نہیں کھویا تھا۔ روحانی طاقت بھی نہیں کھوئی تھی۔ شکست تو عیاش اور نالائق بادشاہوں نے کھائی تھی۔ اسلام اپنی جگہ پر تمام صداقتوں کے ساتھ جوں کا توں موجود تھا۔ حتی کہ بغداد والوں نے دیکھا جمعہ کا مبارک دن ہے، تاتاری حکمران "سلطان غازی" اور اسکے وزراء پر نم آنکھوں سے سر کو جھکائے اور ہاتھوں میں تسبیح لیے قبول اسلام کی خاطر جامع مسجد کو جا رہے ہیں۔

چغتائی شاخ کا واقعہ یوں ہے کہ ایک روز شیخ جمال الدینؒ اتفاق سے شہزادہ تغلق تیمور کی شکار گاہ میں سپاہیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور شہزادے کے روبرو پیش کیے گئے۔ آپ کو دیکھتے ہی وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور بڑبڑانے لگا کہ تم

ہے تو میرا کتا ہی اچھا ہے" شیخ موصوف نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا' اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں ورنہ آپ کا کتا اچھا ہے۔" یہ سننا تھا کہ تیمور تغلق کے دل پر ایک چوٹ لگی' کیونکہ "ہرچہ از دل مے خیزد بردل مے ریزد" پھر ایک وہ وقت بھی آیا کہ تاتاری شہنشاہ کے محل میں اذان کی آواز سنائی دی اور پورا تاتاری قبیلہ آقائے مدنیؐ کی غلامی میں آگیا۔

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے ترا؟
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرات تو مکر جا

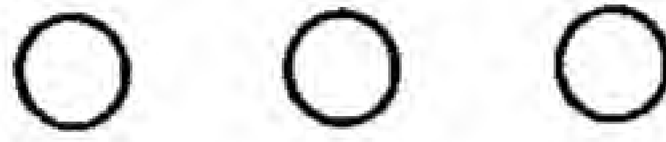
مزید برآں یہ کہ میرے اس دوست کے بقول مظلوم مسلمانوں کی چیخیں ہچکیاں اور سسکیاں ہمہ وقت ہمارے پردۂ سماعت سے ٹکراتی رہتی ہیں تو گھبراہٹ کے عالم میں دیواروں سے سر ٹکرانے کی ضرورت نہیں۔ دل برداشتہ ہونا واقعی عبث ہے لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہنا بھی کوئی دانائی نہیں۔ ہماری بقا کا راز جہد مسلسل' جہاد' اور قربانی میں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم تحفظ حرم اور تحفظ وطن کے لیے سروں پر کفن باندھ کر میدان عمل میں آجائیں۔ ترکی کے نامور ہیرو' کمال اتاترک نے اپنے ملک کے مسلمانوں میں روح انقلاب پھونکتے ہوئے ایک موقع پر بڑی وزنی اور حقیقت پسندانہ بات کہی تھی "جب کوئی قوم اپنی آخری قربانیاں دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔"

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا!

دوسری قوموں کا تو ذکر ہی کیا؟ ذرا مسلمانوں کے فلسفہ زندگی کو موضوع گفتگو بناتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اسلامی سال محرم سے شروع ہوتا ہے جبکہ آخری ماہ ذوالحجہ ہے۔ اس ترتیب میں ہمارے لیے ایک درس ہے اور ابدی پیغام بھی۔ کون نہیں جانتا کہ محرم کے پہلے عشرہ میں جگر گوشہ رسولؐ حضرت امام حسینؓ ان کے ساتھیوں اور خاندان نبوت کے افرادوں نے حق کی زندگی اور باطل

کی موت کے لیے کربلا کے صحرا میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی نذر کردیا تھا جبکہ ذوالحجہ کے عشرۂ اول میں ہم قربانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس روز گلی کوچوں میں خون' بازاروں میں خون' ہر گھر' ہر گاؤں' ہر شہر بلکہ ہر جگہ تاحد نگاہ خون ہی خون دکھائی دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہماری ابتداء بھی قربانی ہے اور انتہا بھی قربانی۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانہ مضراب



خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے!
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے!

آج ہم پر خطر دوراہے پر کھڑے ہیں۔ جا بجا آشیانوں پر بجلیاں گر رہی ہیں۔ اغیار کی رعد و برق ہمارے آشیانہ وقار و تمکنت کو راکھ کا ڈھیر بنا چکی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان چیخ چیخ کر کسی فریاد رس کو پکار رہے ہیں تو فلسطین میں ان کے مقدس خون کی بہتی ندیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف سے بے بس و بے کس بھارتی مسلمانوں کی آہ و بکا اور نالہ و شیون کی باز گشت کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ہمیں ہلکان کیے جا رہی ہے کہیں جسور و غیور بوسنیائی عوام پنجہ عیسائیت میں تڑپ تڑپ کر روح غزنوی و ایوبی کو تڑپا رہے ہیں۔

شکست و ریخت کے ایسے شواہد کی موجودگی میں 'غارتگری کی دلہیز پر بیٹھے اگر میں یہ کہہ دوں کہ عظیم امریکہ کا صفحہ ہستی پر وجود تک نہیں تو آپ یقیناً میرے فاتر العقل ہونے کا فتویٰ صادر کریں گے کیونکہ امریکہ اس دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہے اور آپ کے نزدیک ان کی مادی قوت اور سائنسی تکنیک طشت ازبام ہے جو ان کی مادی قوت اور سطوت و جبروت سے انکار کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک کم عقلی ولا علمی کا اقرار کرتا ہے۔

کیا آپ اسی لیے مجھے مخبوط الحواس کہتے ہیں؟ نہیں نہیں' میں دیوانہ نہیں۔ خرد و شعور سے بیگانہ نہیں۔ کاش اے مسلماں تو نقشہ عالم کو میری نظر سے دیکھ سکے تو تجھے یقین محکم ہو جائے کہ ان کا وجود مانند حباب ناپائیدار و مستعار ہے ان کے آلات عسکری آبلہ کف سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

آہ ' اے مسلماں تجھ پر امریکہ و اسرائیل کے خوف سے رعشہ کیوں طاری ہے؟ اسے خودی کہتے ہیں اور کیا یہی متاع خودداری ہے؟ اے فرزند مسلم تیری تحریر و تقریر میں تملق کا انداز کیوں ہے؟ غیرت مردہ اور تیرا ایمان ناساز کیوں ہے؟

ہاں' تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے ان کی خودداری بھی دیکھ

کیا انقلاب زمانہ ہے؟ جن کے خرمن طیش سے بجلیاں آتش کی بھیک مانگا کرتی تھیں۔ جس کے ولولوں کے آگے شورش سے معمور بھری موجیں سجدے کیا کرتی تھیں۔ جنھوں نے بندۂ نوازیوں کے آئین ترتیب دیئے' مساوات کے دستور مرتب کیے۔ جنھوں نے ایران و روم کے شاہی محلات زیر و زبر کر ڈالے۔ کائنات کے راز ہائے سربستہ کو فاش کیا اور جن کے نقش قدم پر صرصر نے مسکن بنائے۔ آج ان کا آشیانہ افکار و عمل جوش جہاد' مذاق خودی اور دستور زندگی سے تہی ہے۔

وصف خودی کو حرف جنوں میں کر تلاش
انسان کی زندگی کی جلا آبرو میں ہے

اے مسلماں! روح قرآنی سے اگر تیری شناسائی ہو جائے تو تو امریکہ و بھارت کو پاؤں کی ٹھوکروں سے اڑا سکتا ہے۔ اگر تجھ میں ذوق حیدریؓ و جوش شبیریؓ پیدا ہو جائے تو تیری خاک کف پاء سے ناقابل تسخیر قلعے تعمیر ہو سکتے ہیں اور اگر تو شیر میسور کی شمشیر برق پاش کو تلاش کر سکے تو مغربی مائیں اپنے بچوں کو آج بھی تیرے نام سے ڈرایا کریں گی۔

اے گم گشتہ خزانوں کے وارث' گنبد خضرا اگر تیرے تصورات کا مرکز و محور بن جائے اور خاک نجف تیری آنکھ کا سرمہ ہو جائے تو کارکنان قضا و قدر دنیا کی عظیم سلطنتوں کو پاش پاش کر کے تیرے پاؤں کے نیچے پھینک دیں گے۔

فضا تیری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

آج ہم حریفان حق کا نام سنتے ہی اس لیے کانپ جاتے ہیں کہ ہمیں دربار پرویزی میں اسلامی سفیر کی وہ شان بے نیازی و بے باکی یاد نہیں رہی۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے خوف سے ہمارے دل اس لیے دہل جاتے ہیں کہ ہم حدود چین میں سرفروشان توحید اور وفا کیشان رسول کی اس جگر کاوی کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ آج ہم حصول اسلحہ اور تعلیم و تدریس کے لیے مغربی وادیوں کا طواف کر رہے ہیں۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

جو قومیں اغیار کی دہلیز پر سر نیاز خم کرتی ہیں وہ صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دی جاتی ہیں۔ زندہ رہنے کا حق اسے ہوتا ہے جو اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنے کا خوگر ہو۔ مگر مسلماں تجھے کیا ہوا؟ تجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تیرا مقام کیا تھا؟

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

امریکہ کی عسکری قوت سے لرزنے والو! یہ بھی یاد رکھو کہ طوفانوں میں بھی زندگی کے سامان موجود ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ کافر کو زندگی عزیز اور راہ خدا میں مومن کو موت عزیز تر ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ کیا ہے کہ تو در غیر پر سجدے کر کے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ میری تو یہ دعا ہے کہ کوئی بندۂ خدا۔

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے



بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام' خون جگر کے بغیر

تاریخ عالم شاہد ہے جن لوگوں کی شمشیریں زنگ آلود ہو گئیں اور جن کی انگلیاں طاؤس و رباب کے تاروں پر رقص کرنے لگیں۔ وہ لوگ ہمیشہ دولت و عزت' متاع غیرت اور شہرت سے محروم رہ گئے۔ جن لوگوں نے کاکل و رخسار کی سحر انگیزیوں' حسن و رعنائی کی عطر بیزیوں اور سفلی جبلتوں کی ہوس انگیزیوں پر سپاہیانہ جوہر نچھاور کر دیئے' شب زفاف اور حجلہ عروسی کے اشتیاق میں جنہوں نے میدان کارزار کو خیر باد کہہ دیا ان کے تابندہ نقوش لوح جہاں سے ماند پڑ گئے۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است!

اگر آپ اس حقیقت کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تو دریائے الکبیر کی آبشاروں سے پوچھئے جن پر سسکیوں کا گمان ہوتا ہے اور قرطبہ و غرناطہ کے کھنڈرات سے عظیم بلاد اسلامیہ کے خد و خال تلاش کیجئے۔ جن کے حسن و رعنائی نے شمس و قمر کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔

جو قوم اسلام کی عظیم روایات سے اپنا رشتہ توڑ دیتی ہے۔ سپاہیانہ سخت کوشی کی بجائے تن آسانی کو اپنا رفیق حیات سمجھ لیتی ہے۔ جب جنگی سرگرمیوں کی جگہ شطرنج کے مہروں کو مل جاتی ہے تو زندگی کی اقدار چھن جایا کرتی ہیں۔ غلامی ان کا دائمی مقدر بن جاتی ہے اور آئندہ نسلیں ان کی ویران قبروں پر حقارت سے کنکر پھینکا کرتی ہیں۔ مگر اس کے برعکس کامیاب و کامران وہ ہوئے جن بندگان خدا نے شریعت اسلامیہ اور نیابت الٰہی کے حقیقی مفہوم کو سمجھا۔

پھولوں کی دنیا سے نکل کر خار مغیلاں کے راستوں پر گامزن ہوئے۔ سلگتی چنگاریوں کو کلیوں سے تشبیہ دی۔ جن کے عزم و ثبات نے چٹانوں سے ٹکرانے کو بازیچہ طفلاں جانا اور جنہوں نے رود رواں کی طغیانی کو سراب سمجھ کر ثابت کردیا۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اس کارگاہ زیست میں منزل تک وہی پہنچے جنہوں نے کربلا کے تشنہ صحرا کی پیاس اپنے لہو سے بجھائی اور جن کی شمشیر آبدار کی چمک نے شیروں کی آنکھیں چندھیا دیں۔

آئینہ تاریخ میں آج بھی وہ معرکے دیکھے جاسکتے ہیں جب نہتے مسلمان عقابی روح' جرأت شیرانہ اور پیغام انقلاب لے کر اٹھے تو دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی ان کے آگے ٹھہر نہ سکیں۔

ہٹلر نے اپنی قوم میں ذوق انانیت اجاگر کرکے دنیا کی عظیم الشان طاقتوں سے ٹکر لی' کہیں اتا ترک نے احساس خودداری' آزادی کی تڑپ اور انقلاب کا درس دے کر قوم کو نئی زندگی سے آشنا کیا۔ اگر ویت نامی قوم میں سپاہیانہ صلاحیت اور عسکری قابلیت کے پائیدار جوہر موجود تھے تو دنیا کی عظیم طاقت امریکہ بھی اسے شکست نہ دے سکی۔

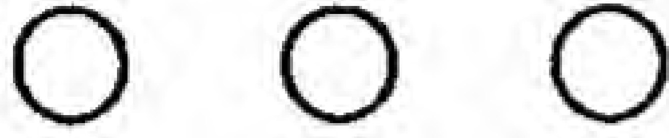
اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس

آج اگر پسماندہ قومیں جنگی پیچ و خم اور فوجی زیر و بم سے نا آشنا ہیں تو بڑی طاقتیں کانچ کا کھلونا سمجھ کر ان سے کھیلنا چاہتی ہیں۔ اس لیے تقاضائے وقت اور نظریہ ضرورت ہے کہ ہم اسلاف کے گم گشتہ خزانوں کی تلاش کریں اور افسانوں کی دنیا سے نکل کر معرکوں کی خونچکاں داستانیں رقم کریں۔

اس میں مستقبل اور معرفت نفس کا راز مضمر ہے اور اسی میں نیابت الہیہ

کا اسرار پنہاں ہے کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کا دار و مدار صرف اور صرف اس فلسفے پر ہے۔

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک



ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

انتشار و افتراق کے بگولوں میں قوم فاران کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ مسلم ریاستیں نا اتفاقی و بیگانگت کے بحر بیکراں میں غرق ہو چکی ہیں۔ باہمی تصادم میں بھائی کے سینے میں بھائی کا نیزہ اتر رہا ہے۔ بھارتی درندوں نے دندان آز میں کشمیری بھائیوں کو جکڑ رکھا ہے تو کہیں مسلم کش فسادات میں ان کے بریدہ سر نمائش گاہوں کی زینت بنائے جا رہے ہیں اور آج امریکہ کا نوزائیدہ بچہ اسرائیل بھی عرب بھائیوں کا خون پینے پر مصر ہے۔ وہ قوم جس نے خیر الامم' سلطان معظم' سالار بدر و حنین کی قیادت میں کفار کی صفیں الٹ دیں۔ آتش کدہ فارس کو ٹھنڈا کیا اور جنھوں نے ظلم و استبداد کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ اور طاغوتی قوتوں کو تہس نہس کر ڈالا۔ آج ان کے اتفاق کی لڑی ٹوٹ چکی ہے۔ موتی بکھر گئے ہیں اور تنزل کی گھاٹیاں ان کا مقدر بن گئی ہیں۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کارواں جو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر' کبھی شبنم' کبھی آنسو ہوا

مشیت ایزدی نے جذبہ ہائے فکر و عمل ہمارے دلوں سے اٹھا لیا ہے اور اختلاف و نفاق کے باعث کارکنان قضاء و قدر نے اپنی لطافتوں کے رخ موڑ دیئے ہیں۔ جن کی موج نفس سے دیوار چین لرز اٹھتی تھی اور دیوار قہقہہ شغل گریاں میں سر بسجود ہو جایا کرتی تھی۔ جنھوں نے تاج سروارا پاؤں تلے روند ڈالا اور "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کا نظریہ رکھنے والی قوم آج اپنے

مسکن و مولد سے محروم ہو چکی ہے۔

ادھر ابرہہ' فاران کی پہاڑیوں سے جھانک رہا ہے تو ادھر مسجد اقصیٰ کی چوٹی پر لپکتے ہوئے شعلے غیرت مسلم کی متعفن میت پر ماتم کناں ہیں۔ کیا یہ درد' لا دوا ہے؟ نہیں نہیں یہ مرض لا علاج نہیں۔ حکیم الامت نے اس مہلک مرض کی تشخیص کر کے نسخہ شفاء تجویز کیا ہے۔ ان کی ژرف نگاہ نے قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ بڑے حکیمانہ انداز سے کیا ہے۔ اقبال' اتحاد عالم اسلام کے سب سے بڑے نقیب ہیں۔ وہ ایک مرکز کے تحت اتحاد بین المسلمین کے خواہاں تھے۔ وہ خلافت کا تصور پیش کرتے ہیں' شکر رنجیوں کو مٹانا چاہتے ہیں اور مسلم قومیت کی بنیاد لا الہ الا اللہ پر استوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

لا الہ الا اللہ پر قائم ہونے والی وحدت و یگانگت کو توڑ کر اسرائیل سے عرب قومیت کے نام پر لڑی گئی جنگ کا عبرتناک انجام ہم دیکھ چکے ہیں اس لیے شدت سے مسلم قومیت کے اتحاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

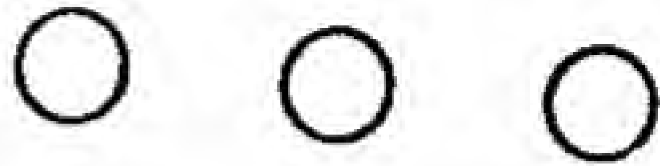
خطرات کے جو گھمبیر بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں ہم ان کا مقابلہ صرف باہمی اتحاد کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں۔ جب تک نظریات کا اختلاف طبائع کا تضاد اور نظریات کا تنافر کافور نہیں ہوگا تب تک امریکہ و روس اور یہود و ہنود کے پنجہء ہلاکت میں سسکنے اور کراہنے والی روح مسلم کو نجات نہیں مل سکتی۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے۔ باقی نہ ایرانی نہ افغانی!

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف مکتبہ فکر کے زاویہ نگاہ' تحفظ حرم پر مرکوز ہو جائیں اور نظریاتی اختلافات اور باہمی آویزش کو پس پشت ڈال دیں۔

اسی لیے تو اقبال جغرافیائی تصور کی زنجیروں کو توڑ کر اتحاد و یکجہتی کا پیغام دیتے اور ملت اسلامیہ کو وحدت و یگانگت کا نغمہ سناتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر



ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!

تھوڑی سی کسر بس باقی ہے دنیا کے جہنم بننے میں
حالات گواہی دیتے ہیں' ماحول اشارہ کرتے ہیں

قلندر لاہوری کے شعر کا یہ مصرعہ "احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات" حقیقت شناس نگاہوں کے لیے ایک کھلی کتاب ہے اس میں ایک سبق ہے' ایک درس ہے اور وہ درس ہے اپنی روحانی اقدار کو اجاگر کرنے کا۔ احساس و مروت کو بیدار کرنے کا۔ مادیت گزیدہ زندگی سے قطع تعلق کرنے کا اور مشینی آلات سے قلبی و روحانی سکون و اطمینان کی تباہی کی بنا پر اس سے اظہار نفرت و حقارت کرنے کا' کیونکہ:

اک نہ اک شورش زنجیر ہے جھنکار کے ساتھ
اک نہ اک خوف لگا بیٹھا ہے دیوار کے ساتھ

بعض ارباب عقل و دانش یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آلات احساس مروت کو نہیں کچلتے بلکہ وہ احساس لطیف کو جلا بخشتے ہیں۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ بعض مشینوں کی ایجاد کا مقصد ہی تباہی و بربادی ہے۔ یہ تباہ کن مشینیں ابلیس کی ایجاد ہیں اور ابلیس کا عزم انسانی شرف و وقار کی دھجیاں بکھیرنے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ انسانیت کو ضلالت و گمراہی کے عمیق ترین گڑھوں میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان کو گمراہ کرنا اس کا ازل سے خاصہ ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں نے مشین کو ابلیس کی ایجاد کیوں قرار دیا؟ اس لیے کہ یہ خوشنودی و خوشحالی کی بجائے تباہی و بربادی کا باعث ٹھہری اور انسانوں کے لیے ہلاکت و بربادی کا سامان پیدا کرنے والا ابلیس ہی ہو سکتا ہے۔ شیطان کی اس ایجاد پر ایک شاعر پکار اٹھتا ہے۔

کیا قیامت ہے کہ ذروں کی زباں جلتی ہے
مصر میں جلوۂ یوسف کی دکاں جلتی ہے
عصمت دامن مریم کی فغاں جلتی ہے!
بھیم کا گرز اور ارجن کی کماں جلتی ہے

حقیقت بہانگ دہل اپنی صداقت کی گواہی دے رہی ہے کہ اقوام و ملل کے زوال و انحطاط کا ایک بڑا سبب مشینوں کی ایجاد ہے۔ میں اس حقیقت سے بھی گریزاں نہیں کہ مشینری کی ایجاد انسانی ترقی کا باعث ہوتی ہے مگر وسیع و عریض تباہ کاریاں اس کے عدم مقاصد کا پتہ دیتی ہیں۔ انسان کی فکر و نظر کو جلا دینے کی بجائے یہ نفرت و حقارت کے بیج بوتی ہیں۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے احساس الفت و موت کو مٹانے کے سوا کچھ نہیں۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

یہ امر مسلمہ ہے کہ انسانی جسم کی بقا دل سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ اس کی صحت و تندرستی اور نشوونما انسانی زندگی پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں سائنسی ترقی نے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ جہاں اس کا مقصد انسانیت کی خوشحالی ہے وہاں اشرف المخلوقات کی تباہی و بربادی بھی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ مشینوں کی حکومت دل کی موت کا سبب بنتی ہے۔ فلاسفر اور سائنس دان شمس و قمر کی بلندیوں تک تو پہنچ سکتے ہیں کہ و مہ کو زیر دام لا سکتے ہیں مگر انسان کی روحانی زندگی میں کوئی ذریں اور قابل قدر انقلاب بپا نہیں کر سکتے۔ تبھی تو اقبال فرماتے ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

سائنس، عقل و خرد کی گتھیاں سلجھا رہی ہے لیے کیا معلوم کہ اس کی ذہنی بالیدگی اور فکری تسکین کا سامان عقل کے پاس نہیں۔ فکر و نظر کی جلا اور قلب و روح کی شگفتگی کا سامان سائنس کے پاس کہاں! یہاں تباہی ہی تباہی اور ویرانی ہی ویرانی ہے اور ویرانی بھی وہ جس کو دیکھ کر ویرانوں سے بھی نوحہ ماتم سنائی دیتا ہے۔

اتنی ویران تو کبھی صبح بیاباں بھی نہ تھی!
اتنی پر خار کوئی راہ مغیلاں بھی نہ تھی

آلات حرب و ضرب نے انسانی سکون و قرار کو تہ و بالا کر ڈالا ہے۔ اخلاقی اقدار اور روحانی اوصاف ناپید ہوگئے ہیں۔ آج انسانی جانوں کو مال مفت سمجھ کر توپوں کے دہانوں سے تلف کرنا ایک معمولی بات ہے۔ ٹینکوں، توپوں، میزائلوں اور ایٹم بموں کے ذریعے کائنات کی تباہی و بربادی، ایک اشارۂ ابرو سے عمل میں آسکتی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہیرو شیما اور ناگا ساکی، چند لمحوں میں راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ یہ لوگ صرف عقل و خرد کو مشعل راہ سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ذہنی و روحانی بالیدگی کا باعث تو عشق و مروت کا سرمایہ ہے۔

خرد کو سمجھے ہوئے ہیں مشعل راہ!
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

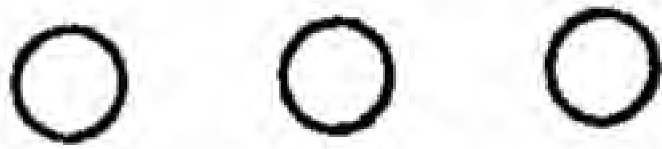
مشینی دنیا کے اس دور میں انسان بھی مانند مشین بنتا جا رہا ہے۔ اس مشین کی طرح جو لطیف جذبات اور نازک احساسات سے یکسر عاری ہوتی ہے۔ ایک مشینی انسان کے پہلو میں دھڑکنے والا دل نہیں، پتھر ہوتا ہے۔ سنگ ہوتا ہے اور سنگ بھی سنگ خارا۔ ایک الیکٹرک ٹیوب میں بھلا وہ حسن و ٹھنڈک کہاں جو ردائے نیلگوں کی قندیلوں میں موجود ہے۔ کائنات رنگ و بو کی تمام تر رونقیں صرف لطیف جذبات و احساسات کی سرمستیوں ہی سے قائم و دائم ہیں۔ ان حقائق

کے باوجود اگر کوئی فاتر العقل و مخبوط الحواس شخص مشینی زندگی کو ہی باعث سکون و راحت سمجھے تو میں اس سے کہوں گا۔

اس فریب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

آخر میں یہ التماس کروں گا کہ اپنے مقصد تخلیق کو پہچانئے۔ انسانیت کے شرف و وقار کو پامال کرنے کی بجائے اس کی اصلاح اور ترقی و تزئین کے لیے اپنا کردار ادا کیجئے۔ اپنے قلب و نظر کو مادیت سے پراگندہ کرکے دل کی موت کا باعث نہ بنائیں اور اپنے قلوب و اذہان کو بگاڑنے کے بجائے اصلاح کی طرف توجہ دیں۔ ترجمان حقیقت نے اقوام عالم کو بروقت خبردار کرتے ہوئے یہی درس دیا۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!



جمال فاقہ مستی (روزے کی اہمیت و حیثیت)

میرے نزدیک ارکان دین فقط ظاہری عبادات کا نام نہیں بلکہ شعائر اسلام میں کئی کئی فلسفے مضمر ہیں۔ ایک ایک نقطے میں اتنی اتنی گہرائیاں ہیں کہ مکمل آگاہی کے لیے ایک مدت چاہیے۔ فی الحال ہم روزے کے چند اہم پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا بھی میں ہوں۔ روزہ شرعی نقطہ نظر سے جہاں تزکیہ نفس، تقویٰ اور قرب الٰہی کا ذریعہ ہے تو وہاں یہ روحانی و بدنی امراض کا سدباب بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرد درویش سے کسی عیسائی نے کہا کہ مسلمان بھی عجیب لوگ ہیں کہ نماز تو سارا سال ادا کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس روزہ صرف ایک ماہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تم ذرا یہ تو بتاؤ کہ روٹی ہر روز کھاتے ہو یا کبھی کبھی؟ اس نے جواب دیا روٹی تو ہر روز کھائی جاتی ہے پھر آپ نے دوا کے متعلق پوچھا۔ وہ بولا یہ تو صرف بحالت بیماری لی جاتی ہے۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ نماز ہماری خوراک ہے اور روزہ سال بھر میں پیدا شدہ بیماریوں کا علاج! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ روزے میں یہ حکمت کار فرما ہے کہ اہل ثروت اس فریضے کی ادائیگی میں جب سحری سے افطاری تک بھوکے اور پیاسے رہیں گے تو انہیں عملی طور پر بھوک کی شدت اور پیاس کی کیفیت کا احساس ہو جائے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ غربت کی ذلت کیا معنی رکھتی ہے؟ اور آدمی دن بھر کس بے صبری کے ساتھ ایک ایک گھڑی کا شمار کرتا پھرتا ہے کہ کب وقت اذان آئے اور اذن نوش و تناول ہو۔

اگر روزہ رکھنے کے باوجود غریبوں کی غربت کا اقتباس نہیں ہوتا تو یقین جانو! تمہاری بصیرت تمہیں دھوکا دے رہی ہے۔ ماہ صیام میں اگر تم نے فاقہ کشوں کے کرب اور پیاسوں کے الم کا اندازہ نہیں لگایا تو واللہ تمہارے حصے میں سے معنی بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں آیا۔ یہی نہیں بلکہ اگر تم نے "افطاری" کے

وقت دستر خوان پر فروٹ' نمک پارے' شربت اور ملک شیک سجا رکھے ہیں۔ ڈنر میں مرغ کی یخنی' پلاؤ' زردے اور سویٹ ڈشیں لگا رکھی ہیں لیکن تمہارے ہمسائے کے چولہے میں آگ نہیں جلی۔ ان کے معصوم بچے بھوک کی شدت سے بلبلا رہے ہیں اور یہ معصومانہ چیخیں تمہارے ساز آشنا کانوں پر گراں گزرتی ہیں۔ تمہیں ان سے ہمدردی ہے نہ ان کی چیخوں سے کوئی غرض' تو یاد رکھو! تمہارے ان روزوں کی خالق کائنات کو کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کی قسم! ہمدردی سے عاری' محبت سے نا آشنا' مومن بھائیوں کی تکالیف سے لا پرواہ اور پڑوسیوں کے غم و اندوہ سے بے خبر لوگوں کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوا کرتی۔ ان کے روزوں پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے لوگ در حقیقت روزہ نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ سے دھوکا اور اس کی مخلوق سے مذاق کرتے ہیں۔

پس نقاب مری بے بسی پر قہقہہ زن
میں جانتا ہوں کہ تقدیر تھی' حضور نہ تھے

برادران عزیز! عید قریب ہے' لوگ نئے سوٹ سلوانے' پکنک کا پروگرام بنانے' سامان میک اپ کی خاطر بازاروں میں آنے جانے الغرض ہزاروں روپے شاپنگ پر لگانے میں تلے ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ کو عید کی یہ خوشیاں مبارک ہوں لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس رسول ؐ کی امت ہیں جو عید کے روز گلی کی نکڑ پر پھٹے پرانے کپڑوں والے ایک یتیم بچے کو دیکھ کر بے قرار ہوگئے' اسے اپنے ساتھ لائے' نیا جوڑا پہنایا اور فرمایا کہ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ حسنؓ اور حسینؓ تمہارے بھائی ہیں' علیؓ تمہارے باپ ہیں اور فاطمہؓ! اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھیں گی۔ اللہ رے' اس یتیم بچے کے نصیب! جس کے سر پر در یتیم نے دست مبارک رکھا اور دنیا پر واضح کردیا کہ فخر دو جہاں' تاجدار کون و مکاں' آقائے نامدارؐ کی رضا مندی اور خوشی اسی میں ہے کہ ہم رونے والوں کے آنسو پونچھ کر انہیں اپنی مسکراہٹوں میں شامل کر لیں۔ اس لیے کہ غربت ایک ایسی لعنت ہے جو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا ایک دن
زمین پانی کو، سورج کرن کو ترسے گا

آؤ آج ہم خدائے وحدہٗ لا شریک اور افضل الانبیاؐ کو حاضر ناظر جان کر اس بات کا عہد کریں کہ عید کے روز عام لوگوں میں گھل مل جائیں گے۔ کسی یتیم کے افسردہ چہرے پر نظر پڑتے ہی ہمیں اپنے ہنستے کھیلتے بچے یاد آجائیں گے۔ کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر لاڈلے بیٹے کی ذرا سی پریشانی پر جاگنے والا بے جا پیار مضطرب کردے گا اور ہر ممکن سعی کریں گے کہ کسی کا چولھا سرد نہ رہے۔ کیونکہ "جس بستی سے سرِ شام دھواں نہ اٹھے زمانہ اسے زندگی کی سند نہیں دیتا"۔

سوال سارے گلستاں کی زندگی کا ہے
نہیں سوال فقط میرے آشیانے کا



عشق رسولؐ مومن کی میراث ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

قرآن و حدیث کے بحر بیکراں میں جواہر بے بہا اس امر کی گواہی دیتے ہیں اور تاریخ اسلام کے صفحات پر جا بجا بکھرے ہوئے واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ عشق رسولؐ کی چنگاریاں ہمیشہ سے مومن دلوں کا عزیز ترین اثاثہ رہی ہیں۔ ایمان کا اولین تقاضا یہی ہے کہ دنیا کی ہر شے اور کائنات رنگ و بو کی تمام رعنائیاں محبوبؐ خدائی خاک پا پر قربان کی جائیں باوجود اس کے "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کیونکہ صفحہ ہستی اور فردوس بریں کے سب حسین بھی اگر آپ کے نعلین مبارک سے نسبت رکھنے والی گرد پر نثار ہو جائیں تو جذبہ صادق کی تسکین پھر بھی ممکن نہیں۔

جس شخص کا سینہ حب رسولؐ کا امین نہیں وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مسلمان نہیں۔ اور جو تیرہ بخت' آپ کے دامن رحمت سے وابستگی کا دعویدار ہونے کے باوجود آقا و مولاؐ کی ذات اقدس میں تنقیص کے پہلو ڈھونڈتا پھرے وہ مسلمان تو کیا انسان بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک سیاہ فام حبشی غلام کی کشت دل جب درد و سوز کی فصل سے لہلہا اٹھی تو وہ ملت اسلامیہ کا موذن بنا اور جب ایک کمسن غلام زادہ اسامہؓ بن زید یہ منشور لے کر اٹھا کہ "غلامی رسول میں موت بھی قبول ہے" تو وہ سرکش عمائدین قریش کا سردار ٹھہرا۔

بلاشبہ عشق رسولؐ مومن کی میراث ہے۔ جب تک مسلمانوں نے اپنی اس

وراثت کو حرز جان بنائے رکھا' ثریا ہمارا ہدف تھا۔ پروین ہماری شکارگاہ تھی۔ رعب و دبدبہ ہماری دلہن' عزت و بلندی ہمارا حصہ' ہیبت ہماری ادا' شہادت ہماری تمنا' فتح ہمارا مقدر' حکومت و جہاں بانی ہمارا حق' کرۂ ارض ہماری داشتہ اور کامیابی و کامرانی ہماری لونڈی تھی۔

اور جب عاقبت نا اندیشی کے سبب ہم سے یہ دولت کونین چھن گئی تو یہودی جرنیل کے پاؤں کی بے دردانہ ٹھوکریں نہایت خود نمائی اور خود ستائی کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کی شکستہ قبر سے پوچھ رہی تھیں "بتا کہ تیری تربت کے وارث کہاں ہیں؟" ادھر امت مرحومہ کے اس سپہ سالار کی ہڈیاں یہودیوں کے آتش انتقام میں جل رہی تھیں اور ادھر ہم جغرافیے کے ہنگامہ پرور جنگل سے اپنے سینے پر بے غیرتی' کم ہمتی' کوتاہ دستی اور شکست کے داغ سجائے ہوئے نکلے اور تاریخ کے مقبروں پر مجاور بن بیٹھے۔

میرا سر ابھی تک احساس ندامت سے جھکا ہوا ہے۔ جب ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے موقع پر اندرا گاندھی نے عالمی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "میں نے نہ صرف مسلمانوں سے ہزار سال کا بدلہ لیا ہے بلکہ ان کے دو قومی نظریے کو بھی دریا برد کرچکی ہوں"

کیا ہم وہی مسلمان ہیں جن کے گھوڑوں کے سموں سے اٹھنے والی مٹی حوران جنت کی آنکھوں کا سرمہ بنی تھی۔ ہاں ہاں ---- نہیں نہیں!

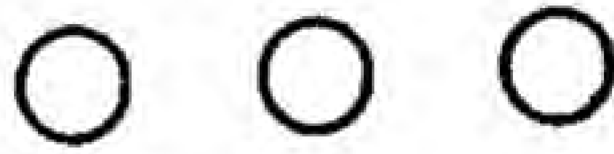
کیونکہ اپنی وفاؤں کے مرکز بدلنے والے پسر' کبھی بھی میراث پدر کے سزاوار نہیں ہوا کرتے۔ اس نازک دوراہے پر اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اس گم گشتہ میراث سے اک نئے ولولے' جوش اور ہوش کے ساتھ اپنا رشتہ الفت استوار کریں' اگر آج بھی ہم اپنے اجڑے ہوئے قلب و جگر کو شراب عشق سے آباد کرلیں تو قلندر لاہوری ہمیں یہ خوشخبری سنانے کے لیے مضطرب دکھائی دے رہے ہیں۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مرسکے"

"عشق رسولؐ مومن کی میراث ہے" جو عظیم ہستیاں اس عقیدے کی عملی تفسیر تھیں ان کا چشمہ فیض آج بھی دائمی زندگی کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ غازی عبدالرشید شہید' غازی علم الدین شہید' غازی عبدالقیوم شہید' غازی محمد صدیق شہید' غازی میاں محمد شہید' غازی مرید حسین شہید اور غازی محمد عبداللہ شہید" سے ہم نسبت غلامی اس لیے رکھتے ہیں کہ وہ ناموس رسالتؐ پر دیوانہ وار فدا ہوئے تھے اور ان کی خوش نصیب مائیں اس نکتے کو پا گئی تھیں۔

"عشق رسولؐ مومن کی میراث ہے"

تب ہی تو انہوں نے تحفظ ناموس مصطفیٰؐ کے لیے اپنے جگر گوشوں کو پھولوں کے ہار پہنا کر سوئے مقتل روانہ کیا تھا۔



اسلام کا معاشی نظام

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے میرے طرز مسلمانی میں

دین فطرت میں طبقاتی کش مکش اور حد درجہ معاشی تفاوت کی قطعاً" کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن حکیم بہانگ دہل اعلان فرما رہا ہے۔

کی لا یکون دولۃ بین الا غنیا منکم (حشر: ۷)

(اے لوگو! دولت صرف تمہارے سرمایہ داروں اور دولت مندوں میں ہی گردش نہ کرتی پھرے)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا۔

ویسئلونک ما ذا ینفقون قل العفو (بقرہ: ۲۱۹)

(اے رسولؐ! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ ان کو حکم دے دو کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو خرچ کردو)

دراصل جو شخص مساکین و غرباء کا ہمدرد نہیں وہ منافق ہے۔ قرآن حکیم کے یہ ارشادات اسی فلسفے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوۃ ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعا فاسلکوہ انہ کان لا یومن باللہ العظیم ولا یحض علی طعام المسکین○

(اس کو پکڑلو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اسے بھڑکتی آگ میں پھینک دو۔ پھر اسے ستر گز لمبے زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ بدبخت خداوند عظیم پر ایمان نہیں لایا تھا اور نہ وہ غریبوں کو خوراک مہیا کرنے کی ترغیب دیتا تھا)

حضور نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے۔

ان فی المال حقا سوی الزکوۃ

(کہ سرمایہ داروں کے مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی ایک حق اور ٹیکس ہے)

انہی وجوہات کی بنا پر کارل مارکس تسلیم کرتا ہے۔

"قرآن سرمائے کی موت ہے اور اسلام جو معاشی نظام پیش کرتا ہے ' دنیا کا کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

حقیقت یہ ہے کہ غریبوں اور مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والا اس سے بہتر کوئی اور نظام ہو ہی نہیں سکتا۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق سود ایک ایسی لعنت ہے جو غریبوں کو غریب تر اور امیروں کو امیر تر بنا دیتی ہے۔ اسی لیے سود کا کاروبار سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام میں اس بات کا کوئی تصور نہیں کہ ایک آدمی کو دنیا بھر کی نعمتیں اور آسائشیں میسر ہوں اور دوسرا دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے کو ترستا رہے۔ اگر اسلام کا نظام رائج ہو تو واللہ کسی شخص کو اس شکایت کا موقع نہیں مل سکتا۔

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

الکاسب حبیب اللہ کا منشور پیش کرنے کے ساتھ ساتھ حضور اکرمؐ کا فرمان ہے:۔

"مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو"

دوسری جگہ فرمایا گیا "حرام کے مال سے پلا ہوا جسم جہنم کا ایندھن ہوگا"

یہی نہیں بلکہ اسلام میں مالک اور مزارعہ کی بھی کوئی اصطلاح موجود نہیں۔ عرب کے عظیم انقلابی نقیبؐ نے واضح اعلان فرما دیا تھا۔

"جس فرد کے پاس کوئی قطعہ زمین ہو تو وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو دے دے"

حضورؐ نے محابرہ یعنی بٹائی کی رسم کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "جو آدمی بٹائی کا کاروبار کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تیاری کرتا ہے"

اے دوست! دھواں اگلتی ان چمنیوں سے پوچھ
کیا کیا نہیں ہوا ہے یہاں آدمی کے ساتھ

یہ ہماری سیاہ بختی ہے کہ اسلامی دستور حیات کو چھوڑ کر غیر اقوام کے قوانین میں سکون زندگی تلاش کر رہے ہیں - دین فطرت نے ایک عام شہری کی بہتر زندگی کے لیے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ رکھی- غلاموں کی خرید و فروخت کو قانونی جرم قرار دیا- چالیس روز سے زائد ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ لگایا- ملاوٹ کرنے والے کو بنی نوع انسان کا مجرم گردانا اور اعلان کیا کہ جس کا پڑوسی بھوکا رہے اس کی عبادت قبول نہیں ہوتی- کیوں نہ ہو اسلام دین فطرت ہے- اس کے نزدیک وافر دولت یعنی معاشی اونچ نیچ تمام معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے- کسی بھی معاشرے میں سرمایہ دار اور جاگیر دار راکھ کا ایک ایسا ڈھیر ہوتے ہیں جس میں انسانیت کی کوئی چنگاری ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی- اسی لیے قرآن مجید میں **قل العفو** کا نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اگر کسی کے پاس ضرورت سے زائد کوئی چیز موجود ہو تو وہ لے لو اور اسے ضرورت مند تک پہنچا دو- کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر تم دیکھو کہ کسی شخص کے پاس دو کوٹ ہیں تو تم یقین کرلو کہ اس نے دوسرا کوٹ اپنے بھائی سے بزور طاقت چھین رکھا ہے-

مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں ڈھل نہیں سکتی



اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور جامع و اکمل دین ہے۔ حجتہ الوداع کے خطبے سے قرآن حکیم اپنی لافانی زبان میں آج تک اس کی شہادت "اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی" کی صورت میں دے رہا ہے۔ دین حق سے نا آشنا' دہریت سے مرعوب' بعض ناخواندہ اور خام خیال افراد یہ سخن الاپ رہے ہیں کہ دین اسلام میں نظام ریاست کے خد و خال معدوم ہیں۔ وہ اسلام کو صدیوں پرانا اور فرسودہ نظام کہہ کر سوشلزم کو راز حیات کا نام دیتے ہیں تو کہیں کمیونزم کو تسکین خاطر کا اعزاز بخشتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ لحہ فکریہ ہے کہ جس دین نے ریاست کے آئین مرتب کیے' بندہ نوازیوں کی ادائیں سکھائیں' چرواہوں کو کائنات کا وارث بنا دیا' تہذیب و تمدن کے بے مثال نمونے پیش کیے' عالم ہست و بود کے اسرار پردۂ اخفاء سے نکال کر مشتہر کیے' عدل و انصاف کی نا قابل فراموش روایتیں قائم کیں اور مکتب اسلام کے تربیت یافتہ افراد نے مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر اہل جہان کا نوشتہ تقدیر بدل کے رکھ دیا۔ جبر و استبداد کے فلک بوس ایوانوں کو تاخت و تاراج کردیا۔ جنہوں نے صحراؤں کے سینے چھید ڈالے اور جن کے اشارۂ ابرو پر دریاؤں نے اپنے رخ موڑ لیے۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ' فقر بوذرؓ و صدق سلمانیؓ

مقام غور ہے کہ وہ دین فطرت جو زندگی کے ہر شعبے میں راہنمائی کرتا ہے حتیٰ کہ نظام ریاست ہو یا طرز سیاست' میدان کارزار ہو یا بزم جشن بہار' حقوق الوہیت کا فکر ہو یا حقوق عبودیت کا ذکر' سرکشی و عصیان کی سزا' پاکی دامن کی جزاء' مہد سے لحد تک' ازل سے ابد تک اور فکر معاش سے زہد تک انسان کے لیے نشان منزل ہے۔ یہی نہیں بلکہ اہتمام نصرت ہو یا جشن مسرت' راز ہائے خلوت ہو یا تماشائے جلوت' انفرادی منفعت ہو یا اجتماعی افادیت' طہارت سے لے کر [illegible] تک' قضاء عمر سے لے کر معاد تک' جرم و عصیاں سے مکافات عمل تک

اور رخت سفر سے مقام منزل تک دین حق زندگی کے ہر شعبے میں مشعل راہ ہے۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو دور حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراج مسلمانی

وہ دین فطرت جو زندگی کے تمام امور میں اولاد آدم کی رہبری کرتا ہو وہ اساس بقاء جیسے اہم معاملے یعنی نظام ریاست کے بارے میں کیونکر خاموش ہوگا؟ مگر ہم نے دریوزہ گری کو اپنا شعار بنا کر اسلام کے حقیقی سیاسی نظام کو فراموش کردیا ہے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم دین حق کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی کر کے غیر مسلموں کو اسلام کی سیاسی رفعتوں سے روشناس کرائیں تاکہ لادینیت سے ناخوش و بے زار قومیں دامن رحمت میں پناہ لے سکیں۔ ان کے لیے سکون قلب اور اطمینان خاطر کا سامان مہیا ہو سکے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

مگر یہ اس وقت ممکن ہوگا جب ہم خود اسلامی طرز بود و باش اور طریقہ ہائے تہذیب و تمدن کا عملی نمونہ پیش کریں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم شعائر اسلام کی ایسی کھلی کتاب بن جائیں جس کو پڑھ کر اغیار بھی عمل و اخلاص اور امن و آشتی کی لازوال راہوں پر جادۂ پیما ہو سکیں۔

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں



اسلام میں حیثیت نسواں

آفتاب رسالتؐ کے منصہ شہود پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے عورت کی مظلوم ذلت ضلالت و گمراہی کے اس دشت خار زار میں آبلہ پا تھی' جہاں عزت و توقیر کے کواکب کی ضیا باریاں ماند پڑ چکی تھیں۔ اس کے جیب و گریباں کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں۔ دامن عصمت تار تار تھا ابن آدم کے استیصالی بگولوں سے گلشن زن کی پتیاں لرزاں تھیں۔ صنف قوی کے انداز و حوش و بہیمانہ سے اس کا بدن زخم زخم تھا اور اس کے شیشہ حرمت کی کرچیاں بکھیر کر بھی فرزند آدم برہم تھا۔ مدتوں بعد آخر فضائے بسیط میں وہ خورشید صداقت طلوع ہوا جس کی تابناکیوں نے عصر ظلمت میں کراہتی ہوئی نسوانیت کو نور سحر عطا کیا۔

نجاست و غلاظت سے لتھڑی ہوئی نسوانیت کو شرف و وقار کے دیدہ زیب تاج پہنا دیئے۔ کانٹوں سے الجھے ہوئے پائے نازک میں گل ہائے نشاط بکھیر دیئے۔ زخموں سے چور چور پیکر نسواں کو قرار جاں نصیب ہوا۔ اور مردوں کے دل و دماغ پر طبقہ نساء کی عظمت مرتسم ہو گئی۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ دین حق نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر نمایاں روشنی ڈالی ہے اور عرصہ حیات میں جا بجا عالم بشریت کی راہنمائی کی ہے۔ جہاں اس نے زندگی کے دوسرے شعبوں کا احتساب و مواخذہ کیا ہے وہاں عورت کے حقوق اور فرائض بھی متعین کیے ہیں۔ قرآن کریم میں حکم ربانی ہے "اے نبیؐ ازواج مطہرات اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ چادر اوڑھا کریں" حدیث نبویؐ ہے کہ عورت کی آواز اس قدر دھیمی ہونا چاہیے کہ چار دیواری سے باہر ہرگز حائل نہ ہو۔

مگر آج دختران اسلام حکم ربانی اور فرمان نبویؐ کو فراموش کر چکی ہیں' اسلامی تہذیب کو اگر کہیں [illegible] عورت [illegible] انداز میں۔ ہم [illegible] کا نام [illegible] رکھا ہے۔

جو مسلم زادیاں ستر پوش پیرہن زیب تن کرنا معیوب خیال کرتی ہیں، میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

یہ اپنی روایات کو تو نے کیا زندہ
یا میت آداب حرم لے کے اٹھی ہے

تاریخ اقوام و ملل کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ تہذیب و تمدن کی تعمیر و تخریب کا محور وجود زن کے گرد ہی گھومتا ہے۔ ایران و روما اور یونان کی عظیم تہذیبیں صرف اس لیے تاخت و تاراج ہو گئیں کہ ارباب حل و عقد پر ناز نینان ہوشربا کا سحر کارگر ہو گیا تھا۔

کسی بھی معاشرے کی صورت گری عورت کی رہین منت ہے۔ عورت ہی کی گود میں قوموں کی تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ مغربی دنیا کی تحریک آزادی نسواں، خراماں خراماں اب اسلامی ریاستوں میں بھی پہنچ چکی ہے۔ باوجودیکہ دین فطرت، مغربی تصور مساوات مرد و زن کا قطعاً" قائل نہیں۔ نہ جانے مسلمان عورتیں اب شمع محفل بننا چاہتی ہیں یا چراغ خانہ، بقول شاعر!

جو شمع سر عام لٹاتی ہے اجالے
اس شمع کی گھر میں کوئی عزت نہیں رہتی!
تسلیم کہ پردہ ہوا کرتا ہے نظر کا
نظروں میں بھی برداشت کی قوت نہیں رہتی
مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت
کچھ اور وہ بن جاتی ہے عورت نہیں رہتی

انبیاء، اولیاء، اتقیا اور صوفیا بطن نساء سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ قوم کے مصلحین، محافظین اور قائدین بھی آغوش مادری میں ہی پرورش پا کر شاہراہ منزل پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے قدیم مفکر نظام الملک طوسی عورت کو انہیں کی گھریلو ذمہ داریاں یاد دلاتا ہے۔

نپولین بوناپارٹ نے بھی اسلامی نظریے سے متاثر ہو کر کہا تھا "آپ مجھے اچھی مائیں دیں میں آپ کو ایک اچھی قوم دوں گا" اس لیے آزادی کے نام پر

کوئی بھی ذی شعور عورت کی ایسی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ چار دیواری سے نکل کر بازاروں میں صورت جنس تاجر' خریداروں کے تیر نظر کا نشانہ بن جائے۔ مغرب میں اخلاقی بے راہ روی کا یہ نتیجہ ہے کہ بیٹے کو باپ کی خبر نہیں۔ ماں کو لخت جگر کا علم نہیں اور ہمشیرہ اپنے برادر حقیقی سے بھی شناسا نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغربی ہسپتالوں میں کئی ایسے بچے زیر پرورش ہیں جن کے والدوں کا کچھ علم نہیں۔ اے حوا کی بیٹی! وہ بھی مائیں تھیں جنہوں نے آیات قرآنی کی تلاوت کر کے صلاح الدین ایوبیؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا کیے اور اسی طبقے کی ایک نمائندہ کے متعلق قلندر لاہوری کو کہنا پڑا۔

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

اے اسلام کی دختر سعید! اب یہ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ ہوٹلوں میں عمر گزار کر ہسپتالوں میں مرنا چاہتی ہے تو مغربی تہذیب سے اپنی وفاداریاں استوار کر کے ابدی ذلت کو اپنا مقسوم ٹھہرا لے اور اگر تو اپنے کف پا کے نیچے جنت دیکھنا چاہتی ہے' شمع ناموس کو فروزاں و تاباں رکھنا چاہتی ہے تو غیر اسلامی رسوم و رواج سے رشتہ توڑ کر دین فطرت کی بے پایاں عظمت کی آغوش میں آ' تاکہ تجھے تسکین خاطر کی دولت نصیب ہو اور روح کائنات وجود زن کے انعکاس سے رشک فردوس بن جائے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں!



چادر، چاندنی اور چار دیواری؟

اک زندہ حقیقت ہے سینے میں مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی!
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

حلقہ ارباب فکر میں مدت ہائے دراز سے یہ بحث و تکرار چلی آتی ہے کہ فحاشی و عریانی، بے حیائی و بے پردگی کا ذمے دار کون ہے، عورت کہ مرد؟ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے صنف نازک بے دوش ہے اور نہ ہی تنہا مرد قصور وار۔ کیونکہ زن و مرد لیل و نہار زیست میں ہم سفر ہیں۔ اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے تو دین فطرت خانگی و ازدواجی بندھن سے لے کر معاشی، معاشرتی، حتیٰ کہ سیاسی معاملات تک راہنمائی کرتا ہے۔ جہاں بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کے چار مقدس روپ ہیں، بعینہ اس طرح مرد بھی بیٹا، بھائی، خاوند اور باپ کے پاکیزہ رشتوں سے متصف ہے۔

دین حق تو بھائی کو بہن کی عصمت کا محافظ، خاوند کو بیوی کا سرتاج اور خدائے مجازی قرار دیتا ہے۔ مگر یہ کیسے بھائی ہیں؟ جو اپنی بہنوں کو نائٹ کلب میں لے آتے ہیں۔ خاوند اپنی بیویوں کو سربازار لیے پھرتے ہیں۔ [illegible] گوارا نہیں کرتے کہ ان کی جانب ہر نگاہ [illegible] کی گستاخ [illegible] اور جدید [illegible] کیا کہیں [illegible]

تم تو سکوں کی لپکتی ہوئی جھنکاروں میں
اپنی ماؤں کو اٹھا لاتے ہو بازاروں میں

کبھی تو معصوم لڑکیاں رومالوں پر پاکستان کے نقشے کاڑھا کرتی تھیں اور انہیں اپنے محبوب قائد کے حضور میں پیش کیا کرتیں۔ فرنگی دور میں ان کے دوپٹے اسلامی پرچم بن کر سیکرٹریٹ پر لہرائے اور چار دانگ عالم "پاکستان زندہ باد" اور "اسلام زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے گونج اٹھے۔ مگر آج پاکستانی خواتین مغربی تہذیب کی گرویدہ ہوگئی ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر فلمی نغمے تھرکتے رہتے ہیں اور سینماؤں میں سینکڑوں لڑکیاں رقص و سرود سے محظوظ تلیاں پیٹتی نظر آتی ہیں۔ وہ عورت جو شرم و حیا کا مرقع اور غیرت و حمیت کا پیکر تھی' آج بے حیائی کا مجسمہ بن گئی ہے۔

کل جنہیں چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونق بازار نظر آتے ہیں!

اسلام تو عورت کو چار دیواری کی ملکہ قرار دیتا ہے اور یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ طبقہ اناث کی آواز چار دیواری سے باہر ہرگز سنائی نہ دے مگر یہ اعجاز مغرب اور جدید ثقافت کی کرامات ہیں کہ مغنی آتش نفس کی صدائے جلوہ برق شہر شہر' قریہ قریہ اور گوشے گوشے سے سنائی دے رہی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر!

صاحب ثروت! اخلاقی انحطاط کو سرمایہ عز و افتخار سمجھتے ہیں۔ بلند و بالا محلات اور خوشنما بنگلوں میں روز و شب وی سی آر پر عصمت دری اور ہوس رانی کے ایمان سوز مناظر ہمارے لیے تازیانہ عبرت ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ قومی نشر و اشاعت کے ادارے بھی بیہودگی و ہلاکت کا زہر اگل رہے ہیں۔ ہر بک سٹال پر سینکڑوں رسائل اور ڈائجسٹ فحش مواد کا حصہ بنا ہوتے ہیں۔ آزادی کا یہی مقصود تھا اور کیا اسلامی ریاست کے قیام کا یہی مطمح نظر ہے؟

— جب میں مسلم دوشیزاؤں کو دیکھتا ہوں کہ نور رخسار پہ نقاب نہیں' آنکھوں

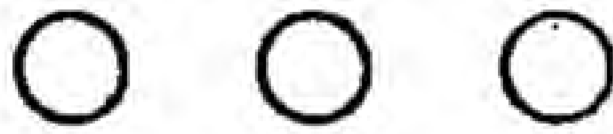
میں کاجل لگائے، ہونٹوں پر سرخی کی تہ جمائے، گھٹا کی مانند گیسوؤں کو گردن پر پھیلائے اور گلے میں دوپٹہ لٹکائے سربازار دعوت نظارہ دیتی ہیں تو بارہا میرا جی چاہتا ہے، میں انہیں روک روک کے پوچھوں کہ تمہاری چادر کہاں ہے؟

حیا داری اور پردہ داری کا جنازہ اٹھا ہے۔ غیرت سسک رہی ہے اور حمیت جاں بلب ہو چکی ہے۔ بھائی زندہ ہیں مگر ان کا ضمیر مردہ ہے اور کئی باپ ہوس زر میں اندھے غیرت کی موت مر کر بھی بقید حیات ہیں۔

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

خداوندا! اگر کوئی سعادت مند بیٹا، ماں کے قدموں میں جنت تلاش کرنا چاہے تو وہ کدھر جائے؟

کاش! کوئی بے پردہ عورتوں کے سر غیرت کے ستاروں سے ڈھانپ دے۔ ان نیم عریاں اجسام کو شرم و حیا کے پیرہن پہنا دے اور بھٹکی ہوئی صنف نازک کو نسوانیت کا [illegible]س بتلا دے۔



اسلام اور فروغ سائنس

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ فروغ سائنس میں کسی بھی قوم سے پیچھے نہیں بلکہ سب سے آگے ہے اور یہ بات بھی ایک امر مسلمہ ہے کہ جہان رنگ و بو کے سربستہ رموز و اسرار کو بے نقاب کرنے میں جو کردار مسلمانوں کا ہے وہ کسی اور قوم کا نہیں۔ جب عیسائی دریاؤں میں سفر کرنے کو ناقابل عفو گناہ اور تخلیق کائنات پر غور و فکر کو ایک جرم عظیم خیال کرتے تھے، مسلمان اس وقت بھی مشاہدات میں مگن اور سمندروں کو پایاب کرنے کے لیے مضطرب تھے۔

دین فطرت ہر قدم پر دعوت غور و فکر دیتے ہوئے تسخیر کائنات پر کمربستہ ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسلام کے ہر نکتے سے سائنسی دنیا کی کئی حقیقتیں منظر عام پر آئی ہیں۔ اگر دین حق ان کی طرف واضح اشارہ نہ کرتا تو یقیناً سینکڑوں ایجادات ہرگز پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتیں۔

قرآن حکیم اپنی لا فانی آواز میں چودہ سو سال سے لوگوں کے اذہان جھنجھوڑ رہا ہے کہ اٹھو اور دیدۂ بینا کے ساتھ مشاہدۂ کائنات کرو۔

ان فی خلق السموت والارض و اختلاف الیل والنہار لایت لاولی الالباب○(۳ : ۱۹۰)

(بے شک ہوش مندوں کے لیے آسمان و زمین کی پیدائش اور رات دن کے باری باری آنے میں نشانیاں ہیں)

آسمانی مناظر قدرت کے مشاہدہ، اجرام فلکی کی اپنے مدار میں تبدیلیوں کی پیمائش و تحقیق اور گردش لیل و نہار کے مطالعہ پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا فرمان ہے۔

ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا" وقدرہ منازل لتعلموا عدد

التسنین والحساب اما خلق اللہ ذلک الا بالحق یفصل الایت لقوم یعلمون(۱۰:۵)

(وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند کو چمک دمک عطا کی اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جانو' اللہ نے ان سب کو با مقصد بنایا اور نشانیاں کھول کر پیش کیں علم والوں کے لیے)

توہمات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی کلیسائی آقاؤں کی ناقص تعلیم کو "ڈاکٹر رابنسن" "عقل انسانی سے ماوراء اور ایک سربستہ راز" قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے برعکس قرآن حکیم میں جگہ جگہ مشاہدۂ کائنات کی دعوت اور احادیث میں علم و حکمت کے موتی دیکھ کر "ہیمبولٹ" کہتا ہے:

"عربوں نے دریائے فرات سے لے کر اسپین اور وسطی افریقہ تک کی اقوام پر اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ ان کی بے مثال علمی کاوشوں نے تاریخ عالم میں ایک یادگار دور کا اضافہ کیا ہے"۔

نبی آخرالزمانؐ کا ارشاد ہے۔

"رموز کائنات میں ایک گھنٹے کا تفکر و تدبر ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے"

ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے۔

"علماء کی گفتگو سننا اور حکمت و دانائی کی باتیں دلوں میں جاگزیں کرنا' مذہبی اشغال میں مصروف رہنے سے کہیں بہتر ہے"

ناوک ہے مسلماں' ہدف ہے اس کا ثریا
ہے سر سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج

قرآن و حدیث کے انہی فلسفوں سے متاثر ہو کر مغربی مفکر' معروف ادیب اور ڈرامہ نویس جارج برنارڈشا نے اسلام کی ہمہ گیریت و حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں ممباسا کے مقام پر کہا تھا:

"آئندہ سو سال بعد دنیا کا مذہب صرف اسلام ہو گا"۔

جو خرمن باطل ہے وہ جل جائے گا اک دن
توحید کے اٹھتے ہوئے شعلوں کی لپک سے

سائنس اور مذہب کے باہمی تضاد کا مفروضہ صرف غلط فہمیوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ ورنہ تحصیل علوم سائنس تو مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ دین اسلام ہمیں علم حیاتیات کے مسائل سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ مادہ اور توانائی سے متعلق تمام امور کے مطالعہ کا درس دیتا ہے جو آج کے علم طبیعیات کا مسئلہ ہے یہ علم کیمیا سے متعلق ابتدائی اور مرکب جوہر کے باہمی اتصال پر غور و خوض کی دعوت دیتا ہے۔ الغرض ارضیات، فلکیات، جغرافیہ، ریاضی، ہیئت، ہندسہ، نفسیات، معاشیات، سیاسیات، طب اور دیگر علوم کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ اور منزل کا پتہ بھی بتاتا ہے۔

ہیں جس قدر انسان کی ترقی کے مراتب
پیغمبر اسلام کے آئین سے نکلے

دین فطرت درحقیقت جمود نہیں تحرک چاہتا ہے۔ یہ ٹھہراؤ کی بجائے جستجو کو پسند کرتا ہے۔ آؤ ذرا اس حقیقت کا جائزہ لیں کہ کن کن پہلوؤں سے دنیاوی زندگی میں انقلاب کی نوید ملی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے ان حقائق کے صرف ایک رخ کو یاد رکھا اور دوسرے گوشوں کو فراموش کردیا۔ مغربی ممالک کی تجربہ گاہوں بلکہ وجود باری تعالیٰ کی منکر ریاستوں کی لیبارٹریوں اور لائبریریوں میں سب سے اوپر جو کتاب رکھی ہوتی ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ قرآن حکیم ہے۔

اہل دانش کو صور اسرافیل سے ایٹم کا اشارہ ملا۔ سورۃ الفیل سے فضائی بموں وما رمیت اذ رمیت سے آنسو گیس اور دھواں دار گولوں کی بات چلی۔ اولم یروا الی الطیر فوقہم صفت ویقبضن (۶۷ : ۱۹) سے ہوائی جہاز کا پہلو نکلا۔ واقعہ معراج اور براق النبی کی آسمان کی طرف پرواز سے شمس و قمر کی تسخیر کا حوصلہ عطا ہوا۔ یا ساریہ الجبل کی کرامت سے ریڈیو اور وائرلیس کا مفہوم ہویدا

ہوا۔ خیر الوریٰ کی نعش مبارک کو گنبد خضرا سے نکالنے کی ناپاک سازش کے موقع پر کینے نصرانیوں کی کریہہ شکلیں اس دور کے نیک دل مسلمان حاکم' نور الدین زنگی'' کو دکھائی جانا ٹیلی ویژن کی دلیل و بنیاد قرار پایا۔ لاشوں کو تعفن سے بچانے کا نسخہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمائے گئے واقعہ فرعون سے بہم پہنچا۔ یہ عقیدہ کہ لوگ روز محشر اپنے اعمال و افعال کو دیکھ اور زبان سے ادا کیے گئے الفاظ کو من و عن سن سکیں گے' ایک ایسا تصور تھا جس سے ٹیپ ریکارڈر اور کیمرے کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

پیغمبر خدا نے یہ فرما کر "کہ کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج موجود نہ ہو" مریضوں کی تسلی' تحقیق و تجسس کا جذبہ اور طب کی دنیا میں انکشافات کے کئی نئے دروازے کھول دیے۔

ہر ایک ذرہ ہے جن کا اک آسماں نیا
مرے خیال کا قبضہ ہے ان زمینوں پر

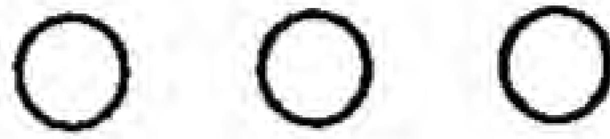
الغرض گھڑی مسلمانوں نے ایجاد کی۔ ڈوبے ہوئے جہازوں کو سمندر کی تہہ سے نکالنے والے بھی مسلمان ہی تھے۔ ایک مسلمان حکیم نے ایسی بانسری بنائی تھی جس کی سروں کے اثر سے پیٹ کا درد کافور ہو جایا کرتا تھا۔ بلاشبہ علم فلکیات کا بانی بو علی سینا ہے۔ جس نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کے مشاہدے کی خاطر خوردبین اور دوربین کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔

میرے خیال میں اسلامی ماہ و سال کا تعلق چاند سے اور اوقات نماز کا ناتا سورج سے بھی اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کی تخلیق' طلوع و غروب' ماہیت و کیفیت میں گہری دلچسپی لیں اور ان کی توانائیوں سے کماحقہ مستفید ہو سکیں۔

قصہ مختصر! دین فطرت کی دعوت غور و تدبر اور مسلمانوں کی شبانہ روز کاوشوں سے دنیائے سائنس پر جو انمٹ نقوش مرتب ہوئے ان سے انکار کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بھی فرزندان توحید کی سائنسی

خدمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ ہمیں چاہیے کہ از سر نو علم و حکمت کی دلہن کا گھونگٹ اٹھاتے ہوئے دنیائے سائنس کی مشاطگی کے کارہائے نمایاں سرانجام دیں۔

لٹاتے تھے وہ موتی بسکہ تھا دست فراخ ان کا
گہر خیز و گہر بیز و گہر ریز و گہر پرور



مسجد اقصیٰ

ایک وہ زمانہ تھا جب ملت اسلامیہ کی پابوسی کے لیے کائنات کی وسعتیں مضطرب رہتی تھیں۔ سومنات جیسے صنم خانوں میں حق و صداقت کی اذانیں گونج اٹھی تھیں اور باطل قوتوں کو پرکاہ کی مانند پھونکوں سے اڑا دیا جاتا تھا۔ جن کے غمزہ و عشوہ و ادا پر کلیساؤں کو نچھاور کیا جاتا تھا۔ جن کی تیز رفتاریوں سے صرصر کے تلخ جھونکوں نے شورش خرامی سیکھی تھی۔

عزم او خلاق تقدیر حق است
روز ہیجا تیر او تیر حق است

اور ایک یہ زمانہ ہے مسلمانوں کا قبلہ اول پھر قبضہ اغیار میں ہے۔ ہیکل سلیمانی کی تلاش کا بہانہ بنا کر مسجد اقصیٰ اور گنبد صخریٰ کی حرمت و تقدس کو پامال کیا جاچکا ہے۔ بیت المقدس اور دیگر مقامات مقدسہ کو نذر آتش کیا جارہا ہے۔

محروم اذاں سے ہے کہیں گنبد صخریٰ
ہے نوحہء کناں آج بہت مسجد اقصیٰ

آج یہود کی حق دشمنی' شر انگیزی اور فتنہ پردازی کا یہ عالم ہے کہ کلیجہ اسلام میں نشتر چبھو کر قوم حجاز کی بے بسی' بے حسی اور بے کسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ساکنان حرم آج اپنے ہی کعبہ میں جبہ سائی کے شرف سے محروم ہیں۔ کل ایک مجذوب سرعام چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ جن کا کعبہ اغیار کے زیر نگیں ہو ان کی نماز کیسی ہے اور سجدہ کیا؟

یہ کتنی المنا ہے کہ لاکھوں فلسطینی اپنے مقدس مسکن و مولد سے کہیں دور تلخیء حیات سے نبرد آزما ہیں۔ ان کی ایک نسل دیار غیر کے خیموں میں زندگی کے کربناک اور یا دن پورے کرچکی ہے اور مصائب و آلام کی آغوش میں پرورش پانے والی دوسری نسل کسمپرسی اور تہی دامنی کے عالم میں جوانی کی دہلیز عبور کر رہی ہے۔ لیکن پوری ملت اسلامیہ میں ان کا مددگار اور پرسان حال کوئی نہیں

ہے

بڑھ کر خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و باطل

اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے؟

حرم کے پاسبانو! تمہارے اس جذبۂ اخوت کو کیا ہوا؟ جب کابل میں کانٹا چبھنے پر عرب کا ہر پیر و جواں بے قرار ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کون تھے؟ جو ایک مظلومہ کی فریاد پر سمندروں کے سینے چیر کر' طوفانوں کی طغیانیوں سے کھیلتے ہوئے دیبل پہنچ گئے اور عروس جیسی منجنیق بے خطا سے مندر کی چوٹی پر لہراتے ہوئے نشان کفر و استبداد کو سرنگوں کردیا۔ کیا تم نے آج اپنی ان وفاؤں کے آئین بدل ڈالے ہیں؟ کیا تمہارا جذبۂ اخوت رو پوش ہوچکا ہے؟ افسوس کہ تم نے نان شعیر کو ترک کردیا اور قوت حیدری جاتی رہی۔ نتیجتاً صلیبیوں نے اس مقدس مقام پر اپنے ناجائز بیٹے اسرائیل کو مسلط کردیا۔ صلیبی دیسہ کاریوں نے یہودی ریاست معرض وجود میں لاکر قلب اسلام میں وہ خنجر پیوست کردیا کہ مسلمانان عالم کے تمام جتن بے سود ثابت ہوئے ہیں اور انہی کے دوا خانوں سے اپنے مرض کہن کا چارہ تلاش کرتے ہیں اور ان سے ہی امن و آشتی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ جب بھی مشرق وسطی کے پائیدار امن کے لیے قرارداد پیش کی جاتی ہے تو امریکہ سب سے پہلے حق استرداد استعمال کرتا ہے اسی لیے تو اقبال نے فلسطینی عرب کو مخاطب کیا تھا۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ

میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تیری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

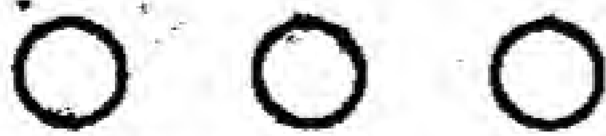
" مامتی مروت کا شکار' مظلوم فلسطینی بھائیوں کی منتظر نگاہیں جھک جھک کر

اٹھتی اور تھک تھک کر جھک رہی ہیں۔ قہرناکیوں کے جھکڑ میں ان کے چراغ زندگی آخری سانس لے رہے ہیں۔

مگر اس کے برعکس عالم اسلام کی کاروائیاں محض کاغذی ترمیم و تنسیخ اور زبانی مذمت تک محدود ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ خانوادۂ مسلم کا بچہ بچہ سروں پر کفن باندھ کر' ہاتھ میں شمشیر عمل لیے' ذوق جہاد سے سرشار میدان کارزار میں کود پڑتا اور سوز صدیقیؓ سطوت فاروقیؓ دولت عثمانیؓ اور رسم خیبر شکنی کو جلا بخشتا مگر یہ کیا ہے؟ ہم نے ایک سجدہ کو گراں سمجھ کر کئی سجدوں کا طوق اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ قاطع تثلیث' صلاح الدین ایوبی کی دینی امنگوں اور عسکری ولولوں کو فراموش کرکے ہم امریکہ کو اپنا منشیء تقدیر سمجھ بیٹھے ہیں۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی!
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

کیا یہ نظریہ توحید سے روگردانی نہیں؟ ہم قرآن کے عطا کردہ لائحہ عمل کو فراموش کرکے سنگ و خشت کے بتوں سے حاجت روائی کے طالب ہیں' حالانکہ ان کے پاس کچھ ہے اور نہ ہی یہ کسی کو کچھ دے سکتے ہیں۔ یہ تو اسلامی عقائد کے ساتھ سنگین مذاق ہے۔ میں افراد ملت کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کے خیالات کی موجوں میں اضطراب پیدا کرکے انہیں بتانا چاہتا ہوں' اب وقت آگیا ہے کہ ہم اسلاف کے گم گشتہ خزانوں کی پاسبانی کریں۔ جہاد و شجاعت کی جانفشانیوں اور ہمت و جرات کی جگر کاویوں سے قرطاس ہستی کے خالی اوراق پر اپنی تقدیر خود رقم کریں۔



ملت اسلامیہ
ماضی' حال اور مستقبل کے آئینے میں

خطہ کشمیر جنت نظیر کے بے گناہ مسلمان مدت ہائے دراز سے مسلسل بھارت کے ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ ہندوستانی درندے مجاہدین کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ان کی عزتوں کو سر عام نیلام کیے پھرتے ہیں۔ لیکن عالم اسلام کی کاروائیاں صرف مذمت تک محدود ہیں۔ مسلمان ایک تماشا ہیں اور غیر مسلم تماشائی۔ وہ قوم کل تک اوج ثریا جس کا مسکن تھا' آج قعر مذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں سسک رہی ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان کا لہو رنگ بدل چکا ہے۔ کیونکہ کبھی ایک مظلومہ کی فریاد پر خلیفہ کا دل تڑپتا تھا۔ جس کے خرمن طیش سے قصر داہر پر زلزلے طاری ہو جایا کرتے تھے۔ مگر آج کیا ہے؟ ہم فرزندان توحید کو ذبح ہوتے اور ان کی بے بسی کو بے رحم تماشائیوں کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں تڑپ' پاؤں میں سکت' زبان میں طاقت گویائی' ہاتھوں میں قوت ضرب کاری اور آنکھوں میں اشک آہ و زاری نہیں۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

تیرا بحر پر سکوں ہے' یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں' نہ خرابیء کنارہ

مسلم کی تن آسانی پر میرا دل تڑپتا ہے اور شب و روز خون کے آنسو روتا ہے۔ یہ قوم اسلام کی عظیم روایات سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھی ہے۔ تلواروں کی جھنکاروں کو فراموش کر چکی ہے۔ اب نوجوان مسلم حور فرنگ کا طلبگار ہے اور اس کے گلے پر اہل مغرب کی تلوار ہے۔

وہ قوم جس کے کان تلواروں کی جھنکار سے آشنا تھے آج اس کے مرد و زن چنگ و رباب کی مدھر سروں پر رقصاں ہیں۔ عوام تو عوام حکمران طبقہ بھی تان سین کے راگ و رنگ میں کھو چکا ہے۔ ان کے دل و نظر شباب پر فریفتہ ہیں۔ شراب اور کباب ان کا لازمہ بن چکا ہے۔ اب پھر حبابہ و سلامہ قصر شاہی کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ مسجد اقصیٰ کو مٹایا جا رہا ہے اور سومنات و کلیسا کو سجایا جا رہا ہے۔ اے مسلم! تو نے کبھی غور کیا ایسا کیوں ہے؟ یقیناً" اس لیے کہ ایوبی کی شمشیر زنگ آلود ہو گئی ہے۔ محمود غزنوی کا جذبہ بت شکنی ہمارے دلوں سے اٹھ چکا اور سلطان ٹیپو کی تلوار ٹوٹ چکی ہے۔ اب تم میں وہ ہوش نہیں ہے وہ جوش نہیں ہے۔ اگر اب بھی تم خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو "تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں"

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب' ایک کلیم سر بکف!

مسجد اقصیٰ کے پاسبانو! عالم اسلام کے حکمرانو! ایک ارب مسلمانو! تمہاری غیرت کو کیا ہوا؟ تمہاری حمیت کہاں کھو گئی؟ دست اغیار مسلم دوشیزاؤں کے پیرہن تار تار کر رہے ہیں اور ہماری معصوم بہنوں کی عصمت کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ جاؤ اور قدم قدم پر اپنی غیرت کا جنازہ دیکھو!

اے آسماں کچھ تو ہی بتا؟ یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے یا ہماری تن آسانی کا ثمر۔ یہ تاریخی اور کربناک زخم مسلمانوں نے اپنے سینے پر بڑی آسانی سے سہہ لیا ہے۔ ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی دلدوز چیخیں سن کر تو دنیائے اسلام میں قیامت بپا ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن یہ ذلت پسند قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اب صیاد کی نظریں باقیماندہ پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر چشم تاریخ سے دیکھا جائے تو یہ فلسفہ منکشف ہوتا ہے کہ جب فکر مسلم میں ذکر مصطفیٰ ﷺ نہ رہا اور دل مسلم میں خوف خدا نہ رہا تو یہ قوم پستی کی گہری کھائیوں میں جا گری۔
جب ساکنان حرم رقص گاہوں کے [illegible]

حل و عقد حسیناؤں کی آغوش میں سو گئے تو مسجد اقصیٰ اغیار کے تصرف میں چلی گئی۔ اب اگر اسلام کے جگر گوشوں کی سرگرمیوں کا مرکز فاران و یثرب کے بجائے لندن و پیرس بن چکا ہے تو وہی قوم جو رشک پروین تھی آج اس کی ناگفتہ بہ حالت بڑی عبرت آموز ہے۔

یہ سماں بھی ہم نے دیکھا سر خاک رل رہے ہیں
گل و انگبیں کے مالک مہ و کہکشاں کے پالے

دنیا بھر کے مسلمانو! ملت اسلامیہ کے جوانو! خود سے بیگانو! اپنے گریباں میں جھانکو اور سوچو کیا وہ تمہارے ہی آباء تھے جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے "دیواں آمدند دیواں آمدند" کا شور بپا ہو جاتا تھا۔

تھے تو وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو!

تمہیں ان سے کوئی نسبت روحانی نہیں' وہ اسلام پابند تھے اور تم صرف اسلام پسند ہو- وہ کردار کے غازی تھے اور تم گفتار کے غازی ہو- وہ سرفروش تھے اور تم ضمیر فروش ہو- وہ ہر چیز کو اسلام پر قربان کر دیتے تھے مگر تم اسلام کو ہر چیز پر نثار کر دیتے ہو۔

فلک پیر حال زار سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے جب تک مائیں اپنی گود میں بچوں کو محسن انسانیت ﷺ کی نعتیں سناتی رہیں تب تک نورالدین زنگی' بدر بن مغیرہ' محمد فاتح اور یوسف بن تاشفین پیدا ہوتے رہے اور جب مائیں تہذیب نو کی گرویدہ ہو گئیں' تو وہ اس شرف سے یکسر محروم ہو گئیں کیونکہ باجوں کی سروں اور ڈھولوں کی تھاپوں پر رقص کرنے والی ماؤں کے بطن سے طارق بن زیاد' محمد بن قاسم' موسیٰ بن نصیر اور حبیب بن مسلم پیدا نہیں ہوا کرتے۔

جب سفینہ مسلم کے ناخدا' خالد بن ولید' عمر بن عبدالعزیز' ناصرالدین اور اورنگزیب کے بجائے یزید ثالث' واجد علی شاہ' ابوالسفاح' محمد شاہ رنگیلا اور یحییٰ خاں مقرر ہو گئے تو بساط سلطنت بالکل الٹ گئی۔ اب تک یہ بات بے دھڑک کہتا

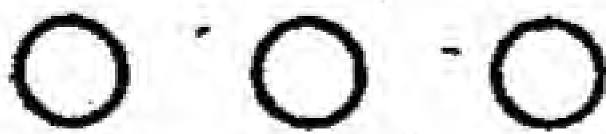
ہوں کہ عالم اسلام کے اکثر حکمران محمد شاہ رنگیلا سے بھی بدتر ہیں۔ کاش ارباب بست و کشاد سوچیں کہ کشمیر اور فلسطین کی خونچکاں داستانیں کس قدر اذیت ناک ہیں۔

درس قرآں کو گر ہم نے نہ بھلایا ہوتا
تو زمانے نے یہ زمانہ نہ دکھایا ہوتا

مجھے معلوم ہے کہ ملی بے حسی میرے جذبات کو محسوس نہیں کرے گی۔ میری دل میں جو خونیں سیلاب متلاطم ہے یہ بے حس قوم اس جوش غیرت سے بالکل نا آشنا ہے۔ آج مغربی ممالک مسلمانان عالم کی بد حواسیوں پر طنزاً" خندہ زن ہیں۔ مگر تم پھر بھی متاع حمیت کا مداوا ان ڈاکوؤں ہی سے چاہتے ہو۔ تم یو۔ این۔ او' کے آگے دست سوال بڑھاتے ہو اور کبھی امریکہ کی چوکھٹ کھٹکھٹاتے ہو۔ یہ فطرت کی تعزیر ہے کہ جو قوم نوک خنجر کو خون جگر میں ڈبو کر اپنی تقدیر خود تحریر نہیں کیا کرتی' اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

ظالمو! موت تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے مگر تم ابھی تک راز حیات نہیں پاسکے۔ تمہارے دکھ اور مسائل کا علاج امریکہ و روس کے ہاں نہیں۔ بلکہ تمہارے اس مرض کی دوا تو نجف و یثرب کے شفا خانوں میں ہے۔ اگر تم محسن انسانیت' کے حضور اپنا سر نیاز بتسلیم خم کردو تو تمہاری ذلت عزت میں' پستی بلندی میں' درد شفا میں' غمی خوشی میں اور زوال کمال میں بدل سکتا ہے۔ کیونکہ کارکنان قضاء و قدر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔

جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی' وہ ارمغاں تو ہے!



شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت' نہ معرفت ' نہ نگاہ

انسانی نظام حیات کا دار و مدار جسم اور روح پر مشتمل ہے۔ جسم کی بود و باش حقیقی باپ کے وسیلہ سے عمل میں آتی ہے لیکن جو روح کو تسکین خاطر کا سامان مہیا کرتا ہے وہ استاد یعنی روحانی باپ ہوتا ہے۔ یونانی مفکر ارسطو اور امام غزالیؒ نے شیخ مکتب کو گوہرہائے ارادت کچھ اس طرح پیش کیے ہیں کہ "حقیقی باپ نفس کو آسمان سے زمین پر لاتا ہے مگر روحانی باپ تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ پر لے جاتا ہے"

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

استاد شاگرد کے شعور کو بیدار کرکے تاریکیوں سے روشنیوں اور پستیوں سے بلندیوں کی جانب محو پرواز کرتا ہے۔ اسی لیے تو آفتاب صداقت' چشمہ ولایت' زبدۃ الاولیاء' زینت الاتقیاء' شاہ مرداں' شیر یزداں حضرت علی المرتضیٰؓ نے فرمایا "کہ جس نے مجھ کو ایک حرف بھی پڑھا دیا گویا اس نے مجھے اپنا غلام بنا لیا" مشفق اساتذہ' متاع جان و قلب کو گل و گلزار اور قلب و ذہن کی رنگا رنگی کو گلبار کردیتے ہیں۔ عظمت اتالیق کا اعتراف ناگزیر ہے۔ مامون الرشید جیسا شہزادہ بھی کفش معلم اٹھانے کے لیے مضطرب رہا کرتا اور استاد کے پاؤں میں اپنے ہاتھوں سے جوتا پہنانے کو وہ سرمایہ افتخار سمجھتا۔ استاد کی عظمت کا کون قائل نہیں؟ ارسطو کی دانش' لقمان کی حکمت' افلاطون کی اہمیت' سکندر کی حکومت' معتزلہ و بغداد کی شہرت' ابراہیم بن ادہم کی ولایت' امام غزالیؒ کا فلسفہ حقیقت' بایزید بسطامی کی عظمت' سعدی کی ہمہ صفت شخصیت' غالب کی جامعیت' اقبالؒ کی کیفیت'

جناح کی قابلیت اور احمد رضا کے علم کی وسعت' متذکرہ بالا کمالات و مراتب کسی بھی فرد کی وراثت نہیں۔ بلکہ یہ تو فیضان شیخ مکتب کا اعجاز ہے۔

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آب جو سے کیے بحر بیکراں پیدا

اساتذہ کی خاک پا سے ہی علم و حکمت کے گراں قدر موتی میسر ہوتے ہیں۔ اس لیے دین فطرت نے ساقی میخانہ درس کو بہت اہمیت دی ہے۔ مگر صد حیف کہ موجودہ دور میں استاد اور شاگرد کا یہ مقدس رشتہ پامال نظر آتا ہے۔ اساتذہ میں وہ شفقت رہی ہے اور نہ تشنگان علم و ہنر کے قلب و نظر میں وہ عقیدت رہی۔

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ پس از سبق!
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

اس کی وجہ ناقص تربیت' زمانے کی بدلی ہوئی ہوائیں اور فرنگی چالوں کے سوا کچھ نہیں۔ علامہ اقبال اسی ذہنیت کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

آج اساتذہ کارکنان اقتدار کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ شاید اسی لیے انہیں طلباء کی فلاکت و ہلاکت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اب چند سکوں کے عوض' جوہرہائے علم و فن کو نیلام کرنا ان کی مجبوری بن چکا ہے۔ جب استاد' استاد تھا تو اس کی شکستہ کٹیا طالب علموں کے لیے کسی حرم سے کم نہ تھی۔ مگر آج اساتذہ کی دیدہ نصب چوکھٹ پر عقید تمندان کا کوئی جھرمٹ نظر نہیں آتا۔ اب جانے اتالیق کی رہگزر میں چشم عقیدت کیوں نہیں بچھائی جاتی؟

کاش! ارباب مدرسہ اپنے گریبان میں جھانکیں اور سوچیں کہ آج عوام کے بچوں میں سے ان کا احترام کیوں اٹھ چکا ہے؟ کیا یہ [illegible] مکتب کے عرفان [illegible] ہے

کہ وہ چند سکوں کی خاطر گھر گھر کی خاک چھانتا پھرے؟ یہ امر مسلمہ ہے کہ ارباب مکتب اپنے مقام کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور وہ اپنے حقوق و فرائض سے یکسر بیگانہ ہیں۔ کارکنان مکتب کی عدم دلچسپی کے باعث اقبال کے شاہین بے راہ روی کا شکار ہو چکے ہیں اور ان پر زاغ ہونے کا گمان ہو رہا ہے۔

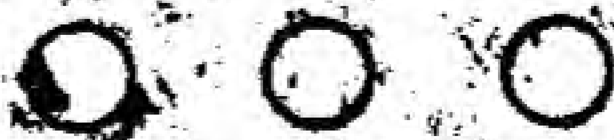
شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

آج سوئے مدرسہ سے اللہ اکبر کی اذانیں کیوں سنائی نہیں دیتیں؟ جوانان ملت نے نظریہ لا الہ کو کیوں فراموش کر دیا ہے؟ برعکس اس کے یہ حقیقت بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ تہذیب نوی میں پروردہ شاگرد بھی متلون مزاج ہیں۔ ان کا شعور و فکر مادیت گزیدہ ہے اور ناقص تربیت کے باعث ان کے اذہان خبیثہ اور افکار رذیلہ ہیں۔ قلوب تلامذہ نے استاد کی بے پایاں عظمت کو فراموش کر دیا ہے۔

کیا میں ارباب حل و عقد سے پوچھ سکتا ہوں کہ اندرون درس بیگانگی و تنفر کے اس ماحول میں طفل مکتب شاہیں کیسے بنے گا؟ اگر بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو قریب قریب اساتذہ بھی سب بے دوش ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے خانہ اغیار کا طواف' دربدر کی ٹھوکریں اور جگہ جگہ سجدہ ریزی ان کا مقدر ٹھہر چکا ہے۔ کیونکہ ارباب بست و کشاد کی عدم دلچسپی اور دیگر مشاغل انہیں اساتذہ کی مرفہ الحالی پر پوری توجہ نہیں دینے دیتے۔

عہد حاضر کے طلباء کی بے راہ روی کا تو یہ عالم ہے کہ ان کی تربیت نیلگوں آکاش سے کواکب کی خوشہ چینی کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود تمام شعبہ ہائے زندگی میں معلم کا کردار مسلمہ ہے۔ انسان کو انسان بنانا اتالیق کا زندۂ جاوید کمال ہے۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی



۱۴۔ اگست کے لیے

(ایک رخ)

ہم نے سوکھی ہوئی شاخوں پہ لہو چھڑکا تھا
پھول اگر اب بھی نہ کھلتے تو قیامت کرتے

اپنے پیارے وطن کی حالت زار دیکھتے دیکھتے میرے دل میں درد اور آنکھوں میں ایک مدت سے فصل گریہ لہلہا رہی ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ میں خود ہی سراپا درد بن چکا ہوں۔ آج یہ سوچ کر کہ خاموشی کسی نہ کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اہل دل کی اس محفل میں چیخیں سنانے چلا آیا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے ساتھ ذرا اجڑے دیاروں تک چلیں گے۔

تاریخ کے ان کھنڈرات میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں' بلند پایہ مجاہدوں اور تحریک پاکستان کے مخلص و سرفروش رضا کاروں کی عظمت و بلندی اور شان و سطوت کی بے گور و کفن میت پوری دنیائے اسلام کو دعوت ماتم دے رہی ہے۔ ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم کی چشم فکر جب ان ویرانوں تک پہنچی تو انہوں نے گھبرا کر معرکے کا شہر آشوب لکھا۔ شاعر مشرق کے ملفوظات میں مدفون' زوال مسلم کے درد و غم کی ہچکیاں اور سسکیاں اگر ہمارے پردہ سماعت سے ٹکرا جائیں تو یقیناً ہم موم کی صورت پگھلنے لگیں گے یا گھبرا کر پتھر ہو جائیں گے۔

پا برہنہ' مو پریشاں' آہ برلب' رنگ زرد
دست بر سینہ ہے اور صورت ہے گھبرائی ہوئی

اتنے مختصر اور قلیل وقت میں تاریخ کی تمام کڑیاں کس طرح ملائی جا سکتی ہیں۔ حصول آزادی کی اس داستان کو کسی غمزہ و عشوہ کی ضرورت نہیں' یہ تو ایک حقیقت ہے اور حقیقت بھی وہ جو افسانے سے زیادہ خوبصورت اور زور دار ہے۔

صدر ذی شعور! پاکستان تو اس وقت کا بن چکا ہے جب پہلے مسلمان نے برصغیر میں قدم رکھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ اسلامی مملکت اس وقت ہی معرض وجود میں آگئی تھی جب یہاں کا پہلا شخص کلمہ توحید پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ کا یہ ہوش ربا نظریہ اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ دنیا بھر کے غیر جانبدار مورخ اس کی گہرائی اور گیرائی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ لطف یہ کہ اک نادر روز گار شخصیت نے یہ ناقابل فراموش تاریخی حقیقت صرف ایک فقرے میں بیان کردی ہے۔

فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے! کہ آج تحریک پاکستان کے متعلق دقیانوسی قسم کے کئی نظریات پیش کیے جا رہے ہیں۔ کچھ لندن کی لائبریریوں کے حوالے سے مملکت خداداد کو انگریزوں کی سازش قرار دیتے ہیں اور بعض اسے بانی پاکستان کے حوالے سے مغربی جمہوریت کی ڈگر پر چلانے کے لیے افسانے گھڑ رہے ہیں۔ ایسا کہنا در حقیقت شہیدوں کے مقدس لہو کے ساتھ بھیانک مذاق ہے۔ پاکستان دنیا بھر میں واحد نظریاتی ملک ہے جو اسلام کا قلعہ اور غلامان مصطفیٰ کی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ گویا پوری دنیائے اسلام ایک جسم اور یہ اس کی جان ہے۔

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو!

اگر بنظر عمیق تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ حضرت قائداعظمؒ کو ملی درد کے طفیل جو نور بصیرت عطا ہوا" بڑے بڑے لیڈر اور نامی گرامی سیاستدان اور شہرہ آفاق خطیب بھی اس سے محروم رہے۔ وہ دور جب انہوں نے غیروں کی ہمنوائی کی۔ سوامی شردھانند ایسے دشمن رسول کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر لا کھڑا کیا اور ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگا کر اس کینہ فطرت، گستاخ نبی کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ مزید برآں شیخ دیوبند حسین احمد مدنی نے برسر منبر یک قومی نظریہ کے حق میں کہا "قومیں اوطان سے بنتی ہیں عقائد و نظریات سے نہیں" لیگ نے کہا کسی ماں نے آج تک ایسا جنا ہی نہیں.

جنا جو پاکستان تو کیا' پاکستان کی "پ" بھی بنا سکے۔ دوسرے نے کہا "اگر پاکستان بن گیا تو میں اپنی داڑھی کتے کے پیشاب سے منڈوا ڈالوں گا" ایک کانگریسی ملا نے محسن ملت' محمد علی جناحؒ کے متعلق یاوہ گوئی کرتے ہوئے کہا "یہ قائداعظم نہیں کافراعظم ہے" تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ایک نام نہاد عالم دین نے فتویٰ دیا تھا کہ "مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے کافر ہیں کسی مسلمان لڑکی یا لڑکے کا ان کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا"

سورج میں لگے دھبہ فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

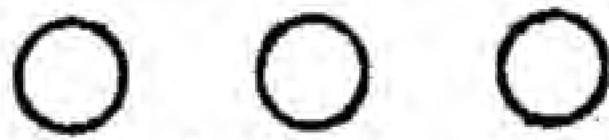
اس نازک موڑ پر ایک مرد جری جسے دنیا قائداعظمؒ کے نام سے جانتی ہے استقامت کا عصا اٹھائے' حب رسولؐ کا منشور لیے' یک قومی نظریئے کو پاش پاش کر کے صداقت' دیانت' عظمت' رفعت اور جرات کے زینے طے کرتا ہوا مسلمانان ہند کے دلوں میں گھر کر گیا۔ وہ شخص کون تھا؟ کوئی ملا یا پیر نہ تھا۔ کسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا کوئی عالم یا مقرر نہ تھا۔ دو قومی نظریئے کا درس دینے کے لیے جس طرف ان کے قدم اٹھے لوگوں نے اپنی آنکھوں کو فرش راہ کیا۔ راستے میں دلوں کی دھڑکنیں بچھا دیں کسی ایسی ہی کیفیت سے دو چار ہو کر شاعر پکار اٹھتا ہے۔

یہ آج راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ
یہ خواب میں نے رات ہی دیکھا تھا خواب میں

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ عظیم انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ مادر گیتی انہیں عرصہ ہائے دراز کے بعد کہیں جنم دیتی ہے۔ ایسے انسانوں کے لیے تاریخ کو مدتوں منتظر رہنا پڑتا ہے۔ جاں بلب انسانیت کی نگاہیں بسالہا سال دیر و حرم کا طواف کرتی ہیں تب جا کر کہیں کوئی انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ عظیم انسان ہوتے ہیں جو نہ صرف عظمت و بلندی کی بالائی صفوں کو چھوا کرتے ہیں بلکہ ان کے نقش قدم کی نسبت سے خود عظمت کا معیار طے کیا جاتا ہے۔

چند برس قبل پوری دنیا میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ ایکسیڈنٹ میں ایک تاریخ ساز رہنما کا بازو کٹ گیا ہے۔ کل پھر اخبارات میں یہ خبر نمایاں تھی کہ اتنی طویل مدت گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کٹے ہوئے بازو سے تازہ خون رس رہا ہے۔ یہ حیرت انگیز اور درد ناک خبر سن کر میں بھی دیکھنے چلا گیا۔ قریب سے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا تو مجھے اپنے پیارے وطن کا نقشہ دکھائی دیا۔ میں پریشان ہو گیا' آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہولے سے کسی نے کان میں کہا کہ آج ۱۴۔ اگست ہے۔ میری چشم تصور نے حضرت قائداعظمؒ کے مقبرے کا طواف کیا۔ وہاں دیکھا کہ لوح مزار اور تعویذ کے عین درمیان میں دراڑ سی آگئی تھی۔ قبر کے اندر جھانکا تو خالق پاکستان کا پورا جسم دو حصوں میں کٹا ہوا ملا۔ مجھے سقوط ڈھاکہ یاد آگیا۔ میں یہ اذیت ناک منظر دیکھ کر گر پڑا کہ سقوط ڈھاکہ سے صرف ہمارا مشرقی بازو ہی نہیں کٹا بلکہ ہمارے قائد کا جسم بھی دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔

اندر لگی تھی آگ مگر بے خبر تھے لوگ
جلتے ہوئے مکان سے باہر دھواں نہ تھا



۱۴۔ اگست کے لیے

(دوسرا رخ)

ابھی کچھ دیر پہلے میرے ایک دوست تاریخی حقائق سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ ان کے نشتر تقریر کے نیچے انگریزوں اور ہندوؤں کے ہاتھ' دولت بیدار فروخت کرنے والے سینکڑوں خطیبوں' عالموں اور ضمیر فروش سیاستدانوں کے لاشے تڑپتے' پھڑکتے اور دم توڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا درد و سوز بجا' لہجہ و فکر میں گہرائی اور آنکھوں میں گیرائی مسلمہ' تاریخ کی گم گشتہ کڑیوں کا ربط برحق' اپنوں کی اپنوں سے بے وفائی' غیروں سے ہمنوائی اور دشمنوں سے آشنائی جیسے قومی و تاریخی المیے پر اہتمام ماتم مبنی بر حقیقت ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز اخذ نہ کیجئے گا کہ تاریخ کے ان پر کٹھن دنوں میں جب نظریاتی بنیادوں پر حصول وطن کی مخلصانہ کوششیں ہو رہی تھیں تو حلقہ درس و مکتب اور خانقاہوں میں رہنے والے سب کے سب ہی بے وفا تھے۔

قطع نظر اس کے اگر چہرۂ تاریخ سے دھول اتار کر جہاں بیں نگاہوں سے اس کا مطالعہ کیا جائے اور کانوں کے دریچے وا کیے جائیں تو تاریخ کے اوراق چیخ چیخ کر برسوں سے اپنے سینے میں مدفون اہل وفا اور جفا پیشہ لوگوں کی عبرت انگیز اور ایمان افزا داستانیں از خود سنا ڈالیں گے۔

جاگتی نظروں سے تم پڑھنا کبھی تاریخ کو
لٹنے کا سبب اور سانحہ مل جائے گا

جی ہاں! میں کہہ رہا تھا کہ اگر ایک طبقہ یک قومی نظریئے کی حمایت کر رہا تھا تو دوسری طرف دو قومی نظریئے کا پرچار کرنے والوں کی کمی بھی نہ تھی۔ اس وقت بعض لوگ بظاہر تو حرم کا طواف کر رہے تھے مگر در حقیقت یہ طواف حرم نہیں ان کے نصیب کا چکر تھا۔ اور جو مومن نگاہیں گنبد خضراء پر لگی تھیں وہ خطہء ہند میں بیٹھ کر بھی رومیؒ و جامیؒ کے عشق و سوز کو اپنا اثاثہ بنائے شوقِ

قسمت پر نازاں تھے۔

اگر تاریخ کی کڑیاں مربوط کی جائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس خطہ ارض پر دین حق کی ترویج و اشاعت بزرگان دین اور اولیائے کرام کے توسل سے عمل میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے مزاج میں عشق رسول' جذبہ جہاد' اخلاص و مروت اور اولیاء اللہ سے عقیدت فطرتاً" رچی ہوئی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی اساس مولانا فضل حق خیر آبادی" کا فتویٰ جہاد ہے۔ بنا بریں جب ہندو مسلم کے متحدہ محاذ سے ترک موالات کی تحریک چلی تو بڑے بڑے دانشور جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اس وقت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی" نے فرمایا "مسلمانوں کی ایک آنکھ کھلی ہے اور دوسری تا ہنوز بند ہے۔ یعنی یہ ایک دشمن انگریز کو تو دشمن اور دوسرے دشمن ہندو کو اپنا دوست خیال کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ از روئے قرآن دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں' ایک مسلمان اور دوسری تمام غیر مسلم۔ ہندو ہوں یا بدھ مت' عیسائی اور یہودی یہ سب مسلمانوں کے ازلی و ابدی دشمن ہیں۔

اگر سانپوں نے تم کو ڈس لیا ہے تو گلہ کیسا!
تمہیں کس نے کہا تھا ان کو پالو آستینوں میں

حضور والا! امیر ملت پیر جماعت علی شاہ قبلہ علی پوری" نے ایک موقع پر فرمایا تھا "جو مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دے گا وہ ہمارا مرید نہیں" ایک اور جگہ ارشاد فرمایا "جو مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیں خبردار! انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے" حضرت قبلہ دیدار علی شاہ الوری" کے تربیت یافتہ علماء و مجاہدین نے پاک و ہند کے کوچہ کوچہ میں دو قومی نظریے کے دیپ جلائے۔ خواجہ قمر الدین سیالوی" کی جائیداد' آزادی وطن کے حصول کے جرم میں کئی بار لوٹی گئی۔ انہیں چند بار جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

ہندوستان بھر کے مشائخ خصوصاً" امیر حزب اللہ پیر فضل شاہ جلالپوری" خواجہ نور بخش چوراہی" حضرت بابو جی گولڑوی' پیر آف مانکی شریف اور پیر

آف ذکوڑی شریف ایسے بلند پایہ بزرگوں نے گاؤں گاؤں، شہر شہر اور قریہ قریہ جا کر پاکستان کے لیے فضا ہموار کی۔ حضرت قبلہ عبدالعلیم صدیقی صاحب نے عرب ممالک میں نظریہ پاکستان کا فلسفہ اجاگر کیا۔ جبکہ دوسری طرف اس باب میں صرف اور صرف دو مشاہیر مولانا غلام مرشد صاحب اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

جیسے یہاں بھی اپنا قبیلہ ہے خیمہ زن
یہ اجنبی سا شہر بھی کچھ آشنا لگے !!

بنارس سنی کانفرنس میں دس ہزار سے زائد علماء و مشائخ کرام اور سواد اعظم کے دیگر کئی معروف رضا کاروں نے متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی تھی کہ خدانخواستہ اگر کسی وقت قائداعظمؒ مطالبہ پاکستان سے دستبردار بھی ہو جائیں تو ہم پھر بھی پاکستان حاصل کیے بغیر دم نہیں لیں گے۔ ایک موقع پر امیر ملتؒ کے شدت خلوص کو دیکھ کر قائداعظمؒ نے فرمایا تھا۔ آج سے پہلے مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ میں اپنی زندگی میں پاکستان حاصل کر سکوں گا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میں نے انشاء اللہ اس مقصد میں کامیاب ٹھہرنا ہے۔ اس لیے کہ جب آپ جیسی محترم ہستیوں کی حمایت اور دعائیں معاون ہوں تو ناکامی سے کسی صورت بھی واسطہ نہیں پڑ سکتا۔

جن کی صداقتوں پہ کوئی شک نہ کر سکے
میں بھی کتاب دل کی انہی آیتوں میں ہوں

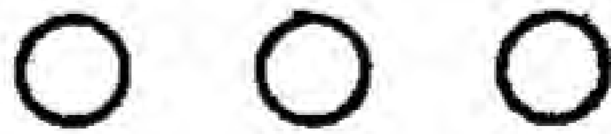
مجھے تو تاریخ پاکستان کے اوراق سے شہیدوں کے لہو کی خوشبو آتی ہے۔ میری متجسس و بے قرار نگاہیں جب بھی ماضی قریب کے ویرانوں کا سفر کرتی ہیں تو جا بجا شہیدان رسالتؐ کی عظمتوں کے مینار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تو ایک مسلیم شدہ حقیقت ہے کہ میدان جنگ میں افراد کی موت، قوموں اور تحریکوں کے لیے زندگی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ جس قوم کو زندگی سے محبت ہو جائے موت ہمہ وقت اس کا پیچھا کیا کرتی ہے۔ غالباً" کی [illegible] ہے کہ ہم [illegible] کی بات کیا

کرتے تھے۔ مگر وہ تو کیا حاصل کرتے کہ مشرقی پاکستان بھی گنوا بیٹھے۔

سرفروشی کے صلے میں تنکا تنکا جوڑ کر
خود بنایا تھا جسے وہ آشیاں خطرے میں ہے

حصول آزادی کشمیر کی خاطر ایک مدت تک تو صرف زبانی جمع خرچ ہوتا رہا۔ پھر اقوام متحدہ کے بے بس ادارے میں یہ سوال اٹھایا گیا۔ بعد ازاں تسلی دل کے لیے دنیا بھر میں وفود بھیجے گئے تاکہ پاکستان کے موقف کی وضاحت کی جائے۔ ایسا ہی ایک وفد ۱۹۶۰ء کے اوائل عشرہ میں بن بیلا جو اس وقت الجزائر کے صدر تھے' کے پاس بھیجا گیا۔ خواجہ شہاب الدین نے قائد وفد کی حیثیت سے وضاحت کی جسے بن بیلا نے بڑی توجہ سے سنا۔ جب خواجہ صاحب بات ختم کر چکے تو بن بیلا انہیں کھڑکی کی طرف لے گئے۔ کمرے سے باہر ایک وسیع قبرستان نظر آرہا تھا۔ انہوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے پاکستان کے موقف سے پوری ہمدردی ہے لیکن قربانی کے بغیر سب کوششیں بیکار ہیں۔ باتوں سے کام نہیں چلے گا" انہوں نے مزید کہا کہ "یہ قبرستان الجزائر میں سب سے خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں الجزائر کی آزادی کے آٹھ لاکھ شہید دفن ہیں۔ جاؤ اپنے ملک میں ایسا حسین' خوبصورت اور وسیع قبرستان بناؤ' میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کشمیر آزاد ہو جائے گا"۔

ملتا ہے کسی کو نہ یہ زاری سے نہ زر سے
انصاف ملے گا اسے' حاصل ہو جسے زور



جانے والے تیرے قدموں کے نشاں باقی ہیں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

میری زندگی کا یہ کتنا تحیر انگیز لمحہ ہے جب مجھے دعوت سخن سے نوازا گیا تو بے ساختہ گوہر حروف، بحر سینہ سے اچھل کر ساحل تک آگئے۔ آہ' باغیچہ مکتب ایک دیرینہ باغباں کے ظل عاطفت سے محروم ہوگیا۔

میں آج حالات کی دہلیز پر بیٹھے اس سوچ میں مستغرق ہوں کہ علم و لوب کے پیکر، خوبی و کمال کے مجسمہ ' سیرت و کردار کے مرقع کی الوداعی تقریب میں خراج تحسین کا کونسا نمونہ پیش کروں؟ میں شاعر ہوتا تو حروف بے ترتیب کو پیکر سخن دیتا۔ ذوق موسیقی سے شناسائی ہوتی تو ساز و آواز کے جادو جگاتا لور اگر میں فن نطق کا ماہر ہوتا تو بے دریغ خطابت کے جوہر لٹاتا۔ مگر میں شاعر ہوں' نہ مصور لور نہ ہی مقرر۔ ایک ذخیرۂ الفاظ کی عاجزی کا احساس دامن گیر ہے تو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ہنر سے بھی میں مطلقاً بے خبر ہوں۔ بااپں ہمہ میرے نوک قلم میں تاب ضبط نہیں۔ اس تغیر و تبدل سے حالات کے ماتھے پر جو نمایاں شکن نمودار ہوئی ہے اس سے رشک ارم کا ایک دور ختم ہوگیا۔

تیرے ساتھ گئی وہ رونق!
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے۔

اس حدیث آزردگی سے میرے دل میں مکتب کی لوح ماضی پر مرتسم نقوش کے مطالعے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ لور میں جہان تصور میں اس مسودہ کی ورق گردانی میں منہمک ہوگیا جسے معلم ممدوح کے نام معنون کیا گیا ہے۔ مطالعہ شوق کے سامنے خود بخود چہرۂ ماضی سے نقاب اٹھنا شروع ہو گئے لور میرے پردۂ افکار پر ان کے کرامات کی فلم چلنے لگی۔ آئینہ ماضی میں مجھے جھلکوں وہ تصاویر نظر آئیں جو

آج کلیدی مناصب پر متمکن ہیں۔ ارلوت کیشی سے مخموران کی جھکی نگاہیں بتا رہی ہیں "یہ تو کسی کے فیض نظر کا کمال ہے" آپ کی بے پایاں صلاحیت ان گنت خروں کو قاضی بنا چکی ہے اور آپ کی عمیق نظر نے کور ذوقی کی تاریکیوں میں بھٹکنے والے بے شمار لوگوں کو علم و فن کی روشنیوں کا خوگر بنا دیا ہے۔

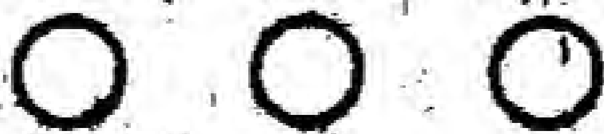
اب ساکنان گلشن کے لیے بار ہجراں کا متحمل ہونا ناگزیر ہے وگرنہ گردش لیل و نہار میں سالہا سال جو گلاب میں نکہت، آنکھ میں کاجل، ہونٹوں پر تبسم اور دل میں دھڑکن کی طرح مکیں رہا ہو، اس سے ایک لمحہ جدائی کا تصور بھی کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ اب تو فصل بہار پر بت جھڑ کا گمان ہو رہا ہے۔

چہروں کو پڑھنے والے اب پیشانی کی شکنوں سے روح کی گہرائیوں میں پنہاں محدود کرب کا اندازہ بڑی آسانی سے لگا سکتے ہیں کیونکہ تا حد نظر زباں گنگ، حواس مختل اور آنکھیں مبہوت نظر آرہی ہیں اور وہ زیر لب گنگنا رہے ہیں۔

وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے

اگر ارباب بست و کشاد کے روز و شب کا جائزہ لیں تو ان کا بسیرا فقط ایوان مرمریں میں ہوتا ہے مگر جب ہماری توجہ اس درویش صفت اتالیق کی شوخی قسمت پر مرکوز ہوتی ہے تو بلا چون و چرا آپ کی منفرد عزت و توقیر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ حلقہ احباب میں اگر آپ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں تو قلوب تلامذہ میں بھی آپ سے والہانہ ارادت پنہاں ہے۔ آپ کی سیرت و کردار کو قید حروف میں محبوس کرنا انجم شماری کے مترادف ہے۔ میں تو اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے صرف یہی کہوں گا۔

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن!!
بڑی اداس بڑی سوگوار گزرے گی



اب ڈھونڈا انہیں چراغ رخ زیبا لے کر

اس دوراہے پر افکار کا ساغر ٹوٹ کر کچھ اس طرح بکھرا ہے کہ اس کی کرچیاں چنتے ہوئے خیالات کے ایک نئے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں کیونکہ تفکرات کے کلیسا میں الوصل الوصل کی پکار نہیں الفراق الفراق کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ ساقی میخانہ درس سے متعلق اس منعقدہ تقریب میں' میں بے نوا کیا کہوں؟ کس سے کہوں؟ کیسے کہوں؟ اور کیونکر کہوں؟ کہنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں مگر شاید کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔ اس لیے کہ میخوار اپنے ساقی کے حضور جرات اظہار نہیں کرپاتا۔ آج خاموشی گفتگو اور بے زبانی میری زبان ہے۔ باایں ہمہ میرے دل میں حباب کی مانند چھالے ہیں' وہ دکھانا چاہتا ہوں۔ ایک چیخ ہے جو آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی ایسا ترازو ہوتا جس سے لہجہ گفتگو میں پنہاں سوز و گداز کو تولا جاسکتا تو کرب کی یہ شدت یقیناً" پتھروں کے سینے میں بھی فصل گریہ اگا دیتی۔ غم تو یہ ہے کہ لامحدود کرب کو کسی طرح بھی لفظوں میں سمیٹا نہیں جاسکتا۔

لفظ پھر لفظ ہیں جذبوں کو سمیٹیں کیونکر
میں کیسے کر پاؤں اظہار عقیدت تجھ سے

میں سوچتا ہوں اگر اس مقدس شجر کی گھنی چھاؤں نصیب نہ ہوتی تو میں اندھیروں کی دلدل میں پھنس کر زندگی کے شعور سے بھی محروم رہا ہوتا۔ کوئی مجھے بتائے تو سہی آج ہر ایک صورت پریشان اور آئینہ خود بھی حیران کیوں ہے؟ ہر طرف یہ پھولوں جیسے چہرے مرجھائے ہوئے کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟ کیوں نہیں' خوشبو کے اڑ جانے سے گلوں پہ افسردگی چھا ہی جایا کرتی ہے۔ مکیں کی جدائی میں مکاں کا غمزدہ ہو جانا ایک فطری بات ہے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ولوی ظلمت میں آپ کی ذات ایک قندیل تھی۔ ایک چراغ ہے جس سے کئی اور چراغ جلتے گئے۔ آپ نے علم و آگہی کی اتنی ضیائیں بکھیریں کہ یہ دور افتادہ قصبہ اور مضافات پوری طرح روشنیوں میں نہا گئے۔ اس باغباں کی جگر کاوی سے گلستاں میں اتنے پھول کھلے کہ ہر طرف حسن و رعنائی کے چرچے ہونے لگے۔ موصوف ہمہ صفت متصف ہیں آپ خوش گفتار ہیں اور خوش کردار بھی۔ آپ کی شخصیت الفت و ارادت کا ایک چاند ہے جس کے گرد ہمہ وقت وفادار ستاروں کا جھرمٹ دکھائی دیتا رہا ہے۔

اب کے محفل بھی عجیب ہے کہ تنہائی کا احساس ہو رہا ہے۔ قہقہے پھر بھی سنائی دیں گے مگر کھوکھلے سے۔ محفل آرائیاں تو ہوتی رہیں گی مگر بے رونق و بے کیف! اب تو ہر جانب جگر گدازی، سینہ کاوی، دلخراشی اور جانکنی کا سماں ہے۔ واقعی سچ ہے، میر مجلس کے بغیر اہتمام کاہے کا۔ ادارے کی تاریخ میں اخلاص و مروت کے قلم سے آپ ایک داستان لکھ چلے ہیں جو اہل دل کو ہمیشہ تڑپاتی رہے گی۔ جب بھی کبھی چھو ماضی سے نقاب اٹھے گا تو یادوں کی کتاب سے زہرہ گداز سسکیاں سنائی دیتی رہیں گی۔

ہونٹوں کو اس کے سامنے جنبش نہ ہو سکی
دہلیز دل پہ سہمی تمنا کھڑی رہی

آپ کا نام لب ہونٹوں پر حرف دعا کی طرح مچلتا رہے گا۔ پہلے آنکھیں لذت دیدار پر نازاں تھیں اور اب دل لذت فکر کی گوناں گوں مستیوں پر فخر کیا کرے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ آپ صاحب علم و عرفان! محبت و ارادت اور اخلاص و مروت کے امیں تھے، آج ہیں اور کل بھی رہیں گی۔ ہمارے ساتھ تو جو گزری سو گزری، اشخاص بھی تنہیوں سے ہماری آنکھ چھلنی ہوتی رہے گی، مگر جانے والے دوستوں کے بچھڑنے کی اپنی کیفیت بیان کر رہے ہیں۔



الوداعیہ خطاب!

میں سوچ رہا ہوں کہ آج الوداعی تقریب کے الوداعی خطاب میں کیا کہوں، کس سے کہوں اور کس طرح کہوں؟ مجھ میں جرات اظہار ہے نہ اظہار شوق کا سلیقہ! اور پھر شوق و غم کے ملے جلے جذبات کو الفاظ کے آئینے میں اتارنا تو یوں بھی انتہائی دشوار ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس مقام پر گویائی کے قرینے ساتھ چھوڑ جاتے اور اظہار کی جراتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ لیکن جب کبھی بھی ساز پر چوٹ پڑتی ہے تو وہ اپنے ظرف کے مطابق کوئی نہ کوئی آواز ضرور نکالتا ہے۔ آج جب ہمارے دل و نظر کی تاروں کو چھیڑا گیا تو خوشی کے نغمے پھوٹے اور چیخوں سے مشابہ سریں بھی۔ ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں آنسو بھی۔ اشک، غم کی علامت ہوتے ہیں اور تبسم خوشی کا ثبوت! آپ جانتے ہی ہیں کہ صدف کی قدر و قیمت موتی کے دم سے وابستہ ہے اور آج ہماری آنکھوں میں جو سچے موتی جھلملا رہے ہیں ان کو کوئی صاحب دل جوہری ہی سمجھ سکتا ہے۔

میں جس کے واسطے پتھر بنا رہا اب تک
بدل دیا ہے مزاج اس کے آنسوؤں نے مرا

بہر حال ہماری کیفیت بانسری سے ملتی جلتی ہے کہ اس کے سینے میں چھید ہوتے ہیں مگر وہ پھر بھی گاتی ہے۔ اس لیے میں رو رو کر آپ کو رلانا نہیں چاہتا۔ ہم حصول تعلیم جیسے عظیم مقصد کے لیے چار و ناچار ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔ بالکل ندی کے کناروں کی طرح کہ وہ طویل مسافت کے بعد، ایک ہی ماں کے بیٹے منشائے فطرت کی تکمیل کے لیے مختلف سمتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اب ہمارے راستے تو جدا جدا ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کا جنون ہماری زندگی ہے اور جان بھی۔ یہ مقصد عزت ہے اور وقار بھی۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ معرفت الٰہی کا سبب بھی یہی ہے۔

میں شاعر ہوتا تو ماہی بے آب کی کیفیت کا نقشہ کھینچتا یا پھولوں سے خوشبو

اڑے جا رہی ہے کی تشبیہہ سے کام چلاتا۔ لیکن میں شاعر نہیں ایک طالب علم ہوں۔ اس لیے اپنے جذبات کو سادہ پیرائے میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

کہنہ لمحے حافظے میں سسکیاں لینے لگے
تازہ جذبے اس طرح بھڑکے کہ لو دینے لگے

آج حالا کے موتی دانہ دانہ ہوتے نظر آرہے ہیں۔ چمنستان مکتب کے گلہائے رنگارنگ مرجھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حجر و شجر افسردہ و پژمردہ نظر آرہے ہیں در و بام سے اداسی ٹپک رہی ہے۔ گویا وہ حلقہ مکتب جو بہاروں کا نشیمن تھا آج خزاؤں کا مسکن بن گیا ہے۔

میں نے دیکھی ہیں ہر ایک پھول کی آنکھیں پرنم
کیسے کہہ دوں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

فضاؤں کی افسردگی اور گلشن کی پژمردگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج گلاب کی پتیاں ادھر ادھر بکھرنے والی ہیں اور مانوس چہرے آنکھوں سے اوجھل ہونے والے ہیں۔ ادھر لذت علم کا شوق آپ کو کشاں کشاں ہم سے دور لیے جا رہا ہے اور ادھر احساس جدائی کے پھپھولے متقاضی ہیں کہ آپ کو کبھی جانے نہ دیا جائے۔

یہ جھکی نگاہیں جانے کتنی معصوم تمناؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہیں۔ یہ مغموم اور زرد چہرے رنج و غم پر مبنی جذبات و احساسات کی غمازی کر رہے ہیں۔ جدائی کے کربناک لمحات کے باعث ہمارے ہونٹوں سے وہ ذوق تبسم چھن گیا ہے۔ ہمارے قہقہوں کی شوخیاں ماند پڑ گئی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے دھواں نہ اٹھے' دل بھی جلے
چوٹ پڑتی ہے تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں

وہ نو عروسان چمن جو انداز بہت جھڑنے سے نا آشنا تھے۔ آج ان کے رخسار بے رونقی کی آماجگاہ بن گئے ہیں اور چہرے خزاں کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ کاش! کوئی سخن شناس ہمارے اس کرب و الم کی گہرائیوں کو الفاظ میں سمو سکتا۔ اطمینان قلب و نظر کی خاطر دور اندیشی یہ الاپ رہی ہے کہ جلوت بھی

خلوت، کبھی قربت کبھی فرقت، اس جگہ کبھی اس جگہ، خوشی کبھی غمی، کبھی ادھر اور کبھی ادھر یہ گردش لیل و نہار کا کرشمہ ہے۔

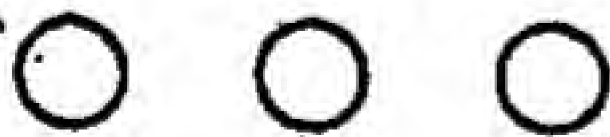
کیا ہوا مجھ میں اگر جرات اظہار نہیں
آپ نظروں کی زباں بھی تو سمجھتے ہوں گے

مگر ہم یہ کہہ کر دل ناداں کو تسلی دے رہے ہیں کہ "دوریاں قربت کے شعلوں کو ہوا دیتی ہیں" برادران عزیز! ہماری چاہتیں کچھ کم نہ ہوں گی۔ جب کبھی آؤ گے تو دیدہ و دل کو فرش راہ پاؤ گے۔

مجھے امید ہے آپ ہماری کردہ و ناکردہ خطاؤں اور چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو فراموش کر دیں گے۔ میٹھی میٹھی حکایتوں اور چاہت بھری شکایتوں کے دیپ ہمیشہ جلائے رکھو گے۔

آخر میری یہ دعا ہے کہ آپ علم و فن کے بحر بیکراں میں غواصی کر کے وہ جواہر تابندہ حاصل کریں جو آپ کے مستقبل کی شادمانیوں کا باعث بنے اور قوم و وطن کے دامن بھی بھر جائیں۔ خدا کرے آپ نیلگوں آکاش پر کواکب کی مانند ہمیشہ تابندہ و زندہ اور سدا کلیوں کی طرح شگفتہ رہیں۔ ناصر کاظمی نے شاید ایسے ہی موقع پر کہا تھا۔

خیر تجھے تو جانا ہی تھا
جان بھی تیرے ساتھ چلی ہے



جوابیہ خطاب!

کچھ لوگ ماں کی دعاؤں کی طرح مخلص ہوتے ہیں۔ ان کی یادیں ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں۔ انہیں بھلانا بھی چاہیں تو کسی طور بھلایا نہیں جاسکتا' کیونکہ بھلانے کی جستجو میں بھی یقیناً بہت کچھ یاد رہ جاتا ہے۔

میرے دوست نے الوداعیہ خطاب میں ایک بڑی لطیف مثال دی ہے۔ میں اس سلسلے میں عرض کرتا چلوں کہ بانسری گو اندر سے خالی ہوتی ہے مگر اس کا سینہ پھر بھی چیخوں سے معمور رہتا ہے۔ ہم کوئی کتاب کے پھول تو ہیں نہیں کہ سوکھ جائیں گے یا ہمارے پاکیزہ جذبوں کی خوشبو انجانی سمتوں میں کھو جائے گی۔ میرے خیال میں ہمارے راستے بھی ایک سے ہیں اور منزل بھی ایک! کیونکہ ہم سب علم و فن کے متلاشی ہیں۔ میرے دوست نے آنسوؤں کی بات کی ہے۔ ہمارے دل کی حالت بھی اس سے چنداں مختلف نہیں۔

سجائے رکھتے ہیں چہرے پہ جو ہنسی کی کرن
نہ جانیے روح میں کتنے شگاف رکھتے ہیں

علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی مذکورہ رنجشوں کے افسانے میٹھی میٹھی حکایتوں اور شکایتوں کے تذکرے ہمارا موضوع گفتگو ہلکہ روح گفتگو ہو گا۔ بہر صورت ہم جب کبھی حافظے کی قبروں کو کریدیں گے تو آپ کی یاد یقیناً ستائے گی۔ پھر ہم یہ کہنے لگیں گے۔

زخم بھرتے تھے' مگر اب کے ہے کچھ بات ہی اور
خنجر اتنا رگ احساس میں گہرا اترا !!

آج خاموشی گفتگو اور بے زبانی میری زبان ہے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن شاید کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔

حالات کی دہلیز پر بیٹھے آج شدت سے یہ احساس دامن گیر ہے کہ تلخیاں [illegible]۔ گو ہم ایک عظیم مقصد کے لیے علم و ہنر کے اس مسکن کو چھوڑ

رہے ہیں مگر مضطرب ہونٹ بے اختیار گنگنا رہے ہیں کہ گردش ایام نے ہمیں اوج ثریا سے اٹھا کر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نیچے کی جانب پھینک دیا ہے اور ہم حروف "درد" کی صورت ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

یہ مرحلہ بھی کتنا اذیت ناک ہے کہ ہم آتش بے دود میں سلگ رہے ہیں۔ مسکراہٹ بھی نوحہ خوانی کا روپ دھارے ہوئی ہے۔ آنکھوں کے جھروکے بظاہر خشک ہیں مگر ان کی گہرائی اور گیرائی میں ایک طوفان خاموش پابند ساحل ہے۔

کاش! نظام کائنات ساکت ہو جائے اور سیارگان فلک کروٹیں نہ بدل سکیں تاکہ عرصہ ہائے دراز کی رفاقت کے بعد جدائی کے یہ کربناک لمحات ماتا کی گود میں ابدی نیند سو جائیں۔

لذت دیدار کی اے ساعت رخشاں! ٹھہر
پڑھ رہا ہوں میں تیرے چہرے پہ کچھ لکھا ہوا

اس دوراہے پر آج ارم کے باسیوں کے لیے صحرا نوردی ناگزیر ہے۔ دل کی دھڑکنیں کہہ رہی ہیں کہ آپ کے خلوص و وفا کی یادیں ہمیں ماحول کی زیبائی اور شہروں کی رعنائی میں بھی اس طرح مضطرب رکھیں گی جس طرح پھول کی آغوش میں نکہت بے قرار رہا کرتی ہے۔

جدا نہ درد جدائی ہو گر میرے اعضاء
حروف "درد" کی صورت ہوں اے طبیب جدا

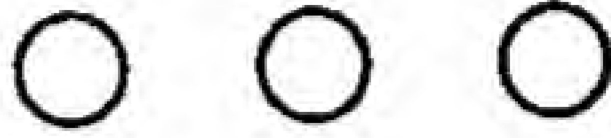
بھلا ہم آپ کو کس طرح فراموش کرسکتے ہیں۔ آپ کے معصوم اور پاکیزہ جذبات تو ہماری متاع زیست ہیں۔ ہم جب کبھی عمر رفتہ کو صدا دیں گے تو مشفق و مہربان اساتذہ کے مقدس دست شفقت' حلقہ احباب کا اخلاص و مروت اور برادران مکتب کی اپنائیت کی یاد ستائے گی تو ہم بیساختہ پکار اٹھیں گے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

الوداعی تقریب میں اہتمام ضیافت آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ہماری کامیابی کا دار و مدار اساتذہ کرام کی دعاؤں اور نیک تمناؤں پر ہے۔ ہم احباب کی طرف

سے بالخصوص، محسن و مکرم اساتذہ اور بالعموم اپنے طالب علم بھائیوں کا شکریہ ادا کیا چاہتا ہوں اور اساتذہ کے حضور میں ہدیہ عقیدت پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

کرب کا دریا سمیٹا چند لفظوں میں جمیل
شہر غم کا سب خلاصہ کاغذوں پر آ گیا



انتخابی معرکہ!
(تصویر کا ایک رخ)

انتخاب کا مقررہ دن قریب ٹھہرا۔ ادھر دیکھو' دیواروں پر رنگین اشتہار چسپاں اور ادھر دیکھو تو دلکش و دیدہ زیب بینر آویزاں ہیں۔ ہر امیدوار خود کو غریبوں کی عزت کا ساتھی' مزدور کا حامی' اسلام کا خادم' تحریک پاکستان کا سپاہی' عوام دوست اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ ان میں بہ تعداد کثیر ایسے لوگ ہیں جو علاقے کے عوام کی خوشی اور غمی میں آج تک شریک نہیں ہوئے اور کچھ ایسے افراد شامل ہیں جو بہر حال کسی نہ کسی طرح اقتدار میں شامل رہے۔ ان کی نمائندگی ایوبی آمریت کے سائے میں پروان چڑھی اور کبھی نواب کالا باغ کی مونچھوں کا تاؤ ان کے کام آگیا۔ با ایں ہمہ ریکارڈ گواہ ہے انہوں نے ایوان اقتدار میں اپنے علاقے کے غریب لوگوں' ذرائع آمد و رفت اور اور فروغ تعلیم کے لیے آج تک ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا مگر انتخاب کا اعلان ہوتے ہی سیاست پیشہ وڈیرے' لٹیرے' جاگیردار اور سرمایہ دار فصلی بٹیروں کی مانند میدان سیاست میں نمودار ہونے لگے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ یہ وہ مینڈک ہیں جو صرف بارش کے دنوں میں ٹرٹراتے ہیں۔

آجکل الیکشن کیمپوں میں چائے کے دور چل رہے ہیں تو کہیں لوگوں کی ضیافت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ لیکن ایک وہ وقت تھا جب امیروں کے کتے ایرانی پلنگوں اور زر بفت کی رضائیوں میں سوتے مگر بیچارے غریبوں کے جسم پر چیتھڑے بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کسانوں اور مزارعوں کے بیٹے ایک طرف بھوکے مر رہے ہوتے مگر ان کے خوش نصیب کتے' گوشت کی یخنی اور مکھن اڑا رہے ہوتے تھے۔ اس وقت تو کوئی انہیں پوچھتا نہ تھا۔ ذرا اور آگے چلئے میں نے دیکھا ہے کہ جب کبھی کوئی ان کے ڈیروں یا اونچی حویلیوں میں کسی کام کی غرض سے حاضر ہوتا

تو یہ ہمدردی کا ایک بول بولنے کے بجائے اپنے لاڈلے کتوں کو "ولسن! ولسن!" کہہ کر پکارنے لگتے تھے۔

میسر گوشت کی یخنی ہے کتوں کو امیروں کے
دوا کے واسطے مزدور کا بچہ سسکتا ہے

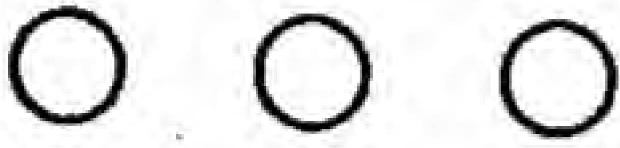
بہر حال ہم نے کسی ایک کو حق رائے دہی کی اکثریت سے کامیاب بنانا ہے۔ ووٹ قوم کی ایک مقدس امانت ہے اور ضمیر کی آواز۔ اس لیے اس کا استعمال ہمیں سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ آج یہ لوگ ہماری اور آپ کی قسمت سے کھیلنے کے لیے ہمارے اور تمہارے مستقبل کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے ہر امیر اور غریب کے دروازے پر ووٹوں کی خیرات مانگنے کے لیے سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھو، سمجھو، تو لو اور اچھی طرح پرکھو! کہ یہ لوگ وہ تو نہیں ہیں جن کی دہلیز میں سنگ مرمر کی سلوں کے بجائے محنت کش کسانوں کی ریڑھ کی ہڈی جڑی ہوئی ہے۔ یقیناً" یہی وہ لوگ ہیں۔

مبنی فساد خلق پہ جن کا سکون ہے!
جن کی ہر اشرفی میں غریبوں کا خون ہے

یہ ہاتھ جو ہمارے سامنے ووٹوں کے لیے دراز ہو رہے ہیں انہیں غور سے دیکھ لینا کہ کہیں یہ ہاتھ وہ ہاتھ تو نہیں جو غریبوں کے خون میں رنگے ہیں۔ کہیں یہ ہاتھ وہ ہاتھ تو نہیں جو مزارعہ بیٹی کی چوڑیاں توڑنے کے لیے حرکت میں آئے۔ کہیں یہ ہاتھ وہ ہاتھ تو نہیں جنہوں نے بوڑھے کسان کو گریباں سے کھینچا۔ کہیں یہ ہاتھ وہ ہاتھ تو نہیں جو مظلوم کے استحصال اور ظالم کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ کہیں یہ ہاتھ وہ ہاتھ تو نہیں جنہوں نے انصاف کے گلے پر چھری چلائی اور کہیں یہ ہاتھ وہ ہاتھ تو نہیں جو یتیم کا مال کھانے، مزدور کی مزدوری دبانے اور تھانوں میں رشوت و دلالی کے لیے استعمال ہوئے۔

ایک بے حسی ہے، لوگ ہیں، خوف و ہراس ہے
جاوید وہ میرے دور کا انسان مر گیا

آؤ ہم یہ عہد کریں کہ مٹی کے مادھوؤں' ڈکٹیٹروں اور اور وطن دشمن عناصر کے خلاف ہر وقت ہر جگہ اور ہر طرح جہاد جاری رکھیں گے۔ ظالموں کے حق میں حق رائے دہی استعمال کرکے ان کے ہاتھ مضبوط نہیں کریں گے۔ آؤ ثابت کر دکھائیں کہ ہم باشعور' دیانتدار اور شریف لوگ! باشعور' دیانتدار اور شریف قیادت چاہتے ہیں۔



انتخابی معرکہ!
(تصویر کا دوسرا رخ)

اگر ہم حقیقت کی نگاہ سے دیکھیں تو یہ حقیقت سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی کہ تمام لوگ ایک ہی فطرت کے نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں بالکل اسی طرح ہر انسان کا طرز فکر اور زاویہء نگاہ الگ الگ ہوتا ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ کوئی سیاستدان نہ اس قدر برا ہوتا ہے جتنا کہ اس کے مخالف بتاتے ہیں اور نہ ہی اس قدر اچھا ہوتا ہے جتنا کہ اس کے حامی ظاہر کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ہمارا ووٹ صرف اس کے حق میں استعمال ہو سکتا ہے جس نے خود کو بطور ایک امیدوار کے پیش کیا ہے۔ اس لیے ہمیں صرف امیدواروں کا تقابلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنا قیمتی ووٹ صرف اس کے حق میں استعمال کرنا چاہیے جو ان میں سے اچھے کردار' اچھی سوچ اور بے داغ ماضی کا مالک ہو۔

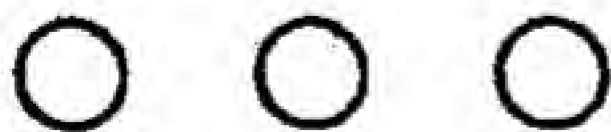
میں جس شخص کے حق میں آپ کی رائے ہموار کرنے کا خواہش مند ہوں اس کے متعلق اللہ تعالٰی کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے کسی مزدور کی مزدوری دبانا تو کجا اس نے فرمان رسولؐ کے مطابق ہمیشہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے حق خدمت ادا کیا۔ مزارعوں کی ٹانگیں نہیں توڑیں۔ کبھی تھانوں میں رشوت دلالی نہیں کی اور نہ ہی کبھی کسی غریب و مسکین کی عزت سے کھیلنے کی جرات کی۔ میں دعوئی سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے اس امیدوار نے ہمیشہ حق بات کہی اور ہر دور میں ظالم سے اظہار نفرت اور مظلوم کی ہر ممکنہ مدد کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر موقع پر رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نظریہ پاکستان کو دل و جان سے عزیز جانا اور ہمیشہ رزق حلال کمایا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے۔

دفعتاً جسم سے سانسوں کا الجھنا
حلق میں میرے کوئی لقمہ حرام آیا ہے

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا امیدوار کسی ذاتی مفاد یا سیاسی اثر و رسوخ کی خاطر میدان سیاست میں نہیں آیا بلکہ عوام اور وطن کی خدمت کے جذبے نے انہیں مفاد پرست گروہ کے بالمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ اگر کسی موقع پر اس امیدوار، جس کے لیے ہم سب خلوص نیت سے کام کریں گے، نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی یا ہماری توقعات پر پورا نہ اترا تو آئندہ ان کی مخالف کرنے والا سب سے پہلا جو شخص ہوگا وہ یقیناً "میں" ہوں گا۔

ہمارے پاؤں ہی جمنے نہ پائے دھرتی پر
وگرنہ رخ تو بدل دیتے ہم ہواؤں کا

بزرگو، دوستو اور بھائیو! ہم سب کے اس متفقہ امیدوار کی کامیابی آپ کی کامیابی ہوگی۔ رات ہو یا دن! امیر ہو یا غریب! ان کا دروازہ کسی پر اور کسی وقت بھی بند نہیں ہوگا۔ اور یہ کہ ان کی کامیابی بہتر مستقبل، سازگار فضا اور فلاح و بہبود کی ضامن ہوگی۔ اگر آپ باضمیر، خوددار، نیک نفس اور ایک شریف شہری کی قیادت چاہتے ہیں تو آؤ ہم اپنے امیدوار کی دامے، درمے، قدمے اور سخنے مدد کریں۔ بزرگ دعا دیں اور نوجوان بھائی میدان عمل میں کام کر کے دکھائیں۔



پاکستان اور ہندوستان کی دو جنگیں

شور اٹھا قتل گاہ میں ' مائل کا سر ہے یہ
کاٹا تو جاسکا ہے' جھکایا نہ جاسکا!

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کا واقعہ ہے کہ پاک فوج کا ایک سپاہی چونڈہ کے محاذ پر کئی روز تک داد شجاعت دیتا رہا۔ پھر کمانڈر کی ہدایت پر ایک مشن کی خاطر دشمن کے علاقے میں جا گھسا' جہاں گھمسان کا رن پڑا۔ اس دوران پاکستان کا یہ مجاہد گولیاں لگ جانے سے شدید زخمی ہو کر گر پڑا' اب وہ بھارتی فوج کا ایک قیدی تھا۔ جنہوں نے اس دلیر جانباز کو ایک ٹرک میں لاد کر ہسپتال پہنچا دیا۔ ہوش میں آنے پر پاک وطن کے اس محافظ نے دیکھا کہ ڈاکٹر اسے خون کی بوتل لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جوش غیرت میں اس غازی مرد نے اپنا بازو جھٹکتے ہوئے کہا "نہیں ' نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں مسلمان ہوں اور میری رگوں میں غیرت مند مسلمان باپ کا خون دوڑ رہا ہے' اس لیے میں کسی ہندو یا سکھ کے دیئے ہوئے خون کے ملنے پر زندہ رہنا برداشت نہیں کر سکتا"

ڈاکٹر نے جاں بلب سپاہی کی جرأت کا یہ عالم دیکھا تو گھبرا گیا اور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا "پاکستان ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہے' حملہ آور اپنا سر پھوڑ کر رہ جائیں گے" سترہ روزہ اس جنگ کا نتیجہ پوری دنیا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نتیجہ اس قدر غیر متوقع مگر واضح تھا کہ غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مگر افسوس کہ بد قسمتی سے یہ بھرم زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں غداری' عیاری اور مکاری کے باعث ہماری وہ پٹائی ہوئی کہ اللہ پناہ! دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کی تصویر کا حلیہ بگڑ گیا۔

یہ ہاتھ تمہارے سامنے ہے اس لیے دراز
پھولی کہاں کہاں سے ہے تقدیر دیکھنا

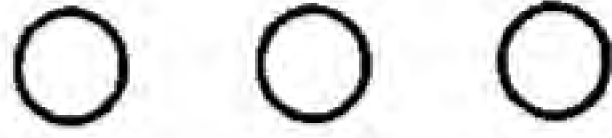
بھلا آپ کو معلوم ہے ایسا کیوں ہوا؟ اگر نہیں معلوم تو بصارت و سماعت کا ماتم کیجئے اور اگر اس کا سبب علم میں ہے تو اپنی غفلت' بے عملی' تن آسانی اور لا پرواہی پر سینہ کوبی کریں! آؤ اس غیر متعصب اور حقیقت پسند غیر مسلم کا زاویہ نگاہ دیکھتے ہیں۔ اس تلخ و نازک موقع پر ہندو سماج میں پروردہ ٹھاکر شیام سنگھ بھی پکار اٹھتا ہے "کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ دنیا کی یہ فاتح قوم خدا کو چھوڑ کر پستی کی عمیق کھائیوں میں جا رہی ہے۔ قرآن جیسی حکمتوں والی کتاب اس قوم کی اصلاح کے لیے ہر وقت موجود ہے مگر افسوس' یہ قوم کسی رہبر کی متلاشی ہے۔ میں ایک ہندو تم سے سوال کرتا ہوں کہ آج تم میں قومیت کے جھگڑے کیوں سر اٹھا رہے ہیں؟ اور ایسا کیوں ہے؟ کہ مسلمان ہو کر بھی تم شیعہ' سنی اور دیو بندی ہو؟ اس سوال کا جواب تمہارے پاس کچھ نہیں۔ اس کا جواب تمہاری آنکھوں کو اشکوں سے اور روح و قلب کو سوز و گداز سے بھر دے گا"

زندگی روتی ہے زندگی کی لاش پر
زندگی کو زندگی کی حسرتیں دفنا گئیں

واقعی ہمارے زوال و شکست کی یہی وجہ ہے جب ہم نے قرآن کو سینے سے لگایا تھا تو نصرت نے ہر جگہ ہمارے قدم چومے اور ہسپتال میں بھی دم توڑتے وقت جیالے فرزند نے ایمان و جرات اور شجاعت کی ایک ناقابل فراموش مثال قائم کی تھی۔ مگر اس کے برعکس "جب بنگالی نہیں بنگال چاہیے" کا غلغلہ بلند ہوا۔ ہماری بہنوں کی عصمت ہمارے ہی ہاتھوں برباد ہونے لگی اور جب ان کی فلک شگاف چیخیں ہمارے نام نہاد محافظوں کی توپوں کے گولوں کی گھن گرج میں دب کر رہ گئیں تو ہماری وہ درگت بنی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے اور رہتی دنیا تک ہمارا سر' احساس شرمندگی سے جھکا رہے گا۔

داستان وہ میرے زخموں کی سنے گا کس طرح
جس کی سوچوں کو فنا میں نے شعور دلبری!

قرآن حکیم ہمارے ہر درد کی دوا' ہر مشکل کا حل اور ہر نکتے کی جامع تفسیر ہے۔ اس لیے ہمیں اس دنیا میں اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے احکامات خداوندی کو حرز جان بنانا پڑے گا۔ آؤ آج سے سب مل کر اس بات کا عہد کریں کہ اپنے فکر و عمل کو کلام مجید کے تابع رکھیں گے تاکہ دوبارہ ہمدوش ثریا ہو سکیں!



جدید طرز سیاست و جمہوریت

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

مفکرین نے سیاست کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ مگر اس اختلاف رائے کے باوجود دانشوران کی آراء ایک ہی محور کے گرد گھومتی ہیں۔ سیاست کی جامع تعریف ' موقع شناسی' باریک بینی' غور و تدبر اور سوچ و بچار سے مربوط ہے۔ اسی لیے اقبال مرحوم نے سیاست کو دیں کا جزو اعظم قرار دیا اور جو دین سیاست سے متصف نہ ہو اسے جور و ستم اور چنگیزی جارحیت کا نام دیا ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مشہور امریکی مفکر' ہنری کسنجر کے بقول "سیاست کے سینے میں دل ہوتا ہے اور نہ ہی سیاست کا کوئی اخلاق ہوتا ہے" کیونکہ اکثر سیاستدان اجتماعی مفادات کو انفرادی منفعت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ جدید سیاست کا تقاضا ہے کہ اخلاقی ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر کامیابی کے زیادہ سے زیادہ امکان پیدا کیے جائیں مگر میرے نزدیک سیاست بذات خود جنس شرافت ہے اور نہ ہی شیطانی وراثت! پست کردار ارباب سیاست کے ہتھے چڑھ کر اخلاقی قدریں سیاست کے دہکتے ہوئے بھرا میں جھلس جاتی ہیں تو بلند کردار افراد کی وساطت سے طائر سیاست کا نشیمن قرب کہکشاں میں تعمیر ہوتا ہے جس سے خلائق کو سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ دین فطرت سیاست کو اخلاقی ضابطوں کا پابند رکھنا چاہتا ہے۔ عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے مثالی ادوار کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں جا بجا سیاست کے ایسے قواعد و ضوابط نظر آتے ہیں جن کے حلقہ اثر میں غاصب اور ظالم کو قابل گردن زنی ٹھہرا کر کیفر کردار تک پہنچایا جاتا تھا اور مجبور و مقہور' لاچار و نادار اور بے بس و بے کس افراد کے رستے ہوئے زخم ہائے قلب و جگر پر نشاط و انبساط کے مرہم لگا دیئے جاتے تھے۔ اب وہ سیاست کی سیاست کی شرافت کی "مہمان

ابلیس"

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

جدید سیاست کا اس قدیم سیاست سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ حاکم و ظالم کی داشتہ اور وہ محکوم و مظلوم کی محبوبہ تھی۔ اس کی چنگاریاں انسانیت سوز اور اس کی گلکاریاں انسانیت نواز تھیں۔ اس سیاست کا مرکز مسجد نبویؐ تھا' جہاں خاک فرش پر بیٹھ کر دنیا کی تقدیریں بدلنے کے مشورے ہوتے اور اب چیخ و پکار سے بے نیاز' حیلہ روباہی کے ساتھ' ایوان مرمریں میں نبتے اور سادہ لوح عوام کو ورغلانے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں "سیاست" کے عنوان سے مصور پاکستان نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اس کھیل میں تعیین مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو "فرزیں" میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

جدید سیاست کے زمرہ میں جمہوریت کا نام بھی بڑی شد و مد سے لیا جاتا ہے جس کے متعلق شاعر مشرق نے کہا تھا۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

سیاست خط ملوکیت پر گامزن ہو یا طرز جمہوریت پر مبنی' اس میں آمریت جھلکتی ہے۔ سیاست ملوکیت پر گامزن ہو تو بساط اقتدار کے مہروں کے ظہور و غروب میں عوام کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا اور طرز جمہوریت کے لبادے میں انتقال اقتدار کی مشکلات کے علاوہ روز و شب لوٹ کھسوٹ کا بازار بھی گرم رہتا ہے۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

ایک دفعہ جسٹس کیانی نے سیاسی چال بازیوں اور فریب کاریوں کا ذو معنی الفاظ میں تذکرہ کیا "کہ سیاست دان لوگوں کو پہلے سبز باغ دکھایا کرتے تھے اور اب کالے باغ دکھائے جاتے ہیں" سیاست کی موجودہ ثمر کاریوں اور شعلہ باریوں کو دیکھ کر ایک سوال کے جواب میں مرحوم کیانی نے پر معنی تبصرے کرتے ہوئے فرمایا "کہ سیاست پشاور کے کچلوں کی طرح بدمزہ ہو چکی ہے" چشم فلک سو بار دیکھ چکی ہے کہ خار زار سیاست میں پائے نازک لہو سے تر بتر اور سینکڑوں نازک ابدان آتشیں گولیوں سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ سیاست کے لپکتے ہوئے شعلوں سے مفلوک الحال لوگوں کی کئی جھونپڑیاں جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکی ہیں۔

ارباب سیاست کے پیچ و خم نے ماؤں کے لخت جگر چھین لیے اور کئی معصوم بچے یتیم کر دیئے ہیں۔ سینکڑوں ستم رسیدہ باپ کارزار سیاست میں اپنے گم شدہ بیٹوں کا ماتم کر رہے ہیں اور روح کشتہ بھی اپنی بدقسمت بہنوں کی جگر گدازی 'سینہ کاوی' دلخراشی اور جانکنی پر مرثیہ خواں ہے۔ سیاستدانوں کے ہوس ہائے جاہ طلبی کے آبگولوں سے کئی گھرانوں کے چشم و چراغ بجھ گئے اور سینکڑوں حسیناؤں کے سہاگ اجڑ گئے ہیں۔ سیاست کا تذکرہ الحفیظ الحفیظ —— سیاستدانوں کا فلسفہ —— الاماں —— الاماں!

عزیزان وطن! کیا ہم ماضی قریب کے اس سانحہ کو بھول سکتے ہیں؟ جب پیران سیاست نے نوجوانان ملت کے لہو کو سکوں کے عوض بیچ دیا" اور پیشوایان "قومی اتحاد" خود بھی ٹکے ٹکے میں بکنا شروع ہو گئے۔ سیاستدانوں کے اشاروں پر ذبح ہونے والے شہدا کے لہو کی بوندیں ہم سے یہ فریاد کر رہی ہیں کہ اے وطن عزیز کے باسیو! اپنی متاع زیست کو نذر سیاست نہ کرو اور نہ ہی سیاستدانوں کی متابعت کرنا! کیونکہ زمانہ حاضر کے سیاستدان دین و ملت' عہد و پیماں' اپنے ایمان' آئین قرآن اور ضمیر کو بیچنے سے بھی دریغ نہیں کیا کرتے۔



میں روحوں کو محتاج کفن دیکھ رہا ہوں

تیرگی ہی تیرگی ہے حد نظر تک تیرگی
کاش میں خود ہی بھڑک اٹھوں اندھیری رات میں

اسلامی طرز معاشرت کو چھوڑ کر ہم پوری طرح مغربی تہذیب کی گود میں مست مئے ناپائیدار ہیں۔ تقلید مغرب میں ستر پوشی ترک کر کے ہم نے نیم عریاں پیرہن زیب تن کر رکھا ہے اور دیگر زبانوں کے شوق و جستجو میں قومی زبان کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ نمود و نمائش' بناؤ سنگھار' غیر ضروری اختلاط اور فحش لٹریچر نے مردوں کو بے فکر و معصیت پیشہ اور خواتین کو اپنی آرائش و زیبائش کی نمائش کا رسیا بنا دیا ہے۔ اسلامی روایات کو مسل کر تاجر جلب زر کی خاطر عریاں تصاویر کا سہارا لیتے ہیں۔ قرآن و احادیث اور فقہ و تاریخ کے مطالعے سے چشم پوشی کر کے متعدد غیر مقصدی رسائل کی ورق گردانی میں ہم وقت کا زیاں کر رہے ہیں۔

ادھر ویران مسجدیں اور بے چراغ درس گاہیں قحط الرجال کا ماتم کر رہی ہیں اور ادھر رقص گاہوں میں جشن نشاط سے چراغاں ہو رہا ہے۔ وہ جنس لطیف جو گھر کی زینت ہوا کرتی تھی' آج سینماؤں کے آنگن میں قطار اندر قطار جلوہ فروشی کی دعوت دے رہی ہے' بقول اکبر الہ آبادی!

کیا گزری جو کل پردے کے عدو رو رو کر پولیس سے کہتے تھے
عورت بھی گئی' عزت بھی گئی' راحت بھی گئی' زیور بھی گیا

واحد نظریاتی مملکت میں جدید ثقافت کے بعض نام نہاد اداروں میں رقص کی تربیت دی جاتی ہے۔ کبھی کبھار چنگ و رباب اور مسلم دوشیزہ کے رقص و سرود کے کرشموں سے غیر ملکی مہمانوں کو سامان تفریح بھی مہیا کیا جاتا ہے اور نشر و اشاعت کے قومی ذرائع بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ساز و آواز کا اہتمام کرتے ہیں۔

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو ہے بے خبر، سمجھا اسے شاخ نبات

مخلوط تعلیم بھی ایک ایسا جرم عظیم ہے کہ جس کی سزا نسل در نسل ملتی رہے گی مگر بعض ناخواندہ حامیان اختلاط نے یہ جواز تراش رکھا ہے کہ میکدے میں رہ کر آدمی حدیث بادہ و مینا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ دختر انگور کی عدم موجودگی میں لذت کیف و سرور اس قدر مضطرب نہیں کیا کرتی مگر خم و ساغر کو سامنے پاتے ہی دل میں میکشی کی خواہش بھڑک اٹھتی ہے۔ مزید بر آں یہ کہ شراب سامنے ہو تو زاہد کی پارسائی بھی ڈگمگانے لگتی ہے۔ بقول شاعر!

سو بار توبہ کرچکا تھا مگر کیا کروں جلیل
کالی گھٹا کو دیکھ کر نیت بدل گئی!

اس سے تو کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا کہ اس کائنات ارضی میں ہر چیز کا بدل موجود ہے مگر عورت کی عصمت ہی ایک ایسی چیز ہے جو ایک دفعہ کملا جائے تو اس کا بدل کائنات کی کوئی چیز بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ!

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

انسان کی سفلی خواہشات احتیاط طلب ہیں۔ اگر جنسی جذبے کی یہ قوی ترین جبلت، ضبط میں نہ رہے تو طبقہ اناث کی حرمت، فرد کی شخصیت، معاشرے کی زیب و زینت اور قوم و وطن کی عزت و شہرت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

رشوت ستانی، دھوکا دہی، ذخیرہ اندوزی اور جا بجا لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ انفرادی مفاد کو اجتماعی منفعت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام کی چکی میں بیچارے مزارعہ مدتوں سے پس رہے ہیں۔ ہوس زر کا یہ عالم ہے کہ غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ کسی کو تن ڈھانپنے کے لیے روح کو بھی ننگا کرنا پڑتا ہے۔

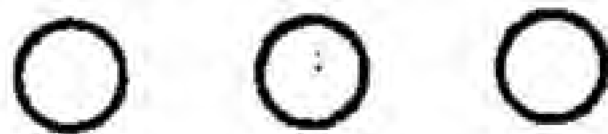
ستم بالائے ستم ہم نے افعال قبیحہ کے نام بھی بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ حیلہ

روباہی کو سیاست، رشوت کو صلہ خدمت، مکر و فریب کو کاروباری مصلحت، بے حیائی کو جدید طرز معاشرت اور اخلاقی بے راہ روی کو ثقافت کا نام دے رکھا ہے۔ دین مصطفویؐ کو چھوڑ کر تہذیب مغرب میں سرمایہ مسرت ڈھونڈنے والو، یاد رکھنا!

تیری عصمت ہو کہ ہو میرے ہنر کی چاندنی!
وقت کے بازار میں ہر چیز کے لگتے ہیں دام

شاہی مسجد کے پر شکوہ میناروں کے سائے تلے مدتوں سے بازار حسن میں جنس نسواں کی نمائش ہو رہی ہے۔ جہاں روز و شب اورنگزیب کی جاں بلب بیٹی کی حرمت کا کفن تار تار کیا جاتا ہے۔ مسجد میں باقاعدگی سے اذان گونجتی ہے تو اکثر اوقات پازیب کی چھن چھن بھی سنائی دیتی ہے۔ عصمت دریدہ کی چیخ اور گھنگھرو کی نقرئی گھنٹی خانہء خدا کے کاخ و در سے ٹکرانے کے بعد مجسمہ سوال بن کر اقبال کے حضور میں پیش ہوتی ہے اور مصور پاکستان، مسلم بیٹی کی زخمی روح کو سینے سے لگا لیتے ہیں اور پھر اہل گوش کو اقبال مرحوم کی زہرہ گداز ہچکیاں صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔

نہ چھیڑ اے ہم نشیں زیست کے مایوس نغموں کو
کہ اب بربط کے تاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے



کون کہتا ہے کہ ظلمات نے دم توڑ دیا؟

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آفرینش سے لے کر آج تک غریب ظلم و تعدی کی چکی میں پس رہے ہیں - ان کا کوکب مقدر' افلاس کے گہرے سایوں میں گھرا ہوا ہے- نوشتہء تقدیر میں دکھ کے گھمبیرے سائے' کرب مسلسل کی لپکتی دھوپ' تنگدستی و تنگ دامنی کی برسات' بے چینی و بیقراری کی پھوار' کم مائیگی و کمتری کا اضطرار' ان کا حصہ ہے اور وہ زمانے کی بخشی ہوئی صلیبوں پر مصلوب نظر آتے ہیں-

غریب کو عالم شباب میں بھی زلفیں سنوارنے کا ہوش اور نہ داڑھی ترشوانے کا خیال ہوتا ہے- جوانی کے ولولے نہ دور عیش و خوشی' اور نہ ہی نظم و ضبط ولی اس کا مقدر ٹھہرتا ہے- غرض یہ کہ غریب روتی سسکتی وزدیدہ نگاہوں سے لیلائے جوانی کو خیرباد کہہ دیتا ہے- حسن و جوانی کے چلچلاؤ کے بعد اس کے چہرے پر جھریاں اور ہاتھ میں عصاء پیری نظر آتا ہے- گویا غریب مرنے سے پہلے مرجاتا ہے اور مرجانے کے بعد بھی ہزار بار مرتا ہے وہ اس عام کہاوت کا مصداق ہوتا ہے کہ غریب کی جوانی' جنگل کا پھول اور سردیوں کی چاندنی یوں ہی بیکار جاتی ہیں-

پلٹ کر دیکھ کتاب حیات کے اوراق
کوئی گھڑی بھی میری خوشگوار گزری ہے

ایک طرف بلند و بالا محلات اور دوسری جانب جھونپڑیوں کا عجیب و غریب تضاد دیکھ کر میں حیران و ششدر رہ جاتا ہوں- پھر جب دانتوں میں انگلی دبائے کن انکھیوں سے افکار پریشان کی کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں تو شاعر کی پر سوز صدا مجھ کو جھنجھوڑ دیتی ہے-

بعض نام نہاد غریب دوست بے روزگاری اور غربت و افلاس کے خاتمے کی نوید بھی سنا رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ بھی ان کی گمراہ کن کی ایک چال ہے-

ان گنت محفلیں محروم چراغاں ہیں ابھی
کون کہتا ہے کہ ظلمات نے دم توڑ دیا

کیا میں ثنا خوان تقدیس مشرق سے پوچھ سکتا ہوں؟ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے غریب بہن کی عریانی اور مشاطگی و غازہ کو اپنی دلجمعی و دبستگی کا سامان بنا رکھا ہے کیا سرمایہ داروں اور اسپ امارت کے شہسواروں نے ایک یتیم کو چیخنے اور چلانے پر مجبور نہیں کیا؟ کیا امراء نے ایک باعزت دوشیزہ کو سر عام نہیں نچایا؟ ہاں ہاں' یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے غریب عورت کو گھنگھرو پہننے پر مجبور کیا کہ وہ ہوس کے طبلے کی تھاپ پر مجبوریوں کے رقص کرتی رہے۔ انہوں نے عفت باز نگاہوں کو اپنے شکاری کا انتظار سکھایا اور غم نصیب لوگوں کی چیخوں پر قہقہے لگائے۔ ان کی بینائی پر فلک سینہ کلوبی میں مصروف ہے' سماعت پر زمین ماتم کناں اور ان کے شعور و فہم پر جہان آب و گل نوحہ خواں ہے۔

رنگ برنگی کاروں' زرق برق ملبوسات' خوش نما بنگلوں اور عظیم کوٹھیوں میں مست مئے پندار رہنے والو! کبھی ہو سکے تو محل سے دو قدم باہر نکل کر کچے مکانوں کے باسیوں کو دیکھنا۔ ہو سکتا ہے تمہارے قلوب و اذہان پر لگے ہوئے وزنی قفل یتیموں' بیکسوں اور بے سہاروں کی سسکتی ہوئی آواز اور چیختی ہوئی فریاد سے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ شاید کسی مفلوک الحال کی آہ و زاری تمہاری سوچوں کے دھارے بدل سکے۔ ہو سکتا ہے کسی مقہور و مجبور ماں کے پھیلے ہوئے ہاتھ تمہارے بحر خیالات کی پر سکون موجوں کو اضطراب بخش دیں۔

کیا عجب ہے کہ کسی ضعیف باپ کے عصائے پیری کی ٹھک ٹھک سے تمہارا غنچہ دل وا ہو۔ نوجوان بیٹی کی عفت باز نگاہیں تم کو جیب و گریبان سے بے نیاز کر سکیں اور شاید نمائشی مکانوں کی زینت بننے والی بہن کی زخم زخم آواز تمہاری بے رحم نگاہوں کو خون کے آنسو رلا سکے۔

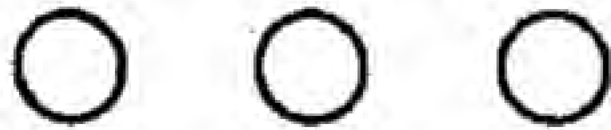
میں نے گرد آلود سردی میں غریب بچوں کو جھوٹے برتن مانجھتے اور کمسن [illegible] کو بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ میلے کچیلے بچے رنگ برنگی کاروں کے پیچھے

دوڑتے ہیں تو ناز و نعم میں پروردہ نوجوان انھیں قہر آلود نظروں سے گھورتے ہیں اور بیگمات حقارت سے تھوک دیتی ہیں لور بھی کیا کیا بتاؤں؟

دیکھا ہے میں نے شہر میں کوڑے کے ڈھیر پر
دو بچے لڑ رہے تھے فقط ایک بیر پر
فصلوں کو کاٹتے ہوئے کچھ ٹوٹی چوڑیاں
کچھ بک گئی ہیں دوستو ! گندم کے سیر پر

غریب کماتے اور امراء کھاتے ہیں۔ اونچے مکانوں میں چراغ بھی ان کے لہو سے ہی جلتے ہیں۔ غریبوں کا لہو کشید کر کے کہیں یہ ہاتھوں پر حنا کی طرح سجا لیتے ہیں تو کسی کے گال کی سرخی بنائی جاتی ہے۔اسی ظلم کے خلاف دعوت جنگ دیتے ہوئے فیض پکارتا ہے۔

جلا کے مشعل اہل جنوں کے ساتھ چلے
جو گھر کو آگ لگا سکے' ہمارے ساتھ چلے
ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک ستم کی یہ سیاہ رات چلے



شادی عشق کی موت ہے؟

شادی اور عشق دو مختلف راگ ہیں' اس لیے یہ ایک ہی ساز پر نہیں گائے جاسکتے۔ جو لوگ شادی کو راہ شوق کی منزل قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ حجلہء عروسی عشق کی موت ہرگز نہیں بلکہ زندگی کا راز ہے' وہ جنت الحمقاء میں رہتے ہیں۔ ان کے سینوں میں ہوس نے چھپ چھپ کر آشیانے بنا رکھے ہیں' وہ جسم پرست اور جنس گزیدہ ہیں۔

شادی تو سماجی بندھن اور ایک معاشرتی رشتہ ہے مگر عشق و محبت میں کوئی شرط نہیں ہوا کرتی۔ شادی کی لے پر ایک ہی نغمہ گایا جاتا ہے مگر برعکس اس کے ساز عشق کی تاروں کو چھیڑیں تو ہر تان دیپک ہے۔ سات سروں کا ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ایک جسم کا کھیل ہے ایک روح کا رقص۔ شادی میں ٹھہراؤ ہے اور عشق ارتقاء چاہتا ہے۔ شادی قرار کی طلب گار جبکہ عشق اضطرار پر جان چھڑکتا ہے۔ شادی حصول اور عشق خود سپردگی کے جذبے کا نام ہے۔ شادی کا تعلق اختیاری لیکن عشق کا معاملہ اضطراری ہے۔

جو تجھ کو دیکھتے تھے مجھے دیکھنے لگے
بس اتنی بات ہے کہ تیرا ہوگیا ہوں میں

شادی پچھلی رات کو دیکھا جانے والا خواب اور عشق روح میں اتری ہوئی شراب ہے۔ یہ گلشن کا انتخاب وہ پریم نگر کا گلاب۔ شادی ایک کیفیت ہے اور عشق کسی انجان کیفیت کا رد عمل۔ شادی نگاہوں کی اشتہاء اور جنسی تحریک ہے مگر عشق اشتہا اور میلان بھی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ اور مختلف ہے۔ شادی کیا ہے؟ شمعیں بجھا اور آنکھوں میں سلا کر جاگنا! عشق کیا ہے؟ خواب میں خواب دیکھتے اور ہوا کے بھیگے دامن پر کسی کا نام لکھتے رہنا۔ شادی سے محض مسہری کی رونق بڑھتی ہے لیکن عشق میں نگاہوں کی اوس سے دل کی کتاب پر حاشیے لکھے

جاتے ہیں۔ شادی خاندانوں کا گورکھ دھندہ ہے جبکہ عشق ناپچھ ذاتاں۔ شادی میں کفو یعنی برابری شرط لازم ہے مگر عشق کی دولت پر کسی کا اجارہ نہیں۔ کیونکہ عشق ایک لازوال و لافانی جذبہ ہے۔ عشق پارے کا اضطراب اور زندگی کا خواب ہے۔ خواب زندگی کی تعبیر اور آیہ عشق کی تفسیر کا ماحصل یہ ٹھہرا کہ عشق ایک جستجو ہے' ایک آرزو ہے' ایک تڑپ ہے' ایک کوشش ہے' ایک دھن ہے۔ محبت میں 'میں میں نہیں ہوتی تو ہی تو ہوتا ہے۔

دل سے آتی ہے بات لب پہ حفیظ
بات دل میں' کہاں سے آتی ہے

سلطنت عشق کے دستور نرالے ہیں۔ اس میں دل کی کتاب اور نگاہ کے نصاب کا بدل لینا کسی طور ممکن نہیں ہوا کرتا "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" اہل وفا کا شیوہ نہیں' یہ تو صرف بھونروں کی ہوس پرستانہ فطرت کا اظہار ہے۔ اس سفر میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ جب عشق سے عشق ہو جاتا ہے۔ ہجر کے موسم وصال کی لذتوں سے بڑھ کر مزا دیتے ہیں۔ تصور' تصویر سے زیادہ دلچسپ لگتا' پیکر محسوس کی نسبت افکار کی رعنائیاں کچھ زیادہ عزیز ہوتیں اور قلب و نگاہ کے سلسلے نہایت ہی محترم ٹھہر جاتے ہیں۔

چلی بھی جائے چمن سے اگر بہار کی رت
تو اس کی زلف پریشاں کے پاس رہتی ہے

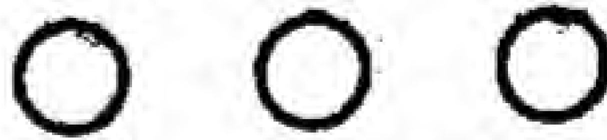
فطری تقاضا ہے کہ انسان اسی شے کے لئے تڑپتا' آہیں بھرتا' چیختا چلاتا اور نقد حیات لٹاتا ہے جو دسترس میں نہ ہو۔ کسی کی یاد میں بیکل رہنا اور فراق کی کسک سہنا ہی حاصل لذت اور متاع زیست ہے۔ ایک چیز کا نایاب ہونا اس کی قدر و قیمت بڑھا دیتا اور بازیاب ہو جانا تمام اہمیت گھٹا دیتا ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ درحقیقت عشق نے ہی ہمیں سمجھایا ہے کہ عورت کا تصور عورت سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے' ورنہ رات کے کھلنے اور بستر کی چادر کی وقعت ہی کیا؟ محبوبہ دیوی کا درجہ رکھتی اور جنت کی حور ہوتی ہے بلکہ اسے کہ قاف کی

پری سمجھتے ہیں مگر بیوی ایک عورت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔

اب نہیں تجھ میں وہ حوروں کی سی عفت باقی
حور تھی تجھ میں، گئی، رہ گئی عورت باقی

کہتے ہیں کہ ہر شخص کو جبلتاً اولاد اپنی خوبصورت لگتی ہے مگر بیوی دوسرے کی۔ میں اس باب میں برملا واضح کردینا چاہتا ہوں کہ عشق میں محبوب سے بڑھ کر کوئی اور خوبرو دکھائی نہیں دیتا۔ اہل دل دنیا کے تمام حسینوں کو اپنے مطلوب کے پاؤں کی دھول سمجھتے ہیں۔ شادی میں تاکا جھانکی اور رازداریوں کے سلسلے دوسری جگہوں بھی چل سکتے بلکہ چلتے رہتے ہیں، مگر عشق سچا ہو تو چاہتوں اور ولولوں کے تمام جذبے ہمیشہ کے لئے محبوب کی خاک قدم پر نچھاور ہو جاتے ہیں۔ رانجھے کی بانسری، قیس کی دیوانگی، مہینوال کی دلبری، پنوں کی جامہ دری، وامق کی دریدہ دامنی اور فرہاد کی کوہکنی عشق کا ہی تو معجزہ ہیں۔ عشق کی کرامات اور ان لطیف دلائل کی بنیاد پر ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ شادی نہ صرف عشق کی موت ہے بلکہ توہین عشق ہے۔ شادی کو فنا ہے عشق کو بقا اور یہ کہ عشق ہر اعتبار سے شادی سے کہیں زیادہ قابلِ قدر، پوتر اور عظیم ہے۔

نگاہِ لطف سے ہوتے ہیں دل کے چاک رفو
نوکِ نشتر سے بھی کچھ زخم سیئے جاتے ہیں



زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی ہے

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانہ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

یہ تو ایک زندہ حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی سے زندگی کا مفہوم نکالنا چاہتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زندگی بہت قیمتی چیز ہے اور یہ کہ زندگی کو گزارنے کا طریقہ زندگی سے کہیں زیادہ اہم اور قیمتی ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ زندگی ہے کیا؟ بہار کے پہلو میں رقص کا نام زندگی ہے؟ نہیں زندگی تو غم کا چہرہ اور فراق کا ٹانکا ہے۔ کیا زندگی خوشیوں کا ناچتا ہوا پانی ہے؟ نہیں زندگی تو آگ کا لپکتا ہوا شعلہ ہے۔ کیا زندگی چشم غزالہ کے رتجگوں کا نام ہے؟ نہیں' زندگی تو سیاہ رات کا ایک پرچم ہے جس کے سائے میں سوچ کے دھاگے اور آواز کی کچی کلیاں ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں۔ کیا زندگی مسرت و انبساط کا کوئی اچھلتا ہوا گیت ہے؟ نہیں' زندگی تو درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی ہے۔

وقت آفاق کے جنگلوں کا جواں چیتا ہے
میری دنیا کے غزالوں کا لہو پیتا ہے

میں زندگی کو درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی اس لیے کہتا ہوں کہ قہقہوں کی گونج میں سسکیاں ٹپک پڑتی اور ہر خوشی کے تعاقب میں آنسو چلے آتے ہیں۔ ایک ایک موڑ پر غم کا صیاد گھات میں بیٹھا ہے۔ لمحہ لمحہ طوفان اٹھتے اور گھر جلتے ہیں۔ تقدیر' تدبیر پر مسکراتی اور انسان کی بے بسی و بے کسی کا مذاق اڑاتی ہے۔ فرشتہ اجل دیکھتے ہی دیکھتے شیر خوار بچوں کو موت کی نیند سلاتا' ماں کی آنکھیں بے نور بناتا' دوست کو دوستوں سے جدا کرتا' بہن بھائیوں کے درمیان فرقت کی دیواریں اٹھاتا' بھائیوں کی کمر توڑتا اور چیخ چلاتی بہنوں کو کرب مسلسل کے پتھر مارتا ہے۔ مجبور انسان' جن کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے ان کو اپنے ہی ہاتھوں نہلا' کفن پہنا اور

تنگ و تاریک قبر میں دفنا آتے ہیں۔ تاثیر دعاؤں سے اس طرح منہ موڑ لیتی ہے کہ آنکھوں سے سرمایہ اشک تو ختم ہو جاتا ہے لیکن غم کی کسک اور درد کا اثر نہیں مٹ سکتا۔ راہ حیات میں ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ موت ارزاں مگر زندگی گراں ہو جاتی ہے یعنی جینا چاہیں تو جی نہیں سکتے اور اگر مرنا ہو تو مر بھی نہیں سکتے۔ آپ ہی بتا دیں کہ میں زندگی کو درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ کہوں تو کیا کہوں؟

کس طرف جاؤں اماں کس جگہ پاؤں میں کلیم
ہر گلی کوچہ نظر آتا ہے مقتل کی طرح!!

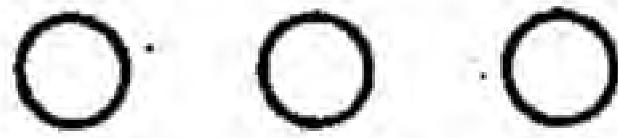
زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو دشت کربلا خون اہل بیت سے لالہ زار نہ بنتا۔ زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو محمد بن قاسم قید خانے میں موت سے دوچار کیونکر ہوتا۔ زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو بغداد کی تباہی کا منظر اتنا بھیانک اور دلدوز نہ ٹھہرتا۔ زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو شیر میسور کے مقبرے پر "شمشیر اسلام گم شد" کا کتبہ آویزاں نہ کیا جاتا۔ زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو بہادر شاہ ظفر زندگی کے آخری ایام رنگون کی جیل میں نہ گزارتا۔ زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو قائداعظم کے کفن پر نقشہ بنگال کا داغ نہ ابھرتا اور اگر زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی نہ ہوتی تو ماضی قریب کے ایک ہردلعزیز و ذہین لیڈر کو کنج اسارت میں تڑپا تڑپا اور ترسا ترسا کر نہ مارا جاتا۔

جس قدر راکھ کریدوں پس ہجراں اپنی
اور بچھڑے ہوئے لوگوں کی محبت جاگے

میں ابھی تک عرصہ حیات کا ایک لمحہ بھی اپنی پسند کے مطابق نہیں گزار سکا۔ صبح و شام احساس کی صلیب پر لٹکا رہتا ہوں اور یہ وہم ہلکان کئے پھرتا ہے کہ جانے آنے والی گھڑی میں کیا ہو گا؟ کیا خبر کہ کیا کھو کر ہم لوٹیں؟ اک کھٹکا لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت کون سی صورت آنکھوں سے پنہاں ہو جائے۔ زندگی ہر

لٹنے شوخ راتوں کی مسرت کا لہو پیتی اور ہنگامہ خیز دنوں کی ایک ایک آرزو کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ زندگی کیا ہے؟ روح کا جلتے رہنا' حسرتوں کا لو دینا اور کندھوں پر اپنی ناکام تمناؤں کا لاشہ اٹھائے پھرنا۔ زندگی' شکست آرزو' خاک میں اٹا ہوا موتی اور اک کٹی ہوئی پتنگ ہے۔ زندگی کیا ہے؟ کسی یتیم کا آنسو اور بیوہ کی چادر ہے۔ ہاں ہاں آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ پروردۂ ابہام ہے۔ تاش کا ترپ ہے' قمار خانے کا راویتی داؤ ہے' طوائف کا مقدر ہے' پھول کی قسمت ہے اور موت کی وادیوں میں اک آواز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی ہے۔

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی



وقت بے وفا ہے

جن کی وفا پر ہم کو بڑا اعتبار تھا
موسم کی طرح ان کے اشارے بدل گئے

جن لوگوں نے حالات کے ماتھے پر نمودار ہونے والی شکنوں کا مطالعہ کیا ہے' ان کے نزدیک وقت کی جفا اک امر مسلمہ ہے۔ تسلیم بھی کیوں نہ کریں ' اپنی آنکھوں سے بستے گھروں کو اجڑتے' کہکشاں کے پالے اور گل و انگبیں کے وارثوں کو تہ خاک رلتے دیکھ چکے ہیں۔

دراصل وقت سایہ دیوار کی طرح بے وفا ہے جو اس طرف ڈھلتا ہے تو کبھی اس جانب ڈھل جاتا ہے۔ بلکہ یہ سیم و زر کی طرح ہرجائی ہے۔ جو کبھی زید کا کیسہ بھرتا ہے تو کبھی اسے بکر کی جیب پسند آجاتی ہے۔ وقت کے مزاج میں وفا کا عنصر نہیں۔ یہ ایک ہی لمحے میں بالکل معمولی شخص کو گوشہ گمنامی سے نکال کر اسے شاہی تاج پہنا دیتا ہے اور دوسرے لمحے کسی شہنشاہ کو بھکاری کے روپ میں دربدر کی بھیک مانگنے پر مجبور کردیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب کبھی بھی اس کے درشت مزاج میں تغیر رونما ہو تو یہ ہونٹوں سے مسکراہٹوں کے پھول چھین کر آنکھوں کو اشک ہائے غم کے خزانے بخش دیتا ہے۔

زخموں سے چور چور تھا اندر کا آدمی!
یہ اور بات ' جسم پہ اجلا لباس تھا

وقت اگر بے وفا نہ ہوتا تو سقراط زہر کا پیالہ پینے پر مجبور نہ ہوجاتا۔ سکندر اعظم جیسا فاتح یہ وصیت کرنے پر مجبور نہ ہوتا کہ بعد از مرگ میرے ہاتھ کفن سے باہر نکال دیئے جائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ پوری دنیا کی فتح کا عزم لے کر گھر سے نکلنے والا حاکم آج خالی ہاتھوں دار فانی سے کوچ کر رہا ہے۔ اگر وقت بے وفا نہ ہوتا تو دل شہر کو جلتے دیکھ کر جوش مسرت میں بین بجانے والا

"نیرو" برسوں تبسم کی ایک ہلکی لکیر کی تلاش میں سرگرداں نہ پھرتا رہتا۔ گود مادر میں مذبوح جانور کا خون پی کر آنکھ کھولنے اور لاکھوں انسانوں کے لہو سے اپنی پیاس بجھانے والا حجاج بن یوسف جیسا ظالم شخص نزع کے عالم میں اپنی زندگی کا ماتم ہرگز نہ کرتا۔ اور اگر وقت باوفا ہوتا تو ظہیرالدین بابر "ہمایوں" کی شدت مرض سے گھبرا کر اس کی چارپائی کے گرد سات چکر کاٹنے کے بعد بارگاہ خداوندی میں اپنے لخت جگر کی صحت یابی کے عوض اپنی جان کا نذرانہ کیوں کر پیش کرتا؟

وقت باوفا نہیں بے وفا ہے۔ محمد بن قاسم کو دیکھو! سندھ کے کفرزار میں اسلامی فتوحات کے علم گاڑنے والا کمسن جرنیل انتقامی آگ میں جل مرتا ہے' جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی گواہ ہے کہ شاید دنیا میں اس سے زیادہ بے بس انسان اور کوئی نہیں تھا۔ طارقؒ بن زیاد اور موسیٰؒ بن نصیر کے انجام سے واقفیت رکھنے والے دوست اچھی طرح جانتے اور مانتے ہیں کہ وقت بے وفا ہے۔

اگر وقت کسی کا دوست ہوتا تو تیموری خاندان کا چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر بلند و بالا فصیلوں والے لال قلعہ سے اس یاس انگیز حالت میں کیوں نکلتا؟ حاکم محکوم اور خادم مخدوم کیوں بنتے؟ میں نے مستقبل قریب میں حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک وزیراعظم کو اسیر اعظم کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے۔

میں کیسے مان لوں کہ چمن میں بہار ہے
جبکہ ہر ایک گل کا ہے سینہ جلا ہوا

وقت کی وفاداری مبہم مگر جفا کاری واضح ہے۔ وقت کی داستان وفا غیر یقینی البتہ انداز جفا یقینی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وقت فرشتہ قضا کی طرح بے رحم' بے جان اشیاء کی طرح لاپروا' موت کی طرح اٹل' تقدیر کی طرح بے حس' پتھر کی مثل سخت' غصے کی طرح ظالم' سانپ کی طرح زہریلا اور بھوکے شیر کی طرح غصیلا ہے۔

وقت باوفا ہے

تجھ کو ملے ہیں قریہ مہتاب میں گڑھے
مجھ کو تو پتھروں میں بھی. رعنائیاں ملیں

میں حزب مخالف کے معزز رکن کے اس نظریئے سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے مبہم دلائل کی تردید کرنا چاہتا ہوں۔ وقت عصمت فروشی کا دھندہ کرنے والی عورت کی مثل نہیں بلکہ باوفا و باحیا رفیقہ حیات کی طرح ہے۔ جس کی تمام وفاؤں کا مرکز و محور فقط شوہر ہوتا ہے اور وہ دنیا بھر کی مسرتیں اپنے شریک سفر کے قدموں میں ڈھونڈا کرتی ہے۔

وقت ہرگز بے وفا نہیں لیکن اگر کوئی اس کے ساتھ بے رخی کا مظاہرہ کرے تو یہ کسی کو معاف نہیں کیا کرتا۔ وقت اس شفاف آئینے کی مانند ہے جس کے رو برو کھڑے ہو کر انسان اپنے حسن و قبح کے خد و خال کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ وقت خواہ مخواہ کسی پر ستم کرتا ہے نہ ہی رحم! وقت ظالم ہے نہ مظلوم! یہ گنہگار ہے اور نہ ہی معصوم! حالات کی دنیا تو کورے کاغذ کی طرح ہے۔ اس کے سینے پر جس کا جی چاہے اپنی پسند کی تحریر لکھ لے۔ ایک حریت پسند اپنے خون جگر سے قوم و وطن کے مقدر کی سیاہیاں دھو کر آزادی کا پروانہ رقم کر سکتا ہے تو اس کے برعکس دوسرا شخص اپنی ذلت کے اسباب بھی پیدا کر لیتا ہے۔

ہوں میں وہی ' گواہ مرے خد و خال ہیں
آئینہ کہہ رہا ہے' کوئی دوسرا ہوں میں

تاریخ کی دنیا میں حاکم ' محکوم' ظالم' مخدوم اور "آزاد" غلامی کے لبادے میں اس لیے نظر آتے ہیں کہ انہوں نے وقت کی صدا کو نہ سنا۔ اگر سنا تو سمجھ نہ سکے اور سمجھنے والوں نے جھجک سے اس کی پکار کو راہ نہ دکھائی۔

میرے دوست کو یاد رکھنا چاہیے کہ قلعے کمزوروں کی نہیں بلکہ مکین قلعوں کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے لال قلعے کی دیواروں کو اپنا محافظ اور شاہی

قلعوں کو پناہ گاہ تصور نہ کرلیا ہوتا تو یقیناً رنگون کے کنج اسارت میں اپنی بے بسی کا رونا نہ روتا۔

نیرو سے قہقہوں کا روٹھ جانا مکافات عمل کے سوا کچھ نہیں حجاج جیسا خون خوار اس ذلت و نکبت سے تباہی کے دہانے تک اس لیے پہنچا کہ اس نے انسانیت کی حدود پھلانگی تھیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ وقت اگر بے وفا ہوتا تو ہمایوں کی جگہ بابر کا جنازہ نہ اٹھتا۔ وقت بے وفا ہوتا تو سکندر اعظم کو اتنی طویل مہلت نہ ملتی کہ نصف زمین سے زیادہ علاقے پر قابض ہونے کے بعد اہل جہان کے لیے سامان عبرت مہیا کرے۔ محمد بن قاسم' طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر ایسے عظیم جرنیلوں کی کسمپرسی کی حالت میں موت کا جرم بھی وقت کے نامہ اعمال میں نہیں لکھا جاسکتا' بلکہ یہ شہزادہ سلیمان بن عبدالملک کی سیاہ بختی تھی کہ اس کی قبا پر ان مجاہدوں کے خون کے چھینٹے پڑے اور اس کا اجلا لباس ہمیشہ کے لیے سیاہ نقطوں سے داغدار ہوگیا۔

وقت بے رحم ہے نہ رحم دل! یہ تقدیر کی مانند بے حس ہے نہ تدبیر کی طرح حساس! یہ موت کی طرح اٹل اور نہ زندگی کی صورت مستعار و ناپائیدار ہے۔ یہ پتھر کی طرح سخت ہے نہ رگ گل کی طرح نازک! یہ سانپ کی طرح زہریلا ہے نہ شہد کی طرح میٹھا۔ یہ چیتے کی طرح غصیلا ہے نہ آہو کی مثل شرمیلا! بلکہ وقت تو اک آئینہ ہے جو کسی کو دھوکا نہیں دیتا اور دیکھنے والوں کو صحیح صحیح صورت دکھاتا ہے۔ اس لیے وقت کو بے وفا کہنا اپنی کم ذوقی اور بے بصری کا اعتراف کرنے کے برابر ہے۔

وقت اگر "سقراط" کو حق بات کہنے' اس پر اڑا رہنے اور پھر ہلاہل کے گھونٹ حلق میں اتارنے کا حوصلہ نہ دیتا تو یقیناً تاریخ کی کتاب میں کسی حاشیے پر بھی اس کا تذکرہ نہ ملتا۔ سقراط کو دائمی شہرت کا سزاوار ٹھہرانا وقت کا ایک انوکھا نمونہ وفا ہے۔ ہر کسی کی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible]

وجود زن سے ہے صفحہ کائنات پہ جنگ

ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ یا ایک بدصورت اور دوسرا خوبصورت۔ میرے خیال میں عورت گلزار ہست و بود میں سرمایہ رونق ہے اور بے رونقی کا سبب بھی۔ لیکن اس باب کا قابل غور پہلو یہ ہے کہ عورت مجموعی اعتبار سے فساد کی جڑ ہے اور "وجود زن سے ہے صفحہ کائنات پہ جنگ" ایک مبنی بر حقیقت نظریہ ہے۔

عورت' خدا سے غفلت' دنیا سے محبت' نزع کی کیفیت' قرض کی ذلت' مرض کی شدت اور سانپ کی فطرت کا نام ہے۔ بلکہ عورت سے نباہ' پاؤں کی زنجیر' آزادی کی تحقیر اور غلامی کی تحریر ہے۔ عورت سکون کی قاتل ہے۔ فساد کی اصل ہے۔ نفرت کے اظہار' شکست کے اقرار اور زخموں کے شمار کو "عورت" کہتے ہیں۔ یہ وقت کے زیاں اور مصائب کے بیاں کا تذکرہ ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دنیا میں عورت ذات! زہر کا جام' زندگی کا اختتام اور جنگ کا پیغام ہے۔

ہر سخن میں گرچہ سو پہلو بچاتا ہوں

آرزوئیں ٹپکی پڑتی ہیں میرے تقریر سے

غالباً یہی سبب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "شریر عورتوں سے بالکل برکنار رہو اور جو بھلی مانس ہیں ان سے بھی ہشیار رہو" کسی دانشور کا قول ہے کہ "عورت اور شراب سب کو احمق بنا لیتے ہیں" لاہرن کہتا ہے کہ "ایسے خوش نصیب بہت کم ہیں جو زن میں کم از کم ایک بار اپنی بیوی کی جان کو نہ روئیں اور کنواروں پر رشک نہ کریں" حضرت لقمان" کا فرمان ہے "بری اور شریر عورتوں سے خدا تعالیٰ کی پناہ میں رہو اور نیک عورتوں سے بھی پرہیز رکھو کہ ان کی طرف میلان کا نتیجہ شرمندگی ہے۔ سیلاب کے بہ سبیل "عورت ایک فتنہ ہے" بقراط کا قول ہے "عورتوں کے کہنے پر کبھی عمل نہ کر۔ تمام آفات زمانہ سے محفوظ

[illegible]

رہے گی" یحییٰ برمکی اپنے تجربات کی روشنی میں مشورہ دیتا ہے کہ عمر کے کسی حصے میں بھی عورت کو اس کی مرضی پر نہ چھوڑنا چاہیے ورنہ خاندان تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ہربرٹ سپنسر صنف نازک کی کمزوریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

"عورت کا دل اس کے دماغ پر حکومت کرتا ہے"

تاریخ کے اوراق الٹیے! ہر صفحہ گواہی دے رہا ہے کہ قوموں کی تباہی و بربادی میں عورتوں کا زبردست حصہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کی بعض جنگیں صرف اسی کی وجہ سے لڑی گئی ہیں۔ بڑے بڑے جرنیل عورت کی زلف کے اسیر ہو کر اپنے مقاصد میں ناکام ہوئے۔ عورت کی ذات نے مجاہدوں کے جذبات جوانی کو بھڑکا کر تلواروں کی جھنکاروں میں جوہر شجاعت دکھلانے کے بجائے پازیب کی چھن چھن میں بہکا رکھا ہے۔ عورت اگر باعث نزاع نہ ہوتی تو یقیناً" بھائی بھائی سے خفا اور دوست' دوستوں سے جدا نہ ہوتے۔ بزرجمہر نے ایک موقع پر کہا تھا "میں لڑائیوں میں حاضر ہوا' لشکروں سے لڑا' تلواریں چلائیں اور ہمسروں کو پچھاڑا مگر میں نے بری عورت سے زیادہ غالب کسی کو نہیں دیکھا۔ تشبیہ " عرض ہے۔

ریزہ ریزہ ہو کے بکھرا ہے فضاؤں میں بدن
کس قدر مہنگی پڑی ہے چاند سے یاری مجھے

ذرا غور تو کریں کہ عورت کی ہر روز سامان میک اپ کی فرمائشیں' سینما گھروں میں جلوۂ حسن دکھلانے کی ضد' جدید فیشن سے سلے ہوئے باریک اور جسم کو ابھارنے والے سوٹ۔ ہر روز عورتوں کا اغواء' جبراً" عصمت دری کے واقعات۔ چادر اور چار دیواری کے مسئلے۔ محبت میں ناکامی پر خودکشی۔ سات بچوں کی ماں کا آشنا کے ساتھ فرار۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ حالات و واقعات تصویر کائنات میں "رنگ" یا کہ صفحہ کائنات پر "جنگ" کا ثبوت پیش [illegible]

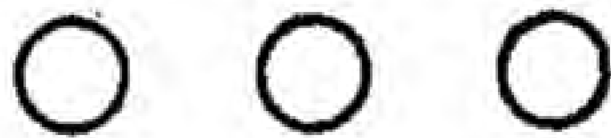
حق بات کو انجمن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے' تجھے جو کچھ نظر آ[illegible] [illegible] ہے

اگر حقیقت پسندانہ انداز سے مطالعہ کیا جائے تو تاریخ ذہن پر میرے موقف

کی صداقت کے نقوش ثبت ہو کر رہ جائیں گے۔ معاشرے میں یہ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم، قتل و غارت گری، اخلاقی بے راہروی، مسجدوں کی ویرانی، سینماؤں میں رونق، فیشن پرستی کی وبا، رقص و سرود اور گانا بجانا، حتیٰ کہ چوری ڈاکے، دشمنیاں، جہاد سے فرار، بے پردگی و عریانی اور اس بے ہنگم اچھل کود کا محرک صرف اور صرف "عورت" ہے۔

میں جانتا تھا جبینوں پہ بل پڑیں گے
قلم کا قرض تھا آخر ادا تو ہونا تھا

یہ شرف بھی عورت ہی کو حاصل ہے کہ وہ جب چاہے گھر کی دیواریں پھلانگ لیتی ہے۔ اس طرح باپ اور بھائیوں کی پگڑیوں کے شملے داغدار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جہاں عورتوں کا اجتماع ہو وہاں خاموشی قائم نہیں رہ سکتی۔ فضول گفتگو، جھوٹ، گلہ، گالی گلوچ اور آرائش و زیبائش کی نمائش ان کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ سقراط نے کیا خوب کہا تھا "اگر اس دنیا میں عورت نہ ہو تو مرد بلا ریاضت ولی بن جائے"



وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ!

علامہ اقبال کا یہ زبان زد عام و خاص مصرعہ اپنے احاطہ تخیل میں ایک طویل موضوع کو سمیٹے ہوئے ہے۔ آؤ ذرا اس کا تجزیہ کریں کہ اقبال ایسا نباض فطرت یہ نغمہ الاپنے پر کیوں کر بے اختیار ہوا۔ اقبال نے جب چشم شعور وا کی تو ماں کی ٹھنڈی گود نے تسکین و راحت کے کئی خزانے لٹا دیئے۔ عہد شباب کے آغاز میں اقبالؒ نے ―――――― کی گود میں پلی دیکھ کر اپنے دل کے ایک گوشے میں بے کلی سی محسوس کی اور پھر "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" دل کی ناہنوز بند کلیوں کو دلربا کا رقص تبسم یاد آیا۔ گھر کی چار دیواری کے اندر بہن کی بار حیا سے جھکی نگاہیں اور دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ دیکھے تو سینہ و دل میں خوشی و سرمستی کے کئی سوتے پھوٹ اٹھے۔ حجلہ عروسی میں شریک حیات کے ذوق وفا اور کرب تخلیق کے احساس نے افکار و خیالات کے وسیع سمندر میں دل لبھانے والے دل آویز موتی پھینکے اور پھر ایک صبح ان کی منتظر نگاہوں نے "منیرہ" کے روپ میں شب تہجد کی دعاؤں کا ثمر پایا تو اقبال برملا پکار اٹھا

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ!
اس کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

عورت کے یہ روپ دیکھ کر اقبال نے ضرور سوچا ہوگا۔ میں بھی سوچ رہا ہوں اور یقیناً آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ عورت کیا ہے؟ دنیا ایک پھول اور عورت اس میں خوشبو ہے۔ کائنات اگر دل ہے تو یہ اس کی آرزو ہے۔ جہان رنگ و بو اگر منزل ہے تو یہ جستجو ہے اور یہ صفحہ دہر اگر آنکھ ہے تو عورت گویا اک آنسو۔۔ ہے۔ بلکہ عورت آئینے کا عکس اور پھولوں کا رس ہے۔ یہ بہار کا جوبن اور گھٹا کی پھبن ہے۔ قوس قزح کا حسن اور ساز کی دھن ہے۔ بلکہ برف کی برودت' آکاس بیل کی گرفت' سنگ مرمر کی معصومیت' آنکھ کی بصیرت اور رنگ

گل کی نزاکت ہے۔ عورت سیماب کے اضطراب اور مد و جزر کے انتساب کی مثل ہے۔ عورت خورشید کے سلگاؤ' شاخوں کے جھکاؤ' چشمہ کے بہاؤ' اور موم کے پگھلاؤ کی مانند ہے۔ عورت کا وجود بادل کی ردا' بلبل کی نوا' چقماق کی سختی' شراب کی مستی' شہد کی مٹھاس' سمندر کی پیاس' پربت کی بلندی' اور تحت الثریٰ کی پستی کی طرح ہے۔ "عورت" کہکشاں کے حسن بے کراں اور خلوص و محبت کی داستاں کا نام ہے "عورت" نبیؐ کی محبوب ہے' مومن کی مطلوب ہے اور زندگی کا اسلوب ہے۔

جانے کن مست نگاہوں کا خیال آتا ہے!
ہاتھ رک جاتا ہے بڑھ کر مرا ساغر کے قریب

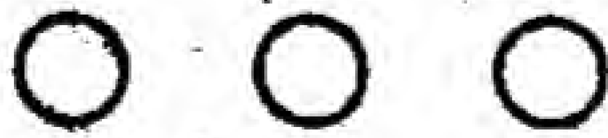
پیغمبر اسلام نے فرمایا "ایمان کے بعد بڑی نعمت نیک عورت ہے" ایک حدیث میں ہے کہ "عورت' نماز اور خوشبو مجھے پسند ہیں" حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "عورت کے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا" مغربی مفکر باربولڈ کہتا ہے "عورت مصیبت و غم کو کم کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے" تھیلز کے خیال میں "ایک حسین اور با عصمت خاتون خدائے قدوس کی صنعت کاملہ کا نمونہ' فرشتوں کی حقیقی شان و شوکت کا نادر معجزہ اور دنیا کی عجیب ترین چیز ہے" ملٹن کائنات کے مشاہدے کے بعد پکار اٹھتا ہے "عورت سب سے اچھا اور سب سے آخری آسمانی تحفہ ہے" جیسا کہ مسلمان علماء کا کہنا ہے "عورت صرف نصف جان ہی نہیں نصف ایمان بھی ہے" سوامی رام کے نظریے کے مطابق "پتھروں میں پارس' درختوں میں لاجونتی اور انسانوں میں عورت اعلیٰ و ارفع ہیں" ارسطو کے بقول' عورت ایک گھر کی زینت ہی نہیں بلکہ اس کی روح بھی ہے۔

یاد آجاتا ہے مجھے' انداز خرام اس کا
جب کبھی لوگ کریں آب رواں کی باتیں

ذرا چشم دل وا کیجئے اور غور فرمایئے کہ کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کتنی بے ملیح اور [illegible] ہوتی ہے مگر پھول اسے حسن بخش دیتا ہے۔ غریب کا گھر کیسا

ہی اجاڑ اور ویران ہو' عورت اسے جنت بنا دیتی ہے۔ لیکن خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے فرمودہ کے مطابق "عورت کی خوبی دو باتوں میں ہے اول اس کو کوئی نامحرم نہ دیکھے دوئم وہ کسی نامحرم کو نہ دیکھے" دختر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں عورت سے ہم چار چیزیں چاہتے ہیں۔ اس کے دل میں نیکی ہو' اس کے چہرے پہ حیا ہو' اس کی زبان میں شیرینی ہو اور اس کے ہاتھ کام میں لگے رہیں۔ بعض خام خیال افراد صنف نازک کو سرمایہ مسرت کے بجائے اسباب مضرت گردانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وجود زن سے تصویر کائنات میں رنگ نہیں بلکہ وجود زن سے صفحہ کائنات پہ جنگ ہے۔ یہ نظریہ دراصل ان کی مجرمانہ و باغیانہ ذہنیت کا ترجمان ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ "انہیں لیلیٰ نظر آتا ہے' مجنوں نظر آتی ہے"

بالآخر میں قید موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے خیالات کے ٹوٹے ہوئے ساغر کی کرچیاں جوڑنے کی سعی کرتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اقبال مرحوم نے یہ شعر لکھ کر گویا موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان دو مصرعوں میں ایک ایسی تصویر بنائی ہے کہ قلم توڑ کے رکھ دیا۔ آج اگر معاشرے میں ہر طرف برائیاں ہی برائیاں موجود ہیں اور اگر عورت کی ذات بھی کسی قدر ان گناہوں میں ملوث ہے تو بیچاری عورت کا پھر بھی کوئی قصور نہیں۔ اس کا سبب طبقاتی کشمکش' سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام' عدم مساوات' اسلامی فلسفہ تعلیم سے دوری اور مغربی تہذیب کی تقلید ہے وگرنہ عورت تو پہلے بھی عظیم تھی' آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔



"ایک روشن چراغ تھا نہ رہا"

رات دہلیز پہ بیٹھی رہیں آنکھیں میری
تو نہ آیا تو کوئی خواب ہی بھیجا ہوتا

دوستوں کے بچھڑنے کا تصور اور جنازوں کے اٹھنے کا منظر مجھے ہمیشہ ہچکیوں کی گود میں لے جاتا ہے۔ درد کی آگ میں جھلستا' جدائیوں کی حدت سے سلگتا اور مقدر کی ریکھاؤں سے الجھتا نوحتا ہوں۔ ہماری نگاہیں بار بار کسی کی دید کے لئے اٹھتی اور امیدوں کے چراغ بجھا بجھا کر لوٹ آتی ہیں۔ رہ رہ کر صبا کی گود میں پالے ہوئے ایک دلکش' مخلص و وفا شعار اور پیکر رعنا کی یاد ستاتی' تڑپاتی اور رلا رلا دیتی ہے۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے

گزشتہ دنوں ایک خوبصورت' ہردلعزیز اور پاکباز نوجوان اپنی کار میں لاہور سے سرگودھا روڈ پر جا رہا تھا کہ گھر کا راستہ بھول کر شہر خموشاں میں جا پہنچا۔ خوابوں کا یہ شہزادہ جانے کیوں زندگی کے سفر میں بہت جلد تھک گیا۔ چاند بن کر ملنے اور امید کے ساحلوں پر کھلنے والے پھول کی خوشبو ہوا کے دوش پر ایک ہی لمحے میں بہت دور جا پہنچی۔ مہکتا گلاب مٹی میں کھو گیا۔ آہ ایک وجد آفریں گیت' آخری نیند سو گیا۔ اس نے منتوں کے سائے میں آنکھ کھولی' دعاؤں کے جھرمٹ میں بولنا سیکھا' مناجاتوں کی فضا میں لڑکپن کی منزلیں طے ہوئیں اور جوانی کی دہلیز پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ہم سے پل بھر میں روٹھ گیا۔ بے بس و بے کس لوگ ستارے کی تابناکی' گلاب کی نازکی' بہار کی چاندنی اور لعل یاقوتی کی لطافت کو اپنے ہاتھوں خاک میں اتار آئے۔

[illegible] رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
[illegible] گزری وہی رات باقی ہے

وہ [illegible] کہاں تھا؟ ملاقات بھر میں کیوں نہیں جانتا؟ کسی خانقاہ کا جانشین تھا

اور نہ ہی دینی مدرسے کا کوئی باقاعدہ طالب علم۔ بظاہر یہ ایک عام سا شخص لگتا لیکن در حقیقت عام نہیں تھا۔ تمام زندگی سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نعتیں سنتا، سر دھنتا، خود روتا اور دوسروں کو رلاتا رہا۔ یہ نوجوان سب کی آنکھ کا تارا اور کشمیر کا نظارا تھا۔ اس کا باطن ظاہر سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کے ذوق و شوق کی کیا کہئے؟ ملتے ہی سرکار مدینہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے نعلین اقدس کی بات چھڑ جاتی، علمی و تحقیقی پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی ہمیشہ عاشقان مصطفیٰ تک پہنچتی اور تان ہمیشہ کسی درد مند کے طرز خطابت و جوش عقیدت پر ٹوٹتی تھی۔ میرا مشاہدہ اور یقین کامل ہے کہ اس شہریار وفا سے کسی موقع پر کسی طرح بھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ وہ تو اخلاص کا پیکر اور اخوت و ہمدردی کا پیغامبر تھا۔ محبتیں بانٹنے آیا تھا اور یادوں کی خوشبو پھیلا کر چلا گیا۔ زندگی کے کسی ایسے ہی دردناک موڑ پر شیلے نے کہا تھا:

SWEETEST THINGS HAVE FLEETEST ENDS

اف، اس سے پہلی ملاقات کا نشہ! پروقار خاموشی، آنکھوں میں عجیب چمک، دلاویز مسکراہٹ، مقناطیسی کشش، کتابی چہرہ، نکھری ہوئی سرخی مائل رنگت، لہجے کی مٹھاس، گلاب ہونٹوں کے دائرے پر کلیوں کا رس اور کتاب ماضی کا ورق ورق نزاکتوں اور لطافتوں سے عبارت۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر گوہر یکتا نے داغ جدائی دے کر دشت زندگی میں یوں ہی تنہا چھوڑ جانا تھا تو اے کاش یہ آنکھ کی راہ سے دل کے مکان میں نہ اترا ہوتا۔

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہوگئے ہیں

آج سے صدیوں پہلے مہاتما بدھ نے کہا تھا کہ غم اس دنیا میں پہلی سچائی ہے۔ ہم اسی بات کو بانداز دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آخری سچائی بھی غم ہے۔ اب کے برس میں نے پھولوں کو خوشبو سے اور روح کو جسم سے جدا دیکھا ہے۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ چھن گئی اور چہروں سے رونق۔ ہر گھڑی یادوں کے جھروکے

اور درد کے پیوند ہیں۔ کتاب وفا میں حاشیے پر لکھا ہے کہ وہ تو ایک پھول تھا' کھلا' خوشبو پھیلائی' ہنسا اور بکھر چکا۔ ایک شخص حسرت و ارمان کی اس لمبی سڑک پر چیخ اٹھتا ہے:

وہ تو خوشبو تھا اگلے نگر جا چکا
چاندنی تھا ہوا صرف رنگ قمر!
خواب تھا آنکھ کھلتے ہی اوجھل ہوا
اے دل بے خبر' اے دل بے خبر!!

گرم سانسوں کی وہ خوشبوئیں بھول جا
وہ چھلکتی ہوئی دھڑکنیں بھول جا
بھول جا نرم ہونٹوں کی شادابیاں
حرف اقرار کی لذتیں بھول جا!

اگر مذہبی لہجے میں بات کی جائے تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم خطا کے پتلے قدرت کی حکمتوں کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ دکھ تو یہ ہے کہ دل میں دھڑکن اور آنکھ میں کاجل کی طرح رہنے والے اس جوان رعنا کے جانے کا وقت ابھی نہیں تھا۔ یہ تیز رفتار مسافر انس و رفاقت کے اتنے روشن حوالے چھوڑ گیا اور دوستی کے وہ زندہ باب لکھ گیا ہے کہ اس پر وفائیں اور دعائیں بھی برسا روتی رہیں گی۔ بے خطا' آخر تو نے ہم سے یہ خوشی کیوں چھین لی؟ وہ تو اک دریا تھا سمندر میں اتر گیا۔ لیکن ہم اس کی جدائی کے غم میں کچھ اس طرح زندہ ہیں کہ زندگی نہیں رکھتے۔ اس کے جانے سے ہر چہرہ سوگوار' ہر آنکھ پرنم' ہر دل ویران اور ہر زبان وقف آہ و الم ہے۔ خدایا' ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہمارے پاس ہی رہتا تو کیا فرق پڑ جاتا تھا۔

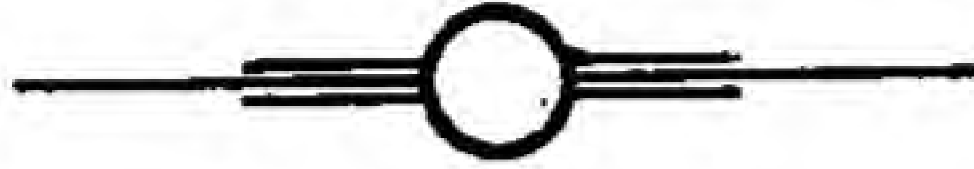
کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ موت کا فرشتہ اندھیرے میں بیٹھ کر پے در پے قضا کے تیر چلاتا اور جو بھی زد میں آجائے اس کو لقمہ اجل بنا دیتا ہے۔ اگر تقدیر کے آئینے میں اندیشہ سود و زیاں کی کوئی جھلک ہوتی تو یہ روشن چراغ ہرگز نہ بجھتا۔

زندگی یوں تھی کہ جینے کا بہانہ تو تھا
ہم تو بس زیب حکایت تھے فسانہ تو تھا
ہم نے جس کسی کو بھی چاہا ترے ہجراں میں وہ لوگ
آتے جاتے ہوئے موسم تھے زمانہ تو تھا

○ ○ ○

"طاقت ور دلائل کی نسبت خوبصورت الفاظ کہیں زیادہ اثر انگیز ہوتے ہیں۔"



"قلم کا زخم بے حد گہرا ہوتا ہے۔ یہ زندوں کو موت کی نیند سُلا سکتا ہے' اور مُردوں کو زندگی بخش سکتا ہے۔"

(جان ٹیلر)



آپ کوئی بات لوگوں کو اس وقت تک نہیں سمجھا سکتے' جب تک وُہ خود آپ کے ذہن میں واضح نہ ہو۔ کوئی موضوع جس قدر آپ کے ذہن میں واضح ہوگا لوگوں کو سمجھانے میں اتنی ہی آپ کو آسانی رہے گی۔"

(بریان)



- بے شک بعض اشعار میں دانائی کی بات اور بعض تقریروں میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ (الحدیث)
- گفتگو میں اختصار سے کام لو۔ کلام اتنا ہی مفید ہوتا ہے جتنا آسانی سے سنا جاسکے طویل کلامی گفتگو کا کچھ حصہ ذہنوں سے ضائع کردیتی ہے۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

- زبان کی لغزش پاؤں کی لغزش سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

- کلام کرنے پر کئی آفتیں پیش آتی ہیں۔ متکلم کے لئے وقت اور موقع کا لحاظ ضروری ہے۔ (حضرت علیؓ)
- بہترین کلام وہ ہے جس سے سننے والے کو ملال اور اس پر بوجھ نہ ہو۔ (حضرت علیؓ)
- جس کلام کو تو بہت اچھا سمجھتا ہے اس کو مختصر کردے کہ یہ تیرے حق میں نہایت بہتر اور تیرے فضل و کمال کی نشانی ہوگی۔ (حضرت علیؓ)
- وعظ خالصتاً اللہ کے لئے کر، ورنہ تیرا گونگا پن ہی بہتر ہے۔

(حضرت عبدالقادر جیلانیؒ)

- تیرا کلام بتادے گا کہ تیرے دل میں کیا ہے؟۔ (حضرت عبدالقادر جیلانیؒ)
- کلام میں نرمی اختیار کر، کیونکہ الفاظ کی نسبت لہجے کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔

(امام غزالیؒ)

- شیریں کلام اور خوش خلق کے ساتھ محبت واجب ہو جاتی ہے۔

- صحیح الکلام، شیریں زبان اور فصیح البیان ہونا دنیا کی بہترین چیزوں میں سے

ہے۔(بو علی سینا)

- مباحثہ عقل کی صیقل ہے اور جاہلوں کے لئے تخم عداوت۔(بو علی سینا)
- میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا کہ گفتگو کرنے سے پہلے جس کی ہیبت مجھ پر چھا گئی ہو اگر وہ شخص فصیح ہے تو میرے دل میں اس کی عظمت ہوتی ہے ورنہ وہ میری نظر سے گر جاتا ہے۔(یحییٰ برمکی)
- جو اچھی بات سنو' لکھ لو اور جو لکھو اسے حفظ کرلو جو حفظ ہیں ان کو بیان کرو۔(یحییٰ برمکی)
- جس چیز کا علم نہیں اسے مت کہو۔(سقراط)
- بات کو دیر تک سوچو' پھر منہ سے نکالو اور اس پر خود بھی عمل کرو۔(افلاطون)
- متکلم کا کلام جب اس کی نیت کے مطابق ہو' سامع کو حرکت میں لاتا ہے اور مخالف نیت ہو تو کان سے تو سنتا ہے لیکن قلب اس کو درجہ قبولیت نہیں بخشتا۔(افلاطون)
- زیادہ گفتگو کرنا' ہرچند کہ اچھی باتیں ہوں' دلیل دیوانگی ہے۔(ارسطو)
- اگر میرے پاس کہنے کو کچھ نہ کچھ ہمیشہ موجود رہا تو میں تقریر کرنے سے کبھی نہ گھبراؤں گا۔(ابراہم لنکن)
- ہربات وضاحت اور فصاحت سے کرو۔(نپولین)
- تکرار ہی فن تقریر کا سب سے سنجیدہ اصول ہے۔(نپولین)
- لوگوں کے جذبات بھڑکانے کے لئے تھوڑی سی مخالفت سے بڑھ کر کوئی چیز اکسیر نہیں۔(ڈیل کارنیگی)
- جن لوگوں نے میدان خطابت میں زیادہ ترقی کی' وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے زیادہ مشق کی۔(ڈیل کارنیگی)
- آپ کی تقریر میں آپ کا دھڑکتا ہوا دل نظر آنا چاہیے۔(ہنری فورڈ)
- جب تک ایک مقرر کو یہ شعور نہ ہو کہ اسے کب اور کس طرح تقریر ختم

کرنی چاہیے تو وہ کیا توقع کر سکتا ہے؟۔ (ڈیل کارنیگی)

○ خاموش رہو یا ایسی بات کہو جو خاموشی سے بہتر ہو۔ (بیکن)

○ اگر تم اپنے کلام میں مقبول عام ہو سکتے ہو تو ہمارے لئے کاروبار میں کامیاب ہونا مشکل نہیں ہے۔ (بیکن)

○ اعلیٰ اور بلند پایہ تقریروں کا آغاز گھبراہٹ اور پریشانی سے ہوا تھا۔ (سسرو)

○ ایک لاکھ پتی سرمایہ دار بننے کے بجائے میں ایک نامور مقرر بننا پسند کروں گا۔ (فلپ ڈی آرمر)

○ خوف و ہراس' بے خبری اور بے یقینی کی پیداوار ہے۔ (پروفیسر رابنسن)

○ جامع اور سچی محبت' خوف و ہراس کو بھگا دیتی ہے۔ (آپوسٹل جون)

○ پابندی وقت کی خاطر اگر میں اپنی تقریروں میں سے بہت سی اچھی اچھی باتیں نہ نکالتا تو وہ ناکام رہتیں۔ (ایڈون جیمز)

○ جوں جوں مقرر کے خیالات وسیع ہوتے جائیں گے ادائیگی میں بے ربطی پیدا ہوتی جائے گی۔ (ہربرٹ سپنسر)

○ الفاظ کے پیچھے مت بھاگو بلکہ خیالات کو تلاش کرو جب خیالات کا ہجوم ہو گا تو لفظ خود بخود چلے آئیں گے۔ (ہوریس)

○ ایک مذہبی مبلغ کو اپنے وعظ سے حقیقی پیغام حاصل کرنے کے لئے اسے چھ مرتبہ دہرانا پڑتا ہے۔ (کینن)

○ آپ کی تقریر کے ہر پہلو کے حقائق بچے تلے' بغور مطالعے کا نتیجہ اور کسی نظم و ضبط کے تحت ہونے چاہیں۔ (البرٹ' جے بیورج)

○ تقریر کو کامیاب بنانے میں الفاظ کے بجائے انداز تقریر کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ (البرٹ ہبرڈ)

○ دنیا میں فقط ایک چیز کی بدولت' دولت اور عزت حاصل کی جاسکتی ہے اور وہ ہے۔ کسی تقریر یا اس اور اس کے کلام (خطابت) کی صحیح ادائیگی۔ (البرٹ ہبرڈ)

○ اگر آپ ایک قابل مقرر بننا چاہتے ہیں تو بن سکتے ہیں مگر اس کے لئے آپ

کے اندر پر خلوص جذبہ ہونا چاہیے۔(پروفیسر جیمز)

- مقرر کون ہے؟ اس کا اسلوب بیان کیسا اور مواد کس قسم کا ہے؟ ان تینوں میں مواد سب سے کم اہمیت رکھتا ہے۔(لارڈ مارلے)
- عظیم مقرروں کے چہروں کے تاثرات اور جسم کی حرکات و سکنات منفرد ہوتی ہیں۔(لارڈ کرزن)
- آپ کی خاموشی آپ کی زبان بھی ثابت ہو سکتی ہے۔(کیلنگ)
- کامیاب مغنیہ بننے کے لئے اتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کہ دوستوں اور دنیوی آسائشوں سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔(مادام نورڈیکا)
- فن تقریر میں سب سے اہم چیز مقرر کی ذات ہوتی ہے۔(ہنری وارڈ)
- اداکاروں کا سٹیج پر آنے اور جانے کا انداز ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کا غماز ہوتا ہے۔(انگریزی کہاوت)
- سامعین سے رخصت ہوتے وقت انہیں ہمیشہ ہنستا ہوا چھوڑ کر آنا۔

- جو مقرر موجودہ دور کی برق رفتاری کے پیش نظر اپنی تقریر مختصر نہیں کرتے عموماً لوگ انہیں خوش آمدید نہیں کہیں گے۔
- کسی چیز کے عروج کے فوراً بعد اس کا زوال بھی شروع ہونے لگتا ہے یعنی جب سامعین آپ سے کچھ اور سننے کے خواہش مند ہوں تو تقریر ختم کر دیں۔(لوریمر)
- زندگی مجھ میں اتنے ولولے پیدا کرتی ہے کہ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا میں دنیا کو اپنے تجربات بتانا چاہتا ہوں۔(رچرڈ واشبرن چائلڈ)
- قابل قدر اور عظیم آوازیں ایسے لوگوں کے ہونٹوں سے نکل سکتی ہیں جن کے خیالات بلند ہوں۔(لانگ فیلو)
- خطابت جراحی کی طرح ایک ایسا فن ہے جسے ہر کوئی سیکھ سکتا ہے اگرچہ سیکھنے والے کم ہی ہوتے ہیں۔(ایمرسن)

- ○ فصاحت' استدلال کو نذر آتش کر سکتی ہے۔ (وینڈل ہو لیمس' جے آر)
- ○ زرہیں اور تلواریں' میدان جنگ میں انسان کو اتنا محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ جتنا فصاحت و بلاغت اسے پریشان کن قانونی چارہ جوئی کے وقت محفوظ رکھ سکتی ہے۔
- ○ جس طرح بھی بن پڑے تم اپنے آپ کو اور اپنے سامعین کو بھول جاؤ اور اپنی ساری توجہ اپنے موضوع بحث پر مرکوز رکھو۔
- ○ غیر مقصدی بحث گفتگو کی موت ہے۔ (لڈوگ)
- ○ سخت تنقید سے آدمی کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے لیکن ذرا سی تعریف اور معمولی سی حوصلہ افزائی جادو کا اثر دکھاتی ہے اور بہترین نتائج پیدا کرتی ہے۔ (بارنم)
- ○ گفتگو کے میدان میں تمام انسان فریق ثانی ہوتے ہیں۔ (ایمرسن)
- ○ جو خطیب اپنی گہرائی کی کمی لمبائی میں پوری کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکتے۔ (مان ٹیسکو)
- ○ مجھے ایک برجستہ تقریر کرنے کے لئے تین ہفتے سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ (مارک ٹوین)
- ○ تقریر کے مواد کی بجائے اس کا اسلوب بیان زیادہ وقعت رکھتا ہے۔
- ○ تقریر کو کامیاب بنانے میں ہاتھوں اور پاؤں کی حرکات کی نسبت نفسیاتی منطق کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔
- ○ شاعر فطری طور پر شاعر ہوتے ہیں مگر خطیب یا مقرر ذاتی کوشش سے بنتے ہیں۔
- ○ اس وقت تک بات نہ کرو جب تک تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ تمہارے پاس کہنے کو کیا کچھ ہے۔
- ○ دلائل کو مضبوط کرنے کے لئے آواز کو بلند نہیں کرنا چاہیے۔
- ○ [illegible] کے الفاظ [illegible] گے۔

- ○ تیری زبان پر دو دروازے دانت اور ہونٹ اس لئے لگائے گئے ہیں کہ تو ناگفتنی بات سے زبان کو بند رکھ۔
- ○ خوش کلامی بہترین نعمت خداداد ہے سخن درست در است ہر کہ دریافت دریافت!

  ہر ایک شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق کلام کر۔ (حضرت علیؓ)
- ○ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ کلام وہ ہے جو حسن اختصار پر مشتمل ہو۔

- ○ ریطورک (علم فن خطابت) حسن ترغیب کے قابل حصول ذرائع کو سمجھنے اور از سر نو دریافت کرنے کی صلاحیت کا نام ہے۔ (سکاٹ جیمز)
- ○ خطابت علم ہے بھلے طریقہ سے بات کرنے کا۔ (کو ئٹلین)
- ○ فن خطابت' اولاد آدم کی روحوں کو حیرت زدہ کردینے والی قوت کا نام ہے۔ میرے نزدیک کرۂ ارض پر سب سے زیادہ حیران کن شئے فصاحت و بلاغت ہے۔ (ڈی ایسگنی)
- ○ دل سے اٹھنے والی وہ آواز جو آپ لوگوں کو سنانا چاہیں تقریر کہلاتی ہے۔ (رچرڈ واشبرن چائلڈ)
- ○ اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار نہ کرسکنا انسانی زندگی کی شاید عظیم ترین محرومی ہے۔ (سی وی برجس)
- ○ جس قدر سرعت سے موزوں بات چیت کرنے اور فن تقریر کی صلاحیت ایک شخص کو معاشرے میں اہم اور نامور بنا سکتی ہے اور کوئی معاشرتی سرگرمی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ (ایم ڈیپو' چالسی)
- ○ آپ اپنی آنکھوں کا رنگ بدلنا چاہیں تو آپ کو کامیابی حاصل نہیں ہوگی لیکن اگر آپ اپنا طریق گفتگو بدلنا چاہیں تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ (وکٹوریا شیر، خاتون مقرر)
- ○ جاودانی دلی مسرت کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ لوگوں کے

سامنے تقریر کر کے انہیں اپنے خیالات کی پیروی کے لئے اکسایا جائے۔

- جو شخص جلدی کے ساتھ ہر ایک بات کا جواب دے دیتا ہے وہ ٹھیک جواب بیان نہیں کرتا۔ (حضرت علیؓ)
- مقررین نے ہر ملک اور ہر زمانے میں امتیاز حاصل کیا ہے؟۔ (سارجنٹ)
- تاریخ عالم شاہد ہے کہ انقلاب امم میں شاعر کا قلم' مجاہد کی تلوار اور مدبر کے دماغ کے ساتھ ساتھ خطیب کی زبان بھی کار فرما رہی ہے۔
  (نذیر الدین احمد)
- فصاحت آزادی کا بہترین ثمر ہے۔
- تقریر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے جس کو جو طریق پسند آئے وہ اس کو اختیار کرلے۔ (جان برائٹ)
- جو لوگ رٹی ہوئی تقریر کرتے ہیں وہ مقرر کے اعلیٰ منصب کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (جان برائٹ)
- اگر یہ چاہتے ہو کہ تقریر شستہ و دلچسپ ہو تو تقریر کو لکھ کر حفظ کرلیا کرو۔ (لارڈ میکالے)
- جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے بیان کیا جاسکتا ہے لیکن ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اس کو بیان کرنا جانتا ہے۔ (ہربرٹ ایلس)
- اردو تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرز ادا کی خوبی کا لحاظ ہونا چاہیے۔ (مولانا شبلی نعمانی)
- قابل توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں۔ (ٹینی سن)
- جنہیں تقریر کا شوق ہو انہیں شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کا ہمیشہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ (فاکس)
- خود ہمارا دل ہی چشمہ بلاغت و خطابت ہے۔ بہت سے خطیب جو اس فن

میں ناکام رہ جاتے ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں خود محسوس نہیں کرتے۔ (لارڈ ارسکن)

- جو کچھ تمہاری زبان سے نکل رہا ہے اور جس سے متعلق تم اپنے سامعین کو متاثر کرنا چاہتے ہو اس کو سمجھو اور اس کو محسوس کرو۔ (سی ہارٹے)
- جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل میں گھر کر لیتی ہے اور جو بات زبان سے نکلتی ہے وہ کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ (عامر بن عبد القیس)
- جس مقرر کی تم تقریر سنو اس سے کوئی نہ کوئی بات ضرور سیکھو۔ (سی ہارٹے)
- قلم، فن خطابت کا بہترین معلم ہے۔ (کو ٹلیس)
- جب تک لوگ تمہارے چہرے کو دیکھتے رہیں اس وقت تک تقریر کرتے رہو لیکن جب اس میں ذرا بھی فرق آجائے تو رک جاؤ۔ (حضرت عبد اللہ)
- جو شخص تمہاری باتوں کو شوق سے نہ سنے اس کو سننے کی تکلیف نہ دو۔
- صرف علم کی ان ہی شاخوں اور شعبوں کا علم حاصل کرنا چاہیے جو مقرر کے لئے بہت ضروری ہیں۔ (سقراط)
- اچھی تقریر کو شغل بنانا چاہتے ہو تو وسیع مطالعہ کو اپنی تفریح کا ذریعہ سمجھو۔ (لارڈ چسٹر فیلڈ)





نسیم حجازی کی مختلف تصانیف









